www.iqbalkalmati.blogspot.com
تم ہنستی اچھی لگتی ہو
فرحت اشتیاق

فہرست

1 - ہنستی اچھی لگتی ہو 5

2 - تیرے لیے ہے میرا دل 43

3 - پل بھر رستہ طے کرنے میں 117

4 - وہ اک ایسا شجر ہو 179

تم ہنستی اچھی لگتی ہو

شاہ میر کے ساتھ کراچی سے کوئٹہ تک کا سفر ماہین کی زندگی کا بکواس ترین سفر تھا۔ اسے اپنی ذات پر بلاوجہ کی روک ٹوک اور تنقید زہر سے بھی بری لگتی تھی اور شاہ میر سارے راستے دادا جان بنا "یہ مت کرو، یہاں مت بیٹھو، ایسے مت کھاؤ" کا راگ الاپ رہا تھا۔ ممی نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اسے بے پناہ نصیحتوں سے نوازنے کے بعد شاہ میر سے کہا تھا۔

"اس کا خیال رکھنا۔ مجھے تو اس لڑکی کے بے ڈھنگے پن سے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔ تم بڑے ہو، تمہیں ہی اس کا دھیان رکھنا ہوگا۔" اور ممی کے ان ارشادات پر وہ بری طرح چڑ گئی تھی۔ اول تو وہ اب کوئی چھوٹی سی بچی نہیں رہی تھی جسے کسی دیکھ بھال کی ضرورت ہو۔

"پتا نہیں ممی کو یہ بات کب سمجھ میں آئے گی کہ اب میں بڑی ہو چکی ہوں۔" اس نے جل کر سوچا تھا اور دوسرے یہ کہ شاہ میر خود کون سا کوئی بہت میچور اور ذمہ دار بندہ تھا وہ اس سے محض تین سال بڑا تھا۔ مگر اس تین سالہ بڑائی کے باوجود گھر والے اور دیگر تمام لوگ اس کی ذہانت، سمجھ داری اور سوجھ بوجھ کے جس قدر قائل تھے ماہین کے بارے میں سب کے خیالات اسی قدر منفی نوعیت کے تھے۔ کوئٹہ ایئرپورٹ پر نانا ابا نے ان لوگوں کو ریسیو کیا تھا۔ وہ پورے ایک سال بعد ان سے ملی تھی۔ اس لیے انہیں دیکھتے کے ساتھ ہی بے تابی سے جا کر ان کے گلے لگ گئی تھی اس کے والہانہ انداز کا انہوں نے بھی بڑی گرم جوشی سے جواب دیا تھا۔ شاہ میر نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔

"تم صرف نانا ابا سے بات کر رہی ہو یا سارے ایئرپورٹ سے مخاطب ہو۔ آہستہ آواز میں انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتیں۔" اور وہ جو راستے بھر کی بھری ہوئی تھی نانا ابا کی شکل میں اپنا

سب سے بڑا حمایتی دیکھ کر ان سے بولی۔

''نانا ابا یہ سارے راستے مجھے ڈانٹتا رہا ہے۔ ایسے مت کرو۔ ایسے مت چلو، ممی نے یونہی ازراہ تکلف میرا خیال رکھنے کو کہہ دیا تو یہ خود کو سچ مچ میرا بزرگ سمجھنے لگا ہے۔'' اس کی شکایتوں پر نانا ابا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اپنی اس نواسی میں تو ان کی جان تھی۔

اس کی پیدائش اپنے ننھیال ہی میں ہوئی تھی۔ جن دنوں وہ پیدا ہونے والی تھی اس کے ڈیڈی کی پوسٹنگ لندن میں ہو گئی تھی۔ شوہر کے جانے کے بعد ممی کے لیے کراچی میں اکیلے رہنا مشکل ہوا تو وہ نانا کے پاس آ گئیں۔ گو بعد میں ڈیڈی نے ان لوگوں کو وہیں اپنے پاس بلا لیا تھا مگر اس دوران جو ایک سال ان لوگوں نے نانا ابا کے ہاں گزارا وہ لوگ اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اسی وقت سے ہی نانا ابا اور نانی امی اس کے دل و جان سے عاشق ہو گئے تھے۔

ان لوگوں کی اس درجہ چاہت ہی کا سبب تھا کہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں نانا ابا کے پاس آ کر گزارتی تھی۔ جون جولائی کی چھٹیوں میں ان لوگوں کی فیملی، خالہ اور چھوٹی خالہ کی فیملیز نانا ابا اور نانی امی کے پاس آیا کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ نانا کی تینوں بیٹیاں کراچی میں بیاہی گئی تھیں۔ بیٹا ان کا صرف ایک ہی تھا جو برسوں پہلے وطن کو خیر باد کہہ کر دیارِ غیر کا ہو گیا تھا۔ عید تہوار پر بیٹے، بہو اور پوتوں کو دیکھ کر وہ دونوں خوش ہو لیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار سوچتے پتا نہیں لوگ بیٹوں کی اتنی خواہش کیوں کرتے ہیں۔ کیا بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں ماں باپ کی زیادہ وفادار نہیں ہوتیں۔ دوسرے گھر جا کر بھی ماں باپ کو نہیں بھولتیں اور بیٹے ماں باپ کی تنہائی کا خیال کیے بغیر اپنی اپنی دنیا الگ بسا لیتے ہیں۔

ایسا ہی حال داؤد ماموں کا بھی تھا۔ وہ ایک بار جو کینیڈا کے ہوئے تو پھر ماں باپ کو بھول گئے۔ داؤد ماموں کے اس طرح چلے جانے کے بعد ممی اور خالاؤں نے نانا ابا اور نانی امی پر بہت زور ڈالا کہ وہ لوگ گھر وغیرہ کرائے پر دے کر کراچی شفٹ ہو جائیں۔ اس عمر میں تنہا رہنا نہایت دشوار ہے۔ مگر وہ دونوں ہی اپنا گھر اور اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے تو سب کو خاموش ہو جانا پڑا۔

زیارت سے کچھ ہی آگے وہ نہایت ہی پرفضا اور حسین جگہ تھی جہاں وہ لوگ رہا کرتے تھے۔ تایا ابا کے سیبوں کے باغات تھے اور وہیں قریب ہی ان کا گھر بھی تھا۔ قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار وہ خوب صورت سا گھر اور وہ جگہ اسے شروع ہی سے بہت اچھی لگتی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی پریوں کا مسکن ہے۔ صاف ستھری اور صحت بخش آب و ہوا اور آنکھوں کو تازگی بخشتے نظارے۔ وہ سارا سال یہاں آنے کے لیے دن گن گن کر گزارا کرتی تھی۔ جب تک سب بچے اسکول گوئنگ تھے جون جولائی کی چھٹیوں میں سب باجماعت آیا کرتے تھے۔ لیکن اب کچھ سالوں سے ایسا ہونے لگا تھا کہ کبھی کسی کے ایگزام ہیں تو کسی کے پریکٹیکل اور یوں وہ بچپنے والی بات ختم ہو گئی تھی اور اس سال تو جون، جولائی میں نانا ابا اور نانی امی داؤد ماموں کے پاس کینیڈا چلے گئے تو ان لوگوں کی ملاقات ہی نہ ہو پائی۔

نانا ابا بھی کاروبار کی مصروفیت کے سبب چکر نہ لگا سکے تو وہ ان لوگوں سے ملنے کے لیے بری طرح بے چین ہو گئی۔ وہ سیکنڈ سمسٹر کے ایگزام سے فارغ ہوئی تو فوراً ہی یہاں آنے کا پروگرام

بنا لیا۔ ممی تو اسے اکیلے کبھی بھی نہ بھیجتیں وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بڑی خالہ نے شاہ میر کے نانا ابا کے پاس جانے کی خبر سنائی۔

یہ ایک الگ داستان تھی کہ ممی کو منانے میں اسے کتنی مشقت کرنی پڑی تھی۔ شاہ میر نے اپنے ساتھ اس کے جانے کا سنا تو بہت چوں و چرا کی۔

''میں امتحانوں سے فارغ ہو کر چار دن وہاں سکون سے گزارنے جا رہا ہوں اور آپ اس بلا کو میرے پیچھے لگا رہی ہیں۔'' اس کی بات کا ماہین سے زیادہ بڑی خالہ نے برا منایا تھا۔ ان کی ڈانٹ پھٹکار اور طویل لیکچر ہی کی وجہ سے وہ اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوا تھا۔ ننھیال کی طرف کے تمام بچوں میں وہ سب سے بڑا تھا اور اپنی اس بڑائی کی کا اس نے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ باقی بچے تو پھر بھی شرافت سے شروع وقت سے اس کی بڑائی کو تسلیم کر گئے تھے مگر ماہین اس تین سالہ بڑائی کو بڑائی ماننے ہی کو تیار نہ تھی۔ یوں شاہ میر کے مقابل صرف ایک وہی ڈٹ گئی تھی۔ باقی چھوٹی خالہ کے بچے تو ابھی کافی چھوٹے تھے اور اس کے دونوں بھائی بھی شاہ میر سے خاصے چھوٹے ہونے کے سبب اسے بڑا بھائی تسلیم کرتے تھے۔

شاہ میر الیکٹرونکل انجینئرنگ کر کے تازہ تازہ فارغ ہوا تھا۔ فائنل ایئر کا پروجیکٹ submit کروا کے اس نے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ رزلٹ آنے میں ابھی کم سے کم ایک مہینہ تو لگنا ہی تھا وہ یہ فارغ وقت نانا ابا اور نانی امی کے ساتھ وہاں کے پرفضا اور خوشگوار موسم میں گزارنا چاہتا تھا ماہین کی طرح اس کا بھی اپنے ننھیال میں بہت دل لگتا تھا۔ ماہین ماس کمیونیکیشن میں آنرز کر رہی تھی۔ اسے خود کو بچہ کہلوانے سے سخت چڑ تھی مگر گھر میں اور خاندان میں کوئی بھی یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

''دو سال بعد میں آنرز کر لوں گی اور آپ لوگ مجھے ابھی تک بچہ سمجھتے ہیں۔'' یہیں آنے کے ایشو پر بحث ہوئی تو وہ چڑ کر بولی تھی۔

''چلو تو پھر دو سال گزرنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔ دو سال بعد ہم تمہیں بڑے ہو جانے کا سرٹیفکیٹ دیں گے۔'' شاہ میر نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ پھر اسے مزید چڑانے کے لیے سمیر سے بولا۔

''یار سمیر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انسان اپنی عمر سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ اس کی سوچ اور خیالات کی پختگی اسے بڑا یا چھوٹا ثابت کرتی ہیں۔ مجھ سے پوچھو تو میں تمہیں ماہین کا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔'' اور پھر اس بات پر ایک طویل جنگ چھڑی تھی۔

گھر پہنچے تو نانی امی بے چینی سے ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ بوا جی اور رحمت کاکا بھی ان لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔

''بوا جی آپ کے ہاتھوں کے پکے کھانے وہاں کراچی میں بھی بہت یاد آتے ہیں۔'' ماہین نے چپلی کبابوں سے انصاف کرتے ہوئے بوا جی کو مخاطب کیا تو ان کے جواب دینے سے پہلے ہی شاہ میر بول اٹھا۔

''بوا جی اس کی تعریفوں پر مت جائیے گا۔ یہ صرف آپ کو مسکہ لگا رہی ہے تا کہ جب تک

یہاں رہ کے آپ سے اپنی پسند کی چیزیں پکوا پکوا کر کھاتی رہے۔ ایسی ندیدی اور چٹوری لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ اور لڑکیوں کو دیکھو سب کتنی ڈائٹ کونشس ہوتی ہیں۔ کس چیز میں کتنی کیلوریز ہیں اس کا حساب کتاب رکھتی ہیں اور ایک یہ ہے بس ہر وقت کھلائے جاؤ۔"

"ایسے مت ٹوکو بھئی میری بیٹی کو۔" نانا ابا نے شاہ میر کو ٹوکا تھا اور وہ جو اس کے کمنٹس پر تلملائی ہوئی بیٹھی تھی فوراً بولی۔

"کہنے دیں نانا ابا اسے۔ ایسی باتوں سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ اب سب اس کی طرح تو ہو نہیں سکتے کہ گائے بھینسوں کی طرح چارہ کھائے جائیں۔"

ماہین نے اس کے پلیٹ بھر کے سلاد کھانے پر چوٹ کی تھی۔

"میر تمہارے پیپرز کیسے ہوئے۔ اس بار بھی پوزیشن آ رہی ہے کہ نہیں۔" نانی امی نے ماحول خوشگوار کرنے کی کوشش کے طور پر موضوع گفتگو تبدیل کروایا تھا۔

"بہت اچھے ہوئے نانی امی بس آپ لوگ ابھی سے تیاری کر لیں۔ میں نے آپ دونوں سے بڑا شاندار سا گفٹ وصول کرنا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"کیوں نہیں بھئی جو مانگو گے ملے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پوزیشن پہلی ہونی چاہیے۔" نانا ابا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"بس آپ لوگ دعا کریں۔" وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتا ہوا بولا تھا۔

وہ سارا دن تو نانا ابا اور نانی امی کے ساتھ باتوں ہی میں گزر گیا تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ، شاہ میر اور نانا ابا کافی دیر تک کارڈز کھیلتے رہے تھے۔ نانی امی وہیں بیٹھی نٹنگ کرتے ہوئے ان لوگوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں کے آنے سے نانا ابا اور نانی امی دونوں ہی بہت خوش ہو گئے تھے۔ بچوں کے آ جانے سے ان لوگوں کے گھر کی ویرانی ایک دم دور ہو گئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ تقریباً گیارہ بجے کھلی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر نیچے آئی تو گھر میں صرف نانی امی اور بوا جی تھے۔

"میر اور نانا ابا کہاں ہیں؟" ناشتا کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"وہ دونوں تو صبح کے نکلے ہوئے ہیں۔ میر تمہارے نانا کے ساتھ باغوں کی سیر کرنے گیا ہے۔" نانی امی کے جواب پر اس کا منہ بن گیا تھا۔

"اکیلے اکیلے چلے گئے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔" اس کے شکوے پر وہ مسکرا دی تھیں۔

"اب تمہیں کیا سوتے سے اٹھا دیتے۔ تمہارے نانا کو تو ویسے بھی وہاں سارا حساب کتاب چیک کرنے جانا تھا۔ تم ساتھ جاتیں بھی تو بور ہو جاتیں۔ میر تو خاص طور پر ساتھ گیا ہے ان کی مدد کرانے کے خیال سے۔" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ نانا ابا کے باغات میں بڑے عمدہ اور معیاری پھل پیدا ہوتے تھے۔ فصل بھی اچھی ہوتی تھی۔ شاید ان کے کاروبار میں برکت کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس عمر میں بھی سارے کام خود کیا کرتے تھے۔ انہوں نے سارا کام لازمین پر نہیں چھوڑا تھا۔ نئے دور کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے انہوں نے وہاں کافی ایڈوانس ٹیکنالوجی بھی استعمال کی تھیں۔ باقاعدہ ایگریکلچرس اور سول انجینئرز سے سالانہ اپنے

باغات کا معائنہ کرواتے تھے۔

ناشتا ختم کرتے ہی وہ باہر جانے کے لیے بے چین ہو گئی۔

"لنچ ٹائم تک میر اور تمہارے نانا ابا آ جائیں گے کھانے کے بعد میر کے ساتھ جہاں دل چاہے چلی جانا۔" نانی امی نے اس کا ارادہ جان کر انکار کیا تھا۔

"اب میں کیا اتنی دیر اکیلی بیٹھی بور ہوتی رہوں۔ جانے دیں نا۔ زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ بس آس پاس کا ایک چکر لگا کر آ جاؤں گی۔" وہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سکون سے بیٹھو۔ یہاں اکیلی عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتیں اور تمہیں تو ڈھنگ سے راستے بھی یاد نہیں ہیں۔" نانی امی نے اب کے سختی سے منع کیا تو وہ منہ بنا کر چپ ہو گئی۔

"بے فکر رہو میں تمہیں بور نہیں ہونے دوں گی۔ چلو کچن میں چلیں، تم کڑاہی گوشت پکاؤ میں جب تک کھیر بنا لوں گی۔ میر کو میرے ہاتھ کی بنی کھیر بہت پسند ہے۔" نانی امی کچن کی طرف جاتے ہوئے اس کے ہوش اڑا گئی تھیں۔ کھانا پکانے کے نام سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ اسے کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا بس یہ تھا کہ کچن میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مارے بندھے کچن میں جاتی اور جلدی جلدی الٹا سیدھا کام کر کے وہاں سے بھاگنے کی کرتی تھی۔

"کیا ہے نانی امی میں دو دن یہاں سکون سے گزارنے آئی ہوں اور آپ مجھے باورچی کے فرائض تفویض فرما رہی ہیں اور اتنا دعوتی اہتمام کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ وہ کیا کہیں کا لینڈ لارڈ ہے جس کے لیے کھیر پکنی بہت ضروری ہے۔ بس یہ بوا جی نے بریانی بنا تو لی ہے۔ ایک ڈش کافی ہے۔ ویسے بھی اس طرح رزق ضائع ہوتا ہے۔ کھانے کی میز پر صرف ایک ہی ڈش ہونی چاہیے اور میٹھے میں ہم لوگ فروٹ کھائیں گے جو صحت کے لیے نہایت مفید ہیں۔ آئیں اب چل کر بیٹھتے ہیں اور کچھ گپ شپ کرتے ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تھی اور اس کی بات پر بوا جی اپنا بے ساختہ قہقہہ روک نہیں پائی تھیں۔ نانی امی چہرے پر خفگی بھرے تاثرات لیے اسے گھور رہی تھیں۔

"باتیں جتنی چاہے بنوا لو جتنی تمہاری زبان چلتی ہے اگر ہاتھ بھی چلتے ہوتے تو کیا بات تھی۔ کام نہ کرنے کے سو بہانے سن لو اس لڑکی سے۔" گفتگو کے اختتام پر وہ بوا جی سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"اچھا پکانے کا دل نہیں چاہ رہا تو بیٹھے بیٹھے یہ بادام اور پستے ہی کاٹ لو۔" نانی امی کی مزید خفگی سے بچنے کے لیے وہ وہیں کچن میں موجود ٹیبل کے آگے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

"میر! تم کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" لنچ کے بعد کچھ دیر سستا کر وہ جیسے ہی باہر کے لیے نکلنے لگا ماہین اس کے پیچھے چلی آئی۔

"میرے سر پر سوار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا

تھا۔ وہ اس کی بدتمیزی پر کھول کر رہ گئی تھی۔ نانا ابا اور نانی امی تو لنچ کے بعد ہی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ لوگ تہجد کے وقت کے اٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ اس لیے دوپہر میں سونا لازمی تھا۔ شاہ میر اسے ٹکا سا جواب دے کر جا چکا تھا۔

کچھ دیر تو وہ بھی لیٹ کر سونے کی کوشش کرتی رہی مگر صبح سو کر ہی اتنی دیر سے اٹھی تھی کہ اب نیند ہی نہیں آ رہی تھی اسے ویسے بھی دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ لوگ تو اب عصر کے وقت ہی اٹھیں گے۔ بواجی اور رحمت کاکا بھی اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میں باہر ہو بھی آؤں گی۔ اب کیا یونہی گھر میں بند بیٹھی رہوں۔ وہ بدتمیز سارے زمانے میں سیریں کرتا پھرے اور میں یہاں پڑی سڑوں وہ خود کو اطمینان دلاتی گھر سے نکل آئی تھی۔

باہر بڑا پیارا موسم ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی بھی لمحے بارش شروع ہو جائے گی اور وہ بے چاری کراچی کی شہری جو بارشوں کو ترستے ہیں خوشی خوشی اس موسم کو انجوائے کر رہی تھی۔ گھر سے ذرا آگے جا کر ہی نانا ابا کے باغات تھے۔ وہ قصداً اس طرف نہیں گئی۔ وہاں کے تمام ہی ملازمین اس سے واقف تھے اور وہ اپنی اس خفیہ سیر کو خفیہ ہی رکھنا چاہتی تھی اسی لیے گھر کے مخالف سمت میں جاتے ہوئے راستے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں آس پاس کوئی اور مکان نہیں تھے۔ نانا ابا کا گھر ان کے باغات اور دور دور تک پھیلی ہریالی اور پہاڑوں کے سوا وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ تھوڑی سی واک کے بعد پھر وہاں بہت سے مکانات تھے۔ جن میں بیشتر مکانات تو یہیں کے ملازمین کے تھے۔ وہ اپنا کیمرہ سنبھالے ان اونچے نیچے راستوں پر احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ فوٹو گرافی اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ دو چار جگہ رک کر اس نے تصاویر بھی کھینچیں۔ اسی دوران بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ کیمرے کو واپس اس کے کور میں بند کر کے مزید احتیاط کی خاطر اسے دوپٹے میں چھپا کر چلنے لگی۔ یہ جگہیں اور یہاں کا موسم کچھ بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ان تمام چیزوں کو وہ اپنے بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس طرح اکیلے پہلی مرتبہ نکلی تھی تب ہی اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ بارش کی شدت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ دن میں اچھا خاصا اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ ہوا کی تند و تیز لہروں نے اسے سردی کا احساس دلایا تو اسے سوئیٹر نہ پہننے پر افسوس ہوا۔ دونوں ہاتھ لپیٹے وہ سردی سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ پتا نہیں کتنی دور نکل آئی تھی۔ موسم کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے اس نے واپسی کا فیصلہ کیا ویسے بھی اب اسے نکلے خاصی دیر ہو چکی تھی۔

اونچے اونچے درخت ہر طرف پھیلی خاموشی اور اندھیرا اسے خوف میں مبتلا کرنے لگے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی ڈرپوک لڑکی نہیں تھی مگر اس وقت اکیلے ہونے کے خیال سے اسے ایک دم ڈر لگنے لگا تھا۔ یہ جگہ جہاں وہ اس وقت کھڑی تھی اس نے اس سے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہاں سوائے بارش کے شور اور ہواؤں کے کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ابھی وہ واپسی کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے ایک نسوانی چیخ سنی آواز اتنی واضح اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اسے اپنا وہم سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے فوراً ہی اپنی تازہ ترین دیکھی ہارر مووی یاد آ گئی۔ جس میں ایک بدروح یونہی ویرانوں میں بسیرا کیے رکھتی ہے اور اسی طرح چیخ کر انسانی روپ میں لوگوں کو اپنے پاس مدد کے لیے بلاتی ہے اور پھر یہ سوچ اس کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ جلدی سے

الٹے قدموں اندھا دھند بھاگی۔ ممی نے ایک مرتبہ ایسا ہی کوئی قصہ سناتے ہوئے بتایا تھا کہ بدروحیں وغیرہ آیت الکرسی پڑھو تو فوراً بھاگ جاتی ہیں۔ اس نے جلدی سے آیت الکرسی پڑھنی شروع کی۔ مگر گھبراہٹ اور ڈر میں اسے آیت الکرسی ہی بھول گئی۔ ہر نماز کے بعد اور رات سونے سے پہلے وہ پابندی سے آیت الکرسی پڑھا کرتی تھی اور اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے کبھی یاد تھی ہی نہیں۔

وہ دیوانہ وار بھاگتی اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اچانک کسی سے بری طرح ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے ایک طویل و عریض چیخ برآمد ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں مضبوطی سے بند کیے سوچ رہی تھی۔

''میری زندگی کا آخری وقت آ گیا۔ ان روحوں کے لیے آگے پیچھے کسی بھی طرف سے آنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ابھی اگر وہ دوبارہ پیچھے کی طرف بھاگوں تو وہ پھر میرے سامنے آ جائے گی۔ اپنے لمبے لمبے دانت میری گردن میں گاڑ دے گی۔''

''کیوں آئی ہو تم اکیلی، دوسروں کو پریشان کرنے کے علاوہ تمہیں کوئی اور کام آتا ہے۔''

شاہ میر کی غصیلی آواز کانوں میں آئی تو اس نے جھٹ آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ سامنے کھڑا اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ معاً اسے خیال آیا کہیں یہ بدروح کی کوئی چال تو نہیں ہو سکتا ہے وہ اسے دھوکا دینے کے لیے شاہ میر کے بھیس میں آئی ہو۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی وہ بغیر اس کی بات کا جواب دیے دوبارہ اندھا دھند بھاگنا شروع ہو گئی شاہ میر ایک سیکنڈ کے لیے تو اس کے ابنارمل انداز پر حیران ہوا پھر اس خیال سے کہ کہیں اس طرح بھاگنے سے وہ گر گرا نہ جائے فوراً اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگنے کے چکر میں سامنے پڑے بڑے سے پتھر سے ٹکرا گئی تھی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں خود بھی لڑکھڑا گیا تھا۔

''چھوڑو مجھے تم میر نہیں ہو۔ دیکھو مجھے جانے دو۔ میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔''

''ہائیں۔'' وہ ہکا بکا اس کی شکل تک رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر پہلے تو تمہیں گھر پر اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا۔'' وہ حیران ہو کر اس کی خوفزدہ شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے خوف و دہشت کے سائے دیکھ کر اچانک ہی شاہ میر کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ وہ ہارر اور detective موویز دیکھنے اور ناولز پڑھنے کی جنون کی حد تک شوقین تھی یہ اور بات تھی کہ خالہ اس کے اس شوق سے سخت عاجز رہا کرتی تھیں۔ جس دن کوئی زیادہ ہی ڈراؤنی فلم دیکھ لیتی سمیر یا احمر کے کمرے میں پہنچ جاتی ''میں تمہارے کمرے میں سوؤں گی۔'' اور اسی بات سے اس کے بھائی اور ممی چڑا کرتے تھے۔ ''یا تو دیکھا مت کرو اور اگر دیکھنا اتنا ہی فرض ہے تو ڈرا مت کرو۔'' سمیر نے اسے ٹوکا تھا مگر وہ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑ پائی تھی۔

اس کا ڈرنا سمجھ میں آیا تو وہ اپنی مسکراہٹ دباتا ہوا آواز کو قدرے بھاری اور خوفناک بنا کر اس سے بولا۔

''ڈرو مت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا آؤ میرے ساتھ۔'' شاہ میر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگا تو وہ دوبارہ چیخ اٹھی۔

''چھوڑو مجھے۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام تھی۔ شاہ میر نے غور سے اس

کی طرف دیکھا تو اندازہ ہوا اس وقت یہ ہنسی مذاق کہیں اسے مہنگا ہی نہ پڑ جائے اگر جو وہ بے ہوش ہوگئی تو اس برستی بارش میں اسے گھر تک پہنچانا ایک نہایت مشکل کام ثابت ہوگا۔ اسی لیے فوراً ہی سنجیدگی اختیار کرتا ہوا بولا۔

''کیا ہوگیا ہے ماہین یہ میں ہوں بھئی۔''

''تم واقعی میر ہو۔'' وہ اب بھی یقین کرنے میں متامل تھی۔

''ہاں بھئی میں ہوں۔ سو فیصد میں ہی ہوں۔ شاہ میر حسن اب کیا جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھاؤں۔'' وہ اب کے کچھ چڑ کر بولا تھا۔

''شکر ہے میر تم آگئے میں ڈر گئی تھی۔'' اور اس بات پر وہ بلند و بالا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''میں نے کہا کہ میں شاہ میر ہوں اور تم نے یقین کر لیا۔ جس طرح چور یہ کبھی نہیں کہتا کہ میں چور ہوں اسی طرح روحیں یہ کبھی نہیں کہتیں کہ ہم روحیں ہیں۔'' وہ ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ کر دور ہٹ گئی تھی اور دوبارہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کی شرارتی مسکراہٹ ماہین کی نظروں سے اوجھل نہ رہ پائی تو وہ اس کا مذاق سمجھ کر کچھ شرمندگی کے عالم میں دوبارہ چلنا شروع ہوگئی۔

''ڈر کے مارے جان نکلتی ہے اور چلی ہیں اکیلی سیر کرنے زمانے بھر کی بیوقوفانہ حرکتیں کروا لو تم سے۔ وہ تو اتفاق سے میں اپنے رین شوز لینے آگیا تھا تو دیکھا محترمہ غائب ہیں۔ بتاؤ اگر میں واپس نہ آتا تو کیا ہوتا۔ سب کتنا پریشان ہوتے۔ تمہیں عقل کب آئے گی۔ اسی لیے میں اکیلا آنا چاہ رہا تھا۔ لے کر میرا بھی سارا پروگرام چوپٹ کروا دیا۔ سارا ٹائم تمہیں ڈھونڈتے خوار ہوتے گزر گیا۔ لگتا ہے تم مجھے یہاں سکون سے چھٹیاں انجوائے نہیں کرنے دو گی۔'' وہ اب اس کی کلاس لینا شروع ہوگیا تھا۔

''تو میں اکیلی گھر پر کیا کرتی۔ تم نے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا اور نانا ابا اور نانی امی سو گئے میں اتنی بور ہو رہی تھی۔'' وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر چلتے ہوئے بولی تو شاہ میر اسے گھور کر دیکھنے لگا۔

''یعنی یہ کہ اپنی غلطی نہیں مانو گی۔ ڈھیٹ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ابھی تو تیاری کر لو نانی امی اور نانا ابا سے پڑنے والی ڈانٹ کے لیے اب تو سب جاگ گئے ہوں گے۔ وہی تمہارا دماغ درست کریں گے۔'' وہ اسے دھمکاتا ہوا بولا تھا۔

''میر پلیز میرے پیارے بھائی نہیں ہو۔ دیکھو تم جو کہو گے میں کروں گی پلیز کسی کو بتانا مت۔'' وہ منت بھرے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''نہ پیارا نہ دلارا، میں برا ہی ٹھیک ہوں۔ تم جیسے لاتوں کے بھوت ایسے ٹھیک نہیں ہوتے۔ آج کی حرکت پر تو نانا ابا بھی تمہیں ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ بڑی بے مروتی سے بولا تھا۔

''پلیز میرا اچھا وہ جو میرا ایار کر کا پین تمہیں اچھا لگا تھا وہ تم لے لو دیکھو پلیز یو آر مائی ڈیسٹ اینڈ سوئیٹس کزن۔'' اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس اسے خود بھی ہو رہا تھا اسی لیے مزاج کے خلاف اس کی منتوں میں مصروف تھی۔

''اب تو بالکل بھی نہیں۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں کیا رشوت خور ہوں۔'' وہ مزید اکڑ گیا تھا۔

گھر پہنچے تو نانا ابا اور نانی امی گیٹ کے پاس ہی کھڑے نظر آئے ان دونوں کو ساتھ آتا دیکھ کر دونوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

''میں کہہ بھی رہا تھا کہ ماہین، میر کے ساتھ ہی گئی ہوگی مگر یہ مان ہی نہیں رہی تھیں۔ کہ میر کا تو رائیڈنگ کا پروگرام تھا وہاں ماہین کا کیا کام وہ ضرور اکیلی نکل گئی ہے۔ خود بھی پریشان ہو رہی تھیں اور مجھے بھی ہولا رہی تھیں۔'' نانا ابا نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا تو وہ چپ چاپ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس بے مروت نے تو ویسے بھی صاف صاف انکار کر دیا تھا پتا نہیں بس اب وہ سب اگل دے گا اور پھر زندگی میں پہلی مرتبہ نانا ابا اس سے ناراض ہو جائیں گے۔ اسے اپنے اس طرح گھر سے جانے پر اب افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب افسوس کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

''جی نانا ابا رائیڈنگ کا پروگرام تو تھا بس موسم کی وجہ سے پروگرام کینسل کرنا پڑا۔'' شاہ میر کا جواب اسے حیران کر گیا تھا۔ اس سے کسی نیکی کی امید جو نہیں تھی۔

''ہاں آج بڑے دنوں بعد اتنی موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔ ایسے موسم میں تو یہاں رہنے والے بھی احتیاط کرتے ہیں۔'' نانا ابا نے شاہ میر کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر خود بخود گفتگو کا رخ بارشوں اور موسم کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ اپنی جان بچ جانے پر جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔

رات کا کھانا کھا کر کچھ دیر سب باتیں کرتے رہے۔ سونے سے پہلے وہ شاہ میر کے کمرے میں آئی تھی۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

''اگر کیا بھی ہو تو اب تو آپ اندر آ چکی ہیں۔ فرمائیے کیسے زحمت کی۔'' وہ laptop پر کام میں مصروف بولا تھا۔ کمپیوٹر میں اسے بہت انٹرسٹ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ یہاں بھی اپنا laptop ساتھ لے آیا تھا عام حالات میں ماہین کو اس کی گفتگو کا یہ طنزیہ انداز زہر لگا کرتا تھا مگر اس کی آج کی نیکی کے صدقے وہ اسے نظر انداز کر گئی۔ وہ اسے اگنور کیے اپنے کام میں مصروف تھا۔

''شو ایسے کرتا ہے جیسے سارے جہاں کا بوجھ اسی کے کندھوں پر ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خار کھاتی بظاہر مسکراتے ہوئے اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی آئی ایم ریئلی تھینک فل ٹو یو۔'' شاہ میر نے سر اٹھا کر بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ ڈرامے بازی مت کرو۔ جو کہنے آئی ہو وہ کہو۔'' وہ اس کی چالاکی پر جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔

''اسے کیسے پتا چلا کہ میں کوئی خاص بات کرنے آئی ہوں۔'' ماہین دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

''تم میرے بارے میں کتنے برے خیالات رکھتے ہو۔ میں کیا اتنی احسان فراموش ہوں کہ ایک تو تم مجھے وہاں سے اتنی بارش میں واپس لے کر آئے میری خاطر رائیڈنگ کے لیے نہیں گئے،

نانا ابا سے میری شکایت نہیں کی اور میں پھر بھی تمہیں تھینکس نہ کہوں۔"

وہ چہرے پر بڑے معصومانہ تاثرات لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ میر نے بجائے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے laptop ایک طرف کر دیا اور بڑی سنجیدگی اور پوری توجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔

"لگتا ہے کوئی بہت ہی خاص بات ہے۔ اگل بھی چکو اب تو میں بھی curiosity میں مبتلا ہونے لگا ہوں۔" ماہین اس کی ذہانت کی قائل ہوتی آخر کار اصل بات کی طرف آ ہی گئی۔

"پتا ہے میر! آج جب تم وہاں آئے تھے میں کس وجہ سے ڈر گئی تھی؟"

"اب یہاں کسوٹی کھیلا جائے گا۔ مجھے کیا پتا کیوں ڈر گئی تھیں۔ وہ جگہ بھی ایسی نہیں تھی کہ میں کہوں کوئی شیشہ وغیرہ پڑا ہوگا اور اس وجہ سے تم ڈر گئی ہوگی۔ مختصر لفظوں میں اصلی بات بتا دو۔" شاہ میر اس کے انداز پر چڑ کر بولا تھا اور وہ اس کی بات پر غور کیے بغیر بولنے ہی والی تھی کہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیا کہا تم نے میں نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھ لی ہوگی۔ یعنی میں اتنی ugly ہوں میر تم کتنے بدتمیز ہو۔" وہ اس سے بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔ اسے اٹھ کر جاتا دیکھ کر وہ منانے والے انداز میں روکتا ہوا بولا۔

"اچھا جا کہاں رہی ہو۔ بتاؤ ہوا کیا تھا۔"

"نہیں بتا رہی میں تمہیں کوئی بات۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"بغیر بتائے تمہیں نیند نہیں آئے گی۔ لہٰذا غصہ تھوک دو اور شروع ہو جاؤ۔ یار تمہارے سینس آف ہیومر کو کیا ہو گیا ہے۔ آئی واز جسٹ آ جوک۔" شاہ میر کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔ مگر یہ بات کسی نہ کسی کو بتائے بغیر اسے چین نہیں آتا اور فی الحال دستیاب لوگوں میں سے صرف وہی تھا جس سے وہ یہ بات ڈسکس کر سکتی تھی۔ اس لیے دوبارہ آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں نے وہاں ایک عورت کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔" وہ دوبارہ اس وقت کا منظر یاد کر کے جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

"عورت کی چیخ؟" شاہ میر نے تصدیق چاہی تھی۔

"بلیو می میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں اب تم کہو گے کہ مجھے دھوکا ہوا ہوگا۔ مگر میں نے وہ چیخ اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنی تھی۔" وہ اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اتنی سنسان اور ویران جگہ پر کسی عورت کا کیا کام۔ اس جگہ تو میں نے سنا ہے یہاں رہنے والے بھی بہت کم جاتے ہیں۔ لاسٹ ایئر جب میں یہاں آیا تھا تو رحمت کاکا مجھے بتا رہے تھے کہ اس جگہ کے بارے میں یہاں لوگوں نے الٹی سیدھی بہت سی کہانیاں گھڑ لی ہیں مثلاً یہ کہ وہاں کوئی بدروح وغیرہ بسیرا کیے ہوئے ہے وغیرہ۔ پچھلے سال وہاں ایک عورت کی لاش ملی تھی اس کے بعد سے لوگوں نے یہ کہانیاں بنالی ہیں تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ لوگ ایسی باتوں پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس جگہ کسی عورت کے جانے کے چانسز تو بہت ہی کم ہیں۔ تم خود بتاؤ اگر تمہیں یہ سب پتا ہوتا تو تم بھی اس طرف کا رخ کرتیں۔" شاہ میر نے اپنی عادت کے برخلاف بڑی تفصیل سے اسے ساری بات بتائی

تھی۔

"اس کا مطلب ہے وہاں واقعی کوئی بدروح رہتی ہے۔" وہ خوفزدہ انداز میں بولی تھی۔

"کم ان ماہین۔ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ بے چارے سیدھے سادے کم علم لوگ ایسی باتوں پر عقیدہ رکھتے ہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ اس کا خوف دور کرنے کے خیال سے بولا تھا۔

"میر تم میری بات کا یقین کر دیا نہ کرو۔ مگر میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ میں یہ بات مان ہی نہیں سکتی کہ مجھے دھوکا ہوا ہوگا۔" وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی تھی اور شاہ میر بغیر کوئی جواب دیے دوبارہ laptop سامنے رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بڑے محتاط قدموں سے چلتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ رات ماہین کو جھٹلانے کے باوجود اس کے پُریقین انداز نے شاہ میر کو فطری تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ نانی امی کو مارننگ واک کا بتا کر وہ گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ بڑا بہادر اور adventurous تھا۔ ماہین کی طرح اسے بھی detective موویز دیکھنا اور ایسے ناولز پڑھنا بہت پسند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ الیکٹریکل انجینئر نہ بنتا تو یقیناً ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹو تو ضرور بن گیا ہوتا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کا چلنا محسوس ہوا۔ ریوالور ہاتھ میں لیے وہ بڑی تیزی سے گھوما تھا۔ اسے گھومتا دیکھ کر وہ درخت کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ مگر شاہ میر اسے دیکھ چکا تھا۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں پر۔" وہ اس کے سر پر کھڑا غرا رہا تھا۔ اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر سر جھکائے کھڑی تھی۔

"ایڈیٹ، اسٹوپڈ، ایک دم جاہل ہو۔ کیوں آئی ہو تم یہاں پر۔" وہ دانت پیستا ہوا بولا تھا۔

"میر پلیز میں بھی ساتھ چلوں گی۔" وہ بڑی لجاجت سے گویا ہوئی۔

"اور وہاں چیخ چلا کر مجھے بھی مرواؤ گی۔ ہرگز نہیں جاؤ واپس۔" وہ صاف انکار کرتے ہوئے بولا تھا۔ "ٹھیک ہے پھر میں جا کر سب کو بتا دوں گی کہ تم مارننگ واک کا بہانہ بنا کر اصل میں گئے کہاں ہو۔" وہ اسے دھمکاتے ہوئے بولی تھی۔

"ذرا سی چیخ سن کر تو دم نکل گیا تھا۔ فرض کرو اگر وہاں واقعی کوئی آسیب وغیرہ ہوا تو تم کیا کرو گی۔" شاہ میر نے اپنا انداز گفتگو تبدیل کرتے ہوئے سمجھانے والا طریقہ اختیار کیا۔

"کل میں mentally prepare نہیں تھی اور دوسرے یہ کہ اکیلی بھی تھی آج تو تم ساتھ ہو۔ مجھے بالکل بھی ڈر نہیں لگ رہا۔" ماہین نے کمال اطمینان سے کندھے اچکاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔

"ماہین میں تمہیں آخری دفعہ وارن کر رہا ہوں کہ واپس چلی جاؤ۔" وہ بڑے خطرناک تیور لیے اسے گھور رہا تھا۔ چونکہ سردیوں کے دن تھے اس لیے ابھی تک بھی روشنی نہیں پھیلی تھی چاروں طرف سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ عین اسی وقت ان دونوں نے ایک آواز سنی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی

گاڑی یا شاید جیپ کہیں آس پاس ہی آ کر رکی ہے۔ شاہ میر ایک دم چوکنا ہوا تھا۔ اور بڑی برق رفتاری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس افراتفری میں بھی وہ اسے گھورنا نہیں بھولا تھا۔

''اگر تمہاری وجہ سے ہم لوگ کسی مصیبت میں پھنسے تو یاد رکھنا میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' اس نے ماہین کے کان کے پاس سرگوشی میں دھمکی دی تھی۔ چہرے پر اعلیٰ درجہ کی بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ ماہین کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ بہت سی جاسوسی فلموں کی کہانیاں اس کے ذہن میں گھومنے لگی تھیں۔ یقیناً یہ علاقہ کسی بہت بڑے اسمگلروں کے گروہ کا ہیڈ کوارٹر ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر اس جگہ کو آسیب زدہ مشہور کروا دیا ہے تاکہ لوگ ادھر کا رخ نہ کریں اور ان کی سرگرمیاں جاری و ساری رہ سکیں۔ میں اور میر ان لوگوں کو گرفتار کروائیں گے پھر اخبارات میں ہماری تصاویر شائع ہوں گی۔ ہمیں شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا کہ ہم نے ملک دشمنوں کا صفایا کروایا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلے ۲۳ مارچ کو مجھے اور میر کو بھی ایوانِ صدر بلا کر ہماری کارکردگی کی بنیاد پر میڈل سے نوازا جائے۔'' وہ خیالوں کی دنیا میں محوِ پرواز خود کو تمغہ وصول کرتے دیکھ رہی تھی۔

''اور یہ میر کا بچہ کتنا چالاک ہے۔ اس جگہ کے بارے میں، میں نے اسے بتایا اور موصوف سارا کریڈٹ خود لینے کے چکر میں چپکے چپکے اکیلے چلے آئے۔ خیر میں کون سی کم ہوں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ پتا تھا مجھے جب تک یہ اپنی آنکھوں سے اس جگہ کا معائنہ نہ کر لے اسے چین نہیں آئے گا۔ اسے اتنی صبح صبح نکلتے دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کہاں جا رہا ہے۔ میں اسے اکیلے اتنا بڑا معرکہ سر کرتے تو نہیں دیکھ سکتی۔''

وہ سانس بھی بڑی آہستگی سے لے رہی تھی اور شاہ میر اس کے خیالات سے بے نیاز درخت کے اوٹ لیے پتا نہیں کہاں دیکھ رہا تھا۔ جب دس پندرہ منٹ گزر گئے اور ان لوگوں نے دوبارہ کسی بھی قسم کی کوئی آواز نہیں سنی تو شاہ میر درخت کی اوٹ سے نکل آیا اسے نکلتے دیکھ کر ماہین بھی باہر نکل آئی۔ شاہ میر نے سمت کا اندازہ کر کے چلنا شروع کیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تھوڑا ڈر بھی لگ رہا تھا مگر بہر حال یہ اطمینان تھا کہ شاہ میر ساتھ ہے۔ اور اس کے ہوتے ماہین کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ بچپن میں ایک دفعہ جب وہ لوگ پکنک منانے گئے تھے اور وہاں بڑوں کی نظروں سے بچ کر وہ سمندر میں تھوڑا آگے تک چلی گئی تھی۔ سمندر کی تند و تیز لہروں کے آگے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور ڈوبنے لگی تو ساحل پر اس کے دیگر کزنز کے ساتھ کھڑا شاہ میر فوراً آگے بڑھا تھا۔ باقی کسی میں ہمت نہ ہوئی تھی کہ اسے بچا لے لیکن شاہ میر نے اسے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ تمام تر اختلافات کے باوجود ماہین اس کی بہادری کی قائل تھی۔ کل جس جگہ ماہین نے چیخ سنی تھی وہ دونوں اس مقام سے کافی آگے نکل آئے تھے۔ اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتے وہ دونوں گرد و پیش کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ کافی دور اسے ایک مکان نظر آیا۔ مکان بھی کیا اسے ایک کھنڈر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جیسے جیسے وہ اس جگہ سے قریب ہو رہے تھے ویسے ویسے اس کی ہارٹ بیٹ تیز ہو رہی تھی۔ ''اسی مکان میں سے اس عورت کی لاش ملی تھی۔'' شاہ میر نے شاید جان کر اسے ڈرانے کے لیے یہ بات بتائی تھی۔ اس نے بے اختیار شاہ میر کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''ڈرا تنا لگتا ہے اور چلی ہیں جاسوسی فلموں کی ہیروئن بننے، خود بھی مریں گی اور ساتھ مجھے بھی مروائیں گی۔'' وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ ذرا اور آگے بڑھے تو اس کھنڈر نما گھر سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ایک جیپ بھی نظر آ گئی۔ شاہ میر اس کا ہاتھ تھامے اب درختوں کی اوٹ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اس جگہ کے بالکل ہی قریب پہنچ گئے تو شاہ میر پورا کا پورا زمین پر لیٹ کر آگے بڑھنے لگا۔ ماہین نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ ڈرنے کے ساتھ ساتھ ایکسائٹمنٹ بھی ہو رہی تھی۔ شاہ میر نے مکان کی پچھلی طرف کا رخ کیا تو ماہین نے اس کی عقلمندی کی دل ہی دل میں داد دی۔ مکان کی پچھلی طرف پہنچے تو وہاں ایک عدد کھڑکی دیکھ کر وہ دونوں ہی خوش ہو گئے۔ ماہین سوچ رہی تھی کہ اتنی ویران اور سنسان جگہ پہ مکان بنانے کی کسی کو ضرورت کیا تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں برسوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ اس کی خستہ حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اب گری کہ تب۔ اسی وقت انہوں نے کسی آدمی کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ وہ شاید کسی کو مار رہا تھا کم از کم آواز سے تو یہی لگ رہا تھا۔ کسی عورت کے رونے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ شاہ میر نے اسے آنکھوں آنکھوں میں اشارے سے زمین پر یونہی لیٹے رہنے کو کہا اور خود تھوڑا سا اٹھ کر کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔

اندر تین آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ تینوں کے تینوں حلیے سے قبائلی معلوم ہو رہے تھے۔ تینوں کے چہروں پر سخت بے رحم تاثرات رقم تھے۔ باقی دو تو خاموشی سے کھڑے تھے۔ جبکہ تیسرا چیختا، چلاتا پتا نہیں کسے مار رہا تھا۔ غالباً وہ عورت فرش پر پڑی تھی اور وہ اسے پیر سے ٹھوکر مارتا کسی علاقائی زبان میں کچھ بولا تھا۔

''کیا ہے خود دیکھے جا رہے ہو۔ میں بھی دیکھوں گی۔'' ماہین آہستہ سے بولی تھی۔ شاہ میر نے اسے صرف پلٹ کر گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا اور دوبارہ وہیں متوجہ ہو گیا تھا۔ اپنی بات کے جواب میں اس کی لاتعلقی دیکھ کر وہ سخت بدمزہ ہوئی۔

''پتا نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ خود ہی اکیلے اکیلے دیکھے جا رہا ہے۔'' وہ اسے دو تین شاندار قسم کی گالیوں سے نوازتی خود بھی تھوڑا سا اٹھ گئی اور ذرا اچک کر اندر کا جائزہ لیا۔ اندر موجود ان تینوں آدمیوں کے حلیے دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ ان کی خشونت بھری نگاہیں، بڑی بڑی مونچھیں اور کندھوں سے لٹکی رائفلیں دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ سارا ایڈونچر لمحوں میں ختم ہو گیا تھا اور اب سوائے ڈرنے کے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اب یہ فلم تو تھی نہیں کہ جس سین میں زیادہ ہی ڈر لگے اسے فارورڈ کر دے۔ یا اتنی دیر کے لیے اسکرین پر سے نظریں ہٹا لے۔

''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' حسبِ عادت اسے کام کرنے کے بعد افسوس کرنے کا خیال آیا تھا۔ شاہ میر نے اسے آنکھوں آنکھوں میں دوبارہ اسی طرح لیٹ جانے کی تنبیہ کی اور ابھی وہ اس پر عمل کرنے ہی والی تھی۔ کہ اندر موجود اس آدمی نے جو کسی عورت کو بے دردی سے مار رہا تھا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی کم عمر سی لڑکی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ابھی ماہین ڈھنگ سے اس لڑکی کا معائنہ کر بھی نہیں پائی تھی کہ اس آدمی نے اس سے دوبارہ کچھ کہا اور پھر اس کی طرف ریوالور تان کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے چاری ہاتھ

باندھے زاروقطار رو رہی تھی۔

"میر کچھ کرو۔ وہ اسے جان سے مار دے گا۔" شاہ میر کا دل چاہا اس کا گلا دبا دے۔ کھڑکی کے پاس کھڑی وہ اس سے بات کر رہی تھی اگر ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ عین اسی لمحے اس آدمی نے اس لڑکی کی طرف فائر کیا تھا۔ شاہ میر نے کس کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی بے ساختہ چیخ کا گلا دبا دیا تھا اور اگلے لمحے اسے بڑی بے دردی سے زمین پر دھکا دے دیا تھا۔ اس کی چوٹوں کی پرواہ کیے بغیر وہ دوبارہ وہیں متوجہ ہوا تو اب وہ تینوں آپس میں کچھ بات چیت کرتے نظر آئے۔ لڑکی کو صحیح سلامت دیکھ کر شاہ میر نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے اس آدمی کے فائر کرنے کے انداز سے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد لڑکی کو مارنا نہیں بلکہ صرف ڈرانا ہے۔ آپس میں دو چار منٹ بات چیت کے بعد اب وہ دوبارہ لڑکی کی طرف بڑھا تھا اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس نے چیخ کر کچھ کہا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بری طرح فرش پر گر پڑی تھی۔

وہ شاید یہاں کسی کی بھی موجودگی کی توقع نہیں کر رہے تھے اس لیے انہیں ان لوگوں کی موجودگی کے بارے میں شک تک نہیں ہوا تھا۔ یعنی وہ اس جگہ کے بارے میں اچھی طرح آگاہ تھے۔ انہیں پتا تھا یہاں لوگ خوف کی وجہ سے آتے ہی نہیں ہیں۔ ان تینوں کو مڑتا دیکھ کر وہ خود بھی نیچے ہوگیا۔ بھاری قدموں کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ جا رہے ہیں۔

"یعنی انہوں نے اس لڑکی کو یہاں قید کر رکھا ہے۔" شاہ میر نے خود سے کہا۔ جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ دوبارہ وہیں دیکھنے لگا۔ جس طرح اسے فرش پر دھکا دیا گیا تھا وہ ابھی تک اسی حالت میں پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔ شاہ میر ان لوگوں کے یہاں سے دور چلے جانے کا منتظر بیٹھا تھا۔ جب جیپ کو گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تو وہ کپڑے جھاڑتا پورا کا پورا کھڑا ہوگیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر ماہین بھی اٹھ گئی۔

"تم سے تو میں گھر جا کر بات کروں گا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی جو بچ گئے ورنہ تم نے تو آج مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" عام حالات میں وہ اس کے اس طرح بات کرنے پر دماغ ٹھکانے لگا دیتی مگر اس وقت اسے زیادہ فکر اس لڑکی کی تھی اس لیے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اندر جھانکا۔ وہ کھنڈر صرف اور صرف اسی ایک کمرے پر مشتمل تھا اور اس کمرے میں واحد یہی کھڑکی تھی۔ کبھی شاید یہاں کوئی شاندار سے کھڑکی رہی ہوگی اب تو صرف دو فٹ چوڑی opening موجود تھی جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کا ایک ہی دروازہ یہیں سے نظر آ رہا تھا۔ شاہ میر کو مکان کی اگلی طرف جاتے دیکھ کر وہ بھی اسی طرف آ گئی۔ دروازے پر بڑا موٹا سا تالا ان لوگوں کو منہ چڑا رہا تھا۔ شاہ میر نے تالے کو ہاتھ لگا کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ ماہین خاموشی سے اس کی کارروائیاں ملاحظہ کر رہی تھی۔ دروازے کو زور سے دھکا دیا تو لوہے کا دروازہ ٹس سے مس بھی نہ ہوا۔ شاہ میر کچھ دیر تو کھڑا غور و فکر کرتا رہا پھر دوبارہ واپس کھڑکی کی طرف آ گیا۔ ماہین دم چھلا بنی پھر پیچھے پیچھے آ گئی۔ کھڑکی سے اندر دیکھا تو وہ ابھی تک ویسے ہی پڑی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے کچھ دیر پہلے والی آوازوں تک پر غور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ شاہ میر نے دروازے کو

بہت زور سے ٹکر ماری تھی مگر اسے پتا ہی نہیں چلا تھا وہ زور و شور سے رو رہی تھی۔

"پتا نہیں اسے اردو آتی ہوگی یا نہیں۔" شاہ میر سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اسے متوجہ کیسے کرے شاید وہ اس کی بات ہی نہ سمجھے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

"سنو۔" شاہ میر نے با آواز بلند اسے پکارا تھا۔ شاہ میر کے تیسری دفعہ آواز دینے پر اس نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا تھا۔ سامنے کھڑے ایک لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر وہ بری طرح ڈر گئی تھی۔ جس قسم کے حالات سے وہ گزر رہی تھی اسے ڈرنا بھی چاہیے تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے خوف کے سائے دیکھ کر ماہین فوراً بولی۔

"ڈرو مت، ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" پھر خود ہی خیال آنے پر وہ دوبارہ بولی۔

"تمہیں اردو آتی ہے۔" اور جواب میں اس نے خوفزدہ انداز میں گردن ہلا دی۔ اس کے اقرار پر ان دونوں ہی نے سکھ کا سانس لیا تھا ورنہ اس سے بات چیت کیونکر ہو پاتی۔

"دیکھو ڈرو مت، ہمیں اپنا دوست سمجھو اور بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم نے ان آدمیوں کو جاتے یہاں سے دیکھا ہے۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں تمہارے کام آنا چاہتے ہیں۔" ماہین کے کہنے کی دیر تھی وہ دیوانہ وار بھاگتی کھڑکی کے پاس آ گئی تھی۔

"مجھے بچا لو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ صاف اردو تو نہیں بول رہی تھی مگر ان کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ ماہین نے اسے بغور دیکھا۔ وہ بلا کی حسین لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان اس بات کی گواہی تھے کہ اس پر بہت تشدد ہوا ہے۔ اس کے کان کے پاس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

"میر جلدی کچھ کرو یہ بہت زخمی ہے۔" ماہین کا دل اس کی حالت دیکھ کر کانپ اٹھا تھا۔

"کیا کروں دروازہ اور تالا دونوں ہی خاصے مضبوط ہیں۔" وہ سوچتا ہوا بولا۔ شاہ میر کو دوبارہ دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"فکر مت کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ آنکھوں میں حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ دو تین منٹ بعد شاہ میر واپس آتا نظر آیا۔

"میں نے اپنے طور پر کوشش کی ہے مگر کچھ ہو نہیں سکا۔ میں رحمت کاکا کی بیٹی کے گھر جا رہا ہوں۔ ان کا داماد لوہار ہے اس سے تالا توڑنے کے لیے کوئی اوزار لے کر آتا ہوں۔ چلو تم بھی ساتھ ہی چلو۔" وہ ماہین سے مخاطب تھا۔ شاہ میر کے کہنے پر ماہین تسلی دینے والے انداز میں اس لڑکی سے بولی۔

"ڈرنا مت ہم لوگ ابھی آ رہے ہیں۔"

"نہیں مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ دونوں اس سے جھوٹ بول کر اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس کی خوفزدہ حالت دیکھ کر ماہین بولی۔

"میر تم جاؤ۔ میں یہاں اس کے پاس ہی ہوں۔"

"اور اگر پیچھے سے وہ لوگ دوبارہ آ گئے۔" شاہ میر نے اعتراض کیا۔

"نہیں وہ اب شام میں آئیں گے۔ وہ مجھ سے کہہ کر گئے ہیں۔ وہ ابھی نہیں آئیں گے۔" وہ

ہر قیمت پر اسے روک لینا چاہتی تھی۔ لڑکی کی حالت کے پیش نظر شاہ میر کو یہ بات ماننی ہی پڑی حالانکہ اسے اس طرح ماہین کو چھوڑ کر جانے پر خاصا اعتراض تھا مگر یہاں ایک انسانی زندگی کو بچانے کا سوال تھا اس لیے خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ شاہ میر انتہائی تیز رفتاری سے جائے اور آئے تب بھی سے بیس پچیس منٹ ضرور لگیں گے یہ بات ماہین کو اچھی طرح معلوم تھی۔ اس نے سوچا کہ بہتر ہے اس دوران اس لڑکی سے اس کے بارے میں تمام تر تفصیلات معلوم کر لے۔ اس کے استفسار پر اس لڑکی نے روتے بلکتے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس کا نام میمونہ تھا۔ وہ پنجگور سے آگے ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ان کے ہاں جرگہ سسٹم چلا کرتا تھا اور جرگے کا فیصلہ ہی حرف آخر تصور کیا جاتا تھا۔ اس علاقے میں عورتوں کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ ایسے حالات میں اس کے بابا نے اسے میٹرک تک تعلیم دلوائی تھی۔ وہ خود بھی تھوڑا بہت پڑھے لکھے تھے اور تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ علاقے کے لوگوں کو اپنے سردار کی بیٹی کے اس طرح تعلیم حاصل کرنے پر خاصا اعتراض ہوا تھا مگر اس کے بابا نے لوگوں کے اعتراض کی چنداں فکر نہیں کی تھی۔

میمونہ کی ماں کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بابا نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی دوسری شادی کرنے کی کی تھی۔ زبیدہ ایک نہایت ہی چالاک اور مکار عورت تھی۔ مڈل تک تو اس نے پرائیویٹ تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر اسکول کے آخری دو سال وہ صحیح طرح پڑھ سکے یہی وجہ کر اس کے بابا نے اسے کوئٹہ کے ایک اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ یہ دو سال اس نے ہوسٹل میں گزارے تھے۔ اس دوران وہ اپنے گاؤں نہیں گئی تھی زیادہ تر بابا خود ہی ملنے آجاتے تھے۔ بابا کی مسلسل گرتی ہوئی صحت دیکھ کر وہ سخت پریشان رہنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ امتحانوں کے فوراً بعد واپس آ گئی۔ واپس آئی تو اسے گھر میں کئی تبدیلیاں محسوس ہوئیں۔ گھر پر زبیدہ اور اس کے دونوں موٹے بھائیوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور بابا اپنی خراب ہوتی صحت کی وجہ سے زیادہ وقت بستر پر رہنے لگے تھے۔ وہاں کوئی باقاعدہ کوالیفائڈ ڈاکٹر تو تھے نہیں۔ حکیم ہی سے بابا کا علاج ہو رہا تھا۔ پھر ایک رات جب اس نے زبیدہ کو بابا کے لیے دودھ کے گلاس میں کچھ ملاتے دیکھا تو کانپ کر رہ گئی۔ وہ بری طرح ڈر گئی تھی۔ جب اس نے بھاگ کر جا کر یہی بات بابا کو بتائی تو وہ چپ ہو گئے تھے۔

بابا کے لیے یہ انکشاف یقیناً انتہائی دکھ کا باعث تھا مگر اب کچھ بھی کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنی سادگی کے ہاتھوں ایک عورت سے شکست کھا گئے تھے۔ ان کی صحت کا یہ حال تھا کہ وہ بستر سے بغیر کسی سہارے کے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ زیادہ دیر کسی سے بات کرتے تو سانس پھولنے لگتی تھی۔ میمونہ پر وہ رات بڑی بھاری گزری تھی۔ وہ کم عمر اور ناسمجھ لڑکی کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر اس رات کی صبح اس سے بھی بھیانک تھی۔ بابا جو شاید ابھی کچھ دن اور جی لیتے اپنے اعتماد اور اعتبار کی دھجیاں بکھرتی دیکھ کر خود بکھر کر رہ گئے۔ جس عورت کو انہوں نے اپنے گھر میں عزت دی اسے سیاہ سفید کا مالک بنایا اس پر ہر طرح اعتماد کیا وہ یوں ان کے اعتماد کا خون کرے گی یہ بات شاید ان کی برداشت سے بہت زیادہ تھی وہ یہ صدمہ سہہ نہیں پائے اور اس دنیا ہی سے منہ موڑ گئے۔

میمونہ کے لیے دنیا ہی اندھیری ہو گئی تھی۔ بابا کی ناگہانی موت اور آئندہ کا خوف جو اس کے بابا کو ختم کر سکتے تھے ان کے لیے اسے جان سے مارنا تو بہت ہی معمولی سا کام تھا۔ وہ خوف و دہشت میں گھری سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ڈر کے مارے اس نے یہ تمام باتیں کسی کو بتائی تک نہیں تھیں۔ بابا کی موت وہاں تمام لوگوں کے لیے دکھ کا باعث تو تھی مگر کسی کو بھی کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کی طویل بیماری سے سب ہی لوگ آگاہ تھے۔ بظاہر زبیدہ، شہباز اور دلاور کا رویہ اس کے ساتھ بڑا اچھا تھا۔ وہ شاید اسے لاعلم سمجھتے تھے۔ زبیدہ کو بابا کے لیے آنسو بہاتے اور بین کرتے دیکھ کر وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھے سوچ رہی تھی کہ دنیا میں کتنی مکاری ہے۔ پھر جب اس نے زبیدہ اور اس کے بھائیوں کی گفتگو سنی تو اسے ان کے آئندہ کے ارادوں کی خبر ہوئی۔

وہ بابا کی موت کا تیسرا روز تھا۔ بابا کی یاد بہت شدت سے آئی تو وہ اٹھ کر ان کے کمرے میں آ گئی۔ برابر والے کمرے سے باتوں کی آواز آئی تو وہ اس طرف متوجہ ہو گئی۔ ان کی باتیں سن کر وہ دھک سے رہ گئی۔ وہ لوگ زبیدہ کے چھوٹے بھائی دلاور کے ساتھ اس کی شادی کا پروگرام طے کر رہے تھے۔ بابا نے دوسری شادی اپنے قبیلے سے باہر کی تھی اور ان کے ہاں دستور کے مطابق خاندان سے باہر مرد شادی تو کر سکتے تھے مگر دولت جائیداد میں اس عورت اور اس کے ہونے والے بچوں کا کوئی حق نہ تھا۔ جائیداد میں حصہ صرف خاندانی بیوی اور اس کے بچوں ہی کو دیا جا سکتا تھا۔ زبیدہ کے اولاد تھی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو اسے اور اس کے بچوں کو دولت میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ یوں اب تمام زمینیں اور دولت میمونہ کی ملکیت تھی۔ بابا کا کوئی سگا بھائی بہن بھی نہیں تھا اس لیے دولت کی تقسیم کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کے لیے میمونہ کی موت نہیں بلکہ اس کے زندگی کی اہمیت تھی۔ بابا کے ہوتے ان کا یہ خواب بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا وہ میمونہ کی شادی یقیناً اپنے قبیلے ہی کے کسی فرد سے کرواتے اور تمام دولت ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

دلاور کو دولت کی چاہ کے ساتھ ساتھ میمونہ ویسے بھی پسند تھی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ یہ تمام باتیں سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اپنے باپ کے قاتلوں سے رشتہ استوار کرنے کا تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دلاور کی نظریں تو اسے ہمیشہ ہی سے چبھتی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائے اور کس سے مدد مانگے۔ صبح ہونے پر اس نے اپنے گھر کے سب سے پرانے ملازم کو تمام باتیں بتائیں اور اس سے مدد چاہی تو اس نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ مدد کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

وہ تمام باتیں اپنے قابل اعتماد ملازم کو بتا کر پرسکون ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ دلاور اور زبیدہ دندناتے ہوئے اس کے کمرے میں گھس آئے۔ پیچھے پیچھے اپنے ملازم کو آتا دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی۔ وہ بھی بابا کی طرح دھوکا کھا گئی تھی۔ ان دونوں نے اسے ڈرایا دھمکایا اور کمرا باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ وہ اپنے ہی گھر میں قید کر دی گئی تھی، اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ رات میں اپنے لیے کھانا لانے والی ملازمہ سے اس نے رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر مدد مانگی پہلے تو وہ بے چاری ڈر کے مارے انکار کرتی رہی پھر آخر میں اس نے یہ کیا کہ جاتے وقت کمرا کھلا چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ وہ لوگ اسے جان سے نہیں ماریں گے، اس کی زندگی ان کے لیے بہت قیمتی تھی بصورت دیگر ان کے ہاتھ کچھ

نہیں آتا تھا اسی لیے وہ اسی وقت وہاں سے نکل کھڑی ہوئی۔

اس کی قسمت نے یہاں تک اس کا ساتھ دیا تھا کہ وہ گھر سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ بسوں کے اڈے پر پہنچ کر وہ بغیر سوچے سمجھے ایک بس میں سوار ہوگئی تھی۔ مگر دلاور اور اس کے ساتھی تعاقب کرتے وہاں تک پہنچ گئے اور اسے پکڑ لیا تھا۔ پھر وہاں سے گھر واپس لے جانے کے بجائے وہ لوگ اسے یہاں لے آئے تھے اور مار پیٹ اور تشدد کے ذریعے اسے منہ بند رکھنے اور شادی کی ہامی بھرنے کے لیے مجبور کرنے لگے تھے۔ اس کے مسلسل انکار پر دلاور اور بھی طیش میں آگیا اور اسے وہیں بند کر کے واپس چلا گیا آج اسے یہاں بھوکے پیاسے بند پڑے دوسرا دن تھا۔ خوف و دہشت سے اس کی حالت خراب تھی۔ ابھی بھی وہ مار پیٹ کر شام تک کا وقت دے کر گیا تھا۔ زبیدہ پہلے ہی وہاں یہ بات مشہور کر چکی تھی کہ میمونہ کے بابا نے اپنی زندگی ہی میں اس کا رشتہ دلاور کے ساتھ طے کر دیا تھا۔

اس نوعمر اور حسین لڑکی کی یہ المناک داستان ماہین کی آنکھیں بھی بھگو گئی تھی۔ دنیا میں کتنا ظلم ہے انسان کتنا ظالم ہے۔ وہ کتنی آسانی سے خدا کو بھول جاتا ہے اسے موت کا بھی خوف نہیں رہتا۔ ماہین کو اسے تسلی دینا دنیا کا سب سے مشکل کام محسوس ہوا وہ اسے کیا کہے کہ اس کے غم کا مداوا ہو سکے۔

شاہ میر کی واپسی جلد ہی ہوگئی تھی اور واپس آتے ہی وہ تالے کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا اگلے پانچ منٹ بعد وہ تینوں وہاں سے روانہ ہوگئے تھے۔ میمونہ کی حالت کے پیش نظر شاہ میر گھر سے گاڑی لے کر آیا تھا۔ وہ ماہین کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ڈری سہمی بیٹھی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ابھی بھی اس بات کا یقین نہیں آرہا کہ وہ ان ظالموں کے چنگل سے نکل آئی ہے۔ گھر پہنچے تو نانا ابا اور نانی امی ناشتے کی میز پر بے چینی سے ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ نانی امی ان دونوں کی لاپروائی پر ایک طویل لیکچر شروع کرنے ہی والی تھیں کہ ان کے ساتھ ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر چپ ہوگئیں۔ نانا ابا بھی میمونہ کو تعجب سے دیکھنے کے بعد اب ان لوگوں کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''نانا ابا یہ میمونہ ہے۔'' شاہ میر نے سنجیدگی سے تعارف کروایا اور پھر ماہین سے بولا۔

''جلدی سے فرسٹ ایڈ بکس لاؤ۔'' ماہین اس کے حکم کی تعمیل میں فوراً دوڑی تھی۔ نانا ابا اور نانی امی شاہ میر کا اشارہ سمجھتے ہوئے مزید کچھ پوچھے بغیر خاموش بیٹھے تھے۔ پھر نانی امی کے مشورے پر ماہین اسے اندر بیڈ روم میں لے گئی اور نانی امی کے ساتھ مل کر اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ اس پر اتنی بری طرح تشدد کیا گیا تھا کہ نانی امی بھی کانپ اٹھیں۔ وہ ڈری سہمی کانپتی تمام کام ہوتے دیکھ رہی تھیں پھر اسے دودھ پلا کر اور سونے کا کہہ کر نانی امی اور وہ کمرے سے باہر جانے لگے تو وہ ماہین کا ہاتھ تھام کر عاجزی سے بولی۔

''مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ مجھے ڈر لگے گا۔'' پھر جب تک وہ سو نہیں گئی ماہین اس کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ اس دوران شاہ میر نانا ابا اور نانی امی کو کافی کچھ بتا چکا تھا۔ بقیہ باتیں ماہین نے جا کر ان لوگوں کو بتائیں۔

''اس کا مطلب ہے صبح تم مجھ سے جھوٹ بول کر گئے تھے۔'' نانی امی نے شاہ میر کو سخت تیوروں سے گھورا تو وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اقرار میں گردن ہلا گیا۔

''خود گئے تو اسے بھی ساتھ لے گئے۔ جانتے ہو لڑکی کی ذات ہے۔ خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو ہم اس کے ماں باپ کو کیا جواب دیتے۔ میر مجھے تم سے اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔'' وہ سخت برہم نظر آرہی تھیں۔

''نانی امی میں اسے لے کر نہیں گیا تھا بلکہ یہ خود میرے پیچھے پیچھے وہاں آگئی تھی۔ پوچھیں اس سے اب کیسی معصوم شکل بنائے بیٹھی ہے۔'' شاہ میر نے بڑی خار بھری نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

''جانتے ہو ایسے لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات تمہارے علم میں آ بھی گئی تھی تو دیکھ کر چپ چاپ واپس آ سکتے تھے۔ اپنے نانا ابا کو بتاتے۔ ہم پولیس کے ذریعے بھی یہ مسئلہ حل کروا سکتے تھے۔ خود پہنچنے اور خطرے میں کودنے کی آخر ضرورت کیا تھی۔'' نانی امی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''اوفوہ اب کیا تم لٹھ لے کر بچوں کے پیچھے پڑ گئی ہو جو ہوا سو ہوا۔ اب بیٹھ کر یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور یوں نہیں ہونا چاہیے تھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس بچی کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے۔'' نانا ابا نے انہیں ٹوکا تو ان کا موڈ مزید خراب ہوگیا۔

''مجھے پرائی مصیبتیں گلے لگانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ اور آپ کے لاڈلے ہی بیٹھ کر بچی کا مسئلہ حل کریں اور تمہاری تو ماں کو فون پر میں آج کہہ رہی ہوں کہ بلاؤ اپنی بیٹی کو واپس ہم سے نہیں سنبھالی جا رہی۔ چلو وہ تو لڑکا ہے۔ کہیں بھی جائے اور کچھ بھی کرے۔ مگر اسے لڑکی ہو کر ذرا بھی کسی بات کا احساس نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھیں۔

''نانا ابا اب کیا ہوگا نانی امی ناراض ہوگئی ہیں۔'' ماہین فکرمند ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ وقتی غصہ ہے ابھی اتر جائے گا۔ ویسے بیٹا تمہیں اس طرح جانا نہیں چاہیے تھا۔ تمہاری نانی امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' نانا ابا نے دھیمے انداز میں اسے سمجھایا تھا۔

''سوری نانا ابا۔'' وہ پشیمان نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاہ میر اس تمام گفتگو کے دوران خاموش رہا تھا۔

''کیا سوچا ہے تم نے آگے کیا کرنا ہے۔'' نانا ابا نے شاہ میر کو مخاطب کیا تو وہ فوراً ہی دو ٹوک انداز میں گویا ہوا۔

''نانی امی بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔ اکیلی اور کمزور لڑکی کو دیکھ کر تو ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔ ایسے کوئی سورما نہیں وہ لوگ۔ دو چار روز حوالات میں ہی گزاریں گے تو طبیعت صاف ہو جائے گی۔ پھر ان کے خلاف تو قتل کا کیس بھی بنے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کے ناتے ہمیں ضرور اس لڑکی کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ دنیا میں اکیلی ہے اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اسے پرائی مصیبت کہہ کر جان چھڑا لینا یقیناً کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔''

''نانا ابا، میر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔'' ماہین بے ساختہ بولی تھی۔

''ٹھیک ہے مجھے تم لوگوں کی بات سے اتفاق ہے لاؤ میں ذرا فون پر ایس ایس پی لغاری سے بات کروں۔'' نانا ابا کی بات پر وہ دونوں ہی خوش ہوگئے تھے۔

''جب تک میں فون پر بات کر رہا ہوں تم جا کر اپنی نانی امی کو تو مناؤ۔'' نانا ابا کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی تھی۔ آدھے گھنٹے کی منت سماجت کے بعد نانی امی کا موڈ بحال ہوا تھا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب جب تک وہ یہاں ہے اکیلی کہیں باہر نہیں جائے گی۔

شام کے وقت میمونہ سو کر اٹھی تھی۔ ماہین اسے دیکھنے آئی تو وہ بستر پر لیٹی خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ماہین نے آگے بڑھ کر لائٹس آن کیں۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔'' ماہین کے استفسار پر اس نے گردن ہلا دی تھی۔

''ایسا کرو تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے کپڑے لاتی ہوں۔'' ماہین اسے اشارے سے باتھ روم دکھاتی باہر نکل گئی تو وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ اپنا بوتل گرین کاٹن کا سوٹ لا کر ماہین نے اسے دیا صرف کپڑے تبدیل کر کے اور بال بنا کر ہی وہ کوئی آسمانی حور نظر آنے لگی تھی۔ ماہین اس کا حسن دیکھ کر مبہوت کھڑی تھی۔ اس کی ہیزل گرین آنکھیں سرخ و سفید رنگت، گھٹنوں کو چھوتے دراز بال خدا نے اسے کتنا مکمل بنایا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اس کے حسن کو دو آتشہ کر رہی تھی۔ ماہین اس کا ہاتھ تھامے کمرے سے نکلی تو سامنے سے آتا شاہ میر بھی ایک لمحے کو اسے دیکھ کر بے ساختہ رک گیا تھا۔ صبح کے جگہ جگہ سے پھٹے اور گرد وغبار میں اٹے کپڑوں اور زخمی حالت میں نظر آتی وہ لڑکی اس وقت بالکل ہی مختلف نظر آ رہی تھی۔

''کہاں سے آ رہے ہو۔'' ماہین کا تھانیدارنیوں والا انداز اسے سخت زہر لگا تھا۔

''تم یہ بلاوجہ کی inquiries اور investigations مجھ سے نہ ہی کیا کرو تو بہتر ہے۔''

وہ بے مروتی سے جواب دیتا آگے بڑھ گیا تھا۔ ماہین اس کے جواب پر تپتی میمونہ کو ڈائننگ روم میں لے آئی تھی۔ اسے کرسی پر بٹھا کر وہ خود اس کے لیے کھانا نکالنے کچن میں چلی گئی تھی۔ صبح کے مقابلے میں اس وقت اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ وہ کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ ماہین کی باتوں کے جواب بھی دے رہی تھی۔ نانی امی بھی آ کر وہیں بیٹھ گئیں اور سب کی طرح وہ بھی اس کی خوب صورتی اور معصومیت سے متاثر ہو گئی تھیں۔ نانا ابا کے سمجھانے بجھانے پر وہ ویسے بھی اسے یہاں رکھنے پر آمادہ ہو چکی تھیں۔ مگر اب جب پاس بیٹھ کر اسے بغور دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو ان کا دل پسیج گیا تھا۔

ایس ایس پی لغاری جو نانا ابا کے گہرے دوست بھی تھے کے مشورے پر شاہ میر اور انسپکٹر عمران سول ڈریس میں جا کر اس مکان کا معائنہ کر آئے تھے وہاں سے فنگر پرنٹس اور سگریٹ کے ٹکڑے اور ایسی ہی دو چار چیزیں بھی اٹھوالی گئی تھیں۔ پھر اس جگہ سے دور رہتے ہوئے انہوں نے محتاط انداز میں ان لوگوں کے آنے کا انتظار کیا تھا۔ وہ اپنے کہے کے مطابق شام کے وقت آئے تھے اور اسے وہاں موجود نہ پا کر بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ آس پاس سادہ لباس میں پولیس والے موجود تھے۔ انسپکٹر عمران کے اشارے پر سب نے چاروں طرف سے مکان کو گھیر لیا تھا۔ وہ تینوں پولیس فورس کو دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہو گئے تھے۔ بغیر کسی مقابلے کے ان لوگوں نے گرفتاری دے دی تھی۔ شاہ میر کو ان سورماؤں سے امید بھی یہی تھی۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری عمل میں آ چکی تھی اب باقی بچے تھے زبیدہ اور شہباز۔ رات میں انسپکٹر عمران آئے اور نانا ابا سے میمونہ کا بیان قلم بند کرنے کی اجازت طلب کی۔ تو نانا ابا سے پہلے شاہ میر بول پڑا۔

''آپ اس کا بیان یہیں لے لیں۔ وہ سخت خوفزدہ ہے۔ تھانے کے ماحول میں اور ڈر جائے گی۔ ابھی اس کا ان لوگوں سے آمنا سامنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس سے اس کی حالت بگڑنے کا خدشہ ہے۔''

''میرا خیال ہے یہی بات مناسب ہے۔ قانونی کارروائی اپنی جگہ۔ مگر ہمیں اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' نانا ابا کی بات پر انسپکٹر عمران کندھے اچکا کر بولے۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر بعد میں عدالت وغیرہ میں تو انہیں لازمی جانا پڑے گا۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال آپ ابھی اس کا بیان لے لیں۔'' شاہ میر نے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ انہیں بلوائیں۔'' انسپکٹر عمران نے شاہ میر کی بات کا جواب دیا تھا۔ رحمت کاکا نے ماہین کے کمرے میں آ کر میمونہ کو نیچے چلنے کو کہا تو وہ اکیلی جانے کے لیے راضی ہی نہ ہوئی۔ مجبوراً ماہین بھی اس کے ساتھ لاؤنج میں آ گئی۔ وہ سہمی سہمی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

''گھبراؤ مت بیٹا۔ انسپکٹر صاحب تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ بس ان کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دے دو۔ ہم تمہاری سوتیلی ماں اور اس کے بھائیوں کو سزا دلوائیں گے۔ انشاء اللہ۔'' نانا ابا نے اسے حوصلہ دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ پھر وہ انسپکٹر عمران کے سوالات کے جواب دینے بیٹھ گئی۔ درمیان میں وہ کئی دفعہ روئی۔ ہر بار اپنے بابا کے ذکر پر اس کی آواز بھرا جاتی تھی۔ اس کا بیان ریکارڈ کرنے کے بعد انسپکٹر عمران کی روانگی ہوئی تھی۔ جاتے وقت انسپکٹر عمران شاہ میر کو بتا کر گئے تھے کہ مزید تفتیش کی غرض سے وہ کل ہی میمونہ کے گاؤں روانہ ہو رہے ہیں۔ قتل ثابت کرنے کے لیے میمونہ کے بابا کا پوسٹ مارٹم بھی ہونا تھا اس کے علاوہ آس پاس کے لوگوں اور گھریلو ملازمین کے بیانات بھی لینے تھے۔

''قتل ثابت ہو نہ ہو۔ فی الحال تو ان لوگوں کے خلاف میمونہ کو حبس بے جا میں رکھنے اور اس پر شادی کے لیے ناجائز دباؤ ڈالنے اور تشدد کرنے کا کیس تو ہے ہی۔ لہٰذا زبیدہ اور شہباز کی بھی فوراً گرفتاری عمل میں لائی جا سکتی ہے۔'' شاہ میر انہیں رخصت کر کے اندر آیا تو سب لوگ لاؤنج ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''نانا ابا آپ کے اثر ورسوخ کام میں آ گئے۔ ورنہ یہ تمام کام اتنا آسان نہیں تھا۔ عام آدمی بے چارہ تو صرف ایف آئی آر درج کروانے کے لیے بیسوں چکر لگاتا ہے۔ تب بھی اکثر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔'' شاہ میر بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔ ''نانا ابا ایسے لوگوں کو تو سرعام پھانسی دی جانی چاہیے۔ کتنا ظلم کیا ہے انہوں نے ایک کمزور لڑکی پر۔''

ماہین پرجوش انداز میں بولی تو وہ اس کے انداز پر ہنس پڑے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر جوش میں آ جانا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھ جانا اس کی بچپن کی عادت تھی اور وہ اس سے بخوبی آگاہ تھے۔

پورا دن وہ میمونہ کے ساتھ لگی رہی تھی۔ اس کی مسلسل کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ کافی حد تک

نارمل ہو گئی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ صحیح لوگوں کے پاس ہے۔ یہ لوگ اسے دھوکا نہیں دیں گے اس کے ہمدرد ہیں۔ اسی وجہ سے اس کے خوفزدہ انداز میں بھی کمی آ گئی تھی۔ اس کے زخم بھی بتدریج بہتر ہو رہے تھے۔ نانی امی اور بوا جی کے گھریلو ٹوٹکوں کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔

شاہ میر تو صبح نانا ابا کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ اسے نانا ابا کے ساتھ ان کے کاروباری امور حل کروانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ ان کے تجربوں سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ نانا ابا تو دوپہر کے کھانے کے لیے گھر واپس آ گئے تھے مگر شاہ میر نہیں آیا تھا۔ نانی امی انہیں اکیلا دیکھ کر حیران ہوئیں تو وہ بولے۔

''وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا ہے۔ لنچ انہیں کے ساتھ کرے گا۔''

''اب تم سب کی نظر بچا کر باہر نکلنے کی مت کرنا۔ ایک تو جو کام میر کرے وہ اسے ضرور کرنا ہوتا ہے۔'' نانی امی نے اسے مخاطب کیا تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''کہیں نہیں جا رہی میں، میں اور میمونہ بیٹھ کر کوئی اچھی سی موی دیکھیں گے، ڈرائی فروٹس کھائیں گے اور کافی پئیں گے۔ کیوں میمونہ کیسا پروگرام ہے۔'' جواب میں اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''تم واقعی اتنا کم بولتی ہو یا یہاں پر کم بول رہی ہو۔'' میمونہ کے جواب دینے سے پہلے نانی امی بول پڑی تھیں۔

''تمہارے آگے تو ہر کوئی کم بولتا محسوس ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو کم ہی بولنا چاہیے۔''

''بس اب صرف اسی ایک بات کی کسر رہ گئی ہے کہ لڑکیوں کو سانس بھی نہیں لینی چاہیے۔ لڑکی ہونا کیا اتنا بڑا جرم ہے۔ لڑکیوں کو ایسے چلنا چاہیے، ایسے بیٹھنا چاہیے، ایسے کھانا چاہیے ایسے بولنا چاہیے۔ سارے زمانے کے تمام اصول اور ضابطے صرف لڑکیوں ہی پر کیوں لاگو ہوتے ہیں؟'' ماہین جل کر بولی تھی۔ نانا ابا اور میمونہ اس کی بات پر مسکرا دیے تھے۔ جبکہ نانی امی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''بڑا ظلم ہوتا ہے تم پر، روک ٹوک اور ظلم ہونے پر تو یہ حال ہے کہ مردانہ انداز میں جہاں دیکھو چل دیں گی۔ اگر بالکل ہی چھوٹ دے دی جائے تو خدا معلوم کیا گل کھلاؤ گی۔'' نانا ابا نے سیز فائر کے طور پر فوراً ہی نانی امی کے ہاتھوں کی پکی نہاری کی تعریف شروع کر دی تھی۔ اور ماہین اپنی متوقع شامت سے بچ گئی تھی۔

شاہ میر کی واپسی مغرب سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔ ماہین، میمونہ کو ساتھ لیے لان میں بیٹھی تھی۔ ان دونوں کو یہاں بیٹھا دیکھ کر شاہ میر اسی طرف آ گیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' شاہ میر نے دوستانہ انداز میں بے تکلفی سے میمونہ کی خیریت دریافت کی تھی۔

''ٹھیک ہوں'' وہ آہستگی سے جواب دے کر چپ ہو گئی تھی۔ گھر کے باقی افراد کے مقابلے میں اسے شاہ میر سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ اس کے ماحول کا اثر تھا جہاں عورتوں کو غیر مردوں سے سخت پردہ کروایا جاتا ہے۔ شاہ میر ماہین کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر

بھی وہیں بیٹھ گیا۔

''جلدی سے بالکل ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم لوگ تمہیں نانا ابا کے باغات کی سیر کرانے لے جائیں وہاں جا کر تمہیں بہت مزہ آئے گا'' شاہ میر پرخلوص انداز میں بولا تھا۔ ماہین اس کے اس طرح یہاں بیٹھنے اور میمونہ سے باتیں کرنے پر سخت متعجب تھی۔ قریبی کزنز کے علاوہ اسے دیگر لڑکیوں سے گھلتے ملتے یا باتیں کرتے ماہین نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ماہین اور اس کی ایک دو کزنز کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر لڑکیوں میں اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے خود کو لیے دیے اور روڈ پوز کرتا ہے۔ لڑکیاں ایسے لڑکوں کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں شاید اس لیے۔

نانی امی نے ماہین کو آواز دی تو وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ انہوں نے اسے نانا ابا کے لیے چائے بنانے کے لیے بلایا تھا۔ نانا ابا کو چائے دے کر وہ واپس لان میں آئی تو اس کا خیال تھا کہ میمونہ وہاں اکیلی بیٹھی ہوگی شاہ میر یقیناً اٹھ کر جا چکا ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شاہ میر نہ صرف یہ کہ وہاں بیٹھا تھا بلکہ میمونہ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ دونوں باتوں میں مگن تھے میمونہ مسکرا کر شاہ میر کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی۔ ماہین کا پنک کلف لگا سوٹ پہنے وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ تازہ تازہ غسل کی تازگی نے اس کی خوبصورتی کو نکھار دیا تھا۔ ہوا سے اڑتے اس کے خوبصورت لمبے بال جنہیں وہ بار بار پیچھے کر کے سر پر دوپٹہ ڈال رہی تھی۔

ماہین کو پتا نہیں ایک دم کیا ہوا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ میمونہ کو وہاں سے کہیں غائب کر دے۔ جب وہ لڑکی ہو کر اس کے حسن سے اتنی بری طرح متاثر ہے تو شاہ میر ...؟ اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہیں جا سکا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ان لوگوں کے پاس آ گئی۔

''آؤ میمونہ تمہیں نانی امی بلا رہی ہیں۔'' اس نے میمونہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ شاہ میر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اندر آ کر وہ میمونہ کو نانی امی کے پاس لے آئی اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر دل کی بے چینی اپنی جگہ برقرار تھی۔ وہ اپنی کیفیت خود ہی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اسے شاہ میر کی تین چار ماہ پہلے خاندان کی شادی کی تقریب میں کہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

عماد اور حنا کی مہندی کی تقریب میں جب وہ تمام کزنز اکٹھے ہوئے تھے اور باتوں باتوں میں شاہ میر کو اس کی کسی کلاس فیلو کے حوالے سے چھیڑ رہے تھے تو وہ سب کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بولا تھا۔

''وہ صرف کلاس فیلو ہے اور بس۔ میری آئیڈیل لڑکی کو تم لوگ دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''اچھا ہم بھی تو سنیں وہ کیسی ہوگی۔'' عماد شرارتی انداز میں بولا تھا۔

''اس کی آنکھیں ہیزل گرین ہوں گی، گھٹنوں کو چھوتے لمبے سلکی بال ہوں گے، جب وہ مسکرائے گی تو ایسا لگے گا جیسے ساری کائنات مسکرا رہی ہے۔ جو رنگ پہنے گی ایسا لگے گا کہ بنا ہی اس کے لیے ہے۔ سادہ معصوم، دھیمے سروں میں بولتی۔ اس کے ہر انداز میں نزاکت اور نفاست ہوگی۔ بس وہ ہوگی۔'' شاہ میر خوابناک لہجے میں بولا تھا اور سب کے بے ساختہ قہقہوں اور مختلف جملوں

سے کمرا گونج اٹھا تھا۔ اس وقت اور سب کی طرح ماہین کو بھی شاہ میر کی بات مذاق ہی محسوس ہوئی اور اس نے اسے انجوائے بھی کیا تھا۔ مگر آج وہ جس طرح بیٹھ کر میمونہ سے باتیں کر رہا تھا یہ خاصہ ہرگز نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اتنا مہمان نواز تھا کہ اسے مہمان سمجھ کر ازراہ تکلف اس کے پاس بیٹھا ہو۔ اس کا کل میمونہ کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک جانا بھی اچانک ہی ماہین کو کھلنے لگا تھا۔ میمونہ ہو بہو شاہ میر کے بتائے خیالی پیکر کی عملی تصویر تھی۔

بظاہر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے اور باتیں کرنے کے باوجود وہ اپنی بے کلی اور اطمینانی کم نہیں کر پائی تھی۔ آج وہ شاہ میر کے ہر ہر عمل کو بغور دیکھ رہی تھی تو اسے کئی تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔

''روزانہ تو یہ کافی پی کر اور کچھ دیر باتیں کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے آج ابھی کیوں بیٹھا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ جب سب سونے کے لیے اٹھے تب ہی وہ کھڑا ہوا تھا۔ سونے کے لیے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دل ایک دم اتنا اداس ہو رہا تھا۔ اپنے برابر لیٹی میمونہ کو وہ کتنی ہی دیر تک بغور دیکھتی رہی تھی۔ صبح وہ معمول کے برخلاف جلدی سو کر اٹھ گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر نیچے آئی تو سب لوگ ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

''نانا ابا آج کیا تاریخ ہے؟'' شاہ میر نے ایک شرارتی نگاہ اس پر ڈال کر بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔

''20 تاریخ ہے۔ کیوں تمہیں اچانک تاریخ کا کیوں خیال آیا۔'' نانا ابا نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ماہین اس کا طنز سمجھ چکی تھی اسی لیے بغیر اس کی گفتگو پر کوئی دھیان دیے آملیٹ کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔

''بس ویسے ہی مجھے لگا آج شاید کوئی خاص دن ہے۔'' نانا ابا اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑے تھے۔

''ویری فنی۔'' وہ حسب عادت چڑ گئی تھی اور شاہ میر بیٹھا مسکراتا ہوا اسے مزید چڑا رہا تھا۔

''صحیح تو کہہ رہا ہے وہ اتنی دیر تک سونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ چھٹیاں ہیں تو کیا ہوا اب کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بندہ گیارہ گیارہ بجے تک پڑا سوتا رہے۔ رات کو جلدی سویا کرو تا کہ وقت پر آنکھ کھلے۔ فجر میں بھی روزانہ اتنی آوازیں دیتی ہوں مگر تم ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔'' نانی اپنے من پسند موضوع یعنی اس کی عادتیں سدھارنے کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''قبر میں بھی سب سے پہلے نماز ہی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ ہے ناں نانی امی۔'' معصومیت سے دریافت کرتا ماہین کو سخت برا لگا۔ اس کا دل چاہا سامنے پڑی فروٹ باسکٹ اس کے سر پر دے مارے۔

''کیا صبح ہی صبح سب میری بیٹی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' نانا ابا نے خفگی سے شاہ میر کی طرف دیکھا تھا۔ شاہ میر کو ناشتے کے بعد گھر پر ہی موجود دیکھ کر اسے خاصا تعجب ہوا تھا۔ وہ تو کراچی میں گھر پر کم ہی ٹکا کرتا تھا۔ خالہ کو سب سے زیادہ اس سے اسی بات کی شکایت تھی گھر کو ہوٹل سمجھا ہے۔ صرف سونے کے لیے گھر آتا ہے باقی سارا دن پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہے۔''

ہوتیں۔ اس نے شاہ میر سے کچھ پوچھا تو نہیں البتہ حیران ضرور تھی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی جبکہ شاہ میر وہیں صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ سویٹر کے اوپر شال لپیٹے بیٹھی تھی۔ اسے ہیٹر آن ہونے کے باوجود بھی سردی لگ رہی تھی۔ میمونہ، نانی امی کے ساتھ کچن میں تھی اور کچن کیونکہ اس کی ناپسندیدہ جگہوں میں سرفہرست تھا اس لیے وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

''میمونہ کہاں ہے۔'' شاہ میر نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''کچن میں ہی ہے۔'' وہ لاپروائی سے جواب دے کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ شاہ میر ایک نظر اس پر ڈال کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد شاہ میر کی کچن سے آتی چہکتی ہوئی آواز سن کر اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تو وہ خود کو لاتعلق ظاہر کر کے یونہی لیٹی رہی۔ مگر یہ لاتعلقی صرف پانچ منٹ ہی برقرار رہ پائی تھی۔ اٹھ کر کچن کی طرف آئی تو شاہ میر کچن میں موجود ٹیبل پر نانی امی کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نانی امی سبزی کاٹ رہی تھیں اور وہ ان میں سے گاجریں اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ میمونہ چولہے کے آگے کھڑی کچھ پکا رہی تھی۔

''نانی امی آپ مہمان سے کام کروا رہی ہیں۔'' ماہین ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

''میں نے تو منع کیا تھا۔ مگر یہ کہنے لگی کہ مجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جا رہا۔'' نانی امی نے جواب دیا تھا۔

''اب ضروری تو نہیں کہ دنیا کا ہر آدمی ہی کام چور اور نکما ہوگا۔ بوا جی میرے لیے میٹھے میں کچھ ضرور پکائیے گا۔'' شاہ میر پہلے نانی امی اور بعد میں بوا جی سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ماہین کو چڑانے کے لیے اس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا اور ماہین خود کون سی کم تھی۔ ہمیشہ اس کی باتوں کا ٹھیک ٹھاک جواب دیا کرتی تھی۔ مگر آج پتا نہیں کیا ہو رہا تھا اس سے شاہ میر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے شاہ میر اسے چڑانے کے لیے نہیں بلکہ اس کی انسلٹ کرنے کے لیے اس قسم کی تذلیل کر رہا ہے۔ اچانک ہی اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ اسے چپ چاپ اٹھ کر جاتا دیکھ کر نانی امی نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بری بات ہے میر! تم ہر وقت اسے تنگ کرتے رہتے ہو۔ دیکھو ذرا وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔'' اوپر اوپر سے وہ لاکھ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھیں مگر تھی تو وہ ان کی بھی بہت لاڈلی۔

''ناراض وراض ہو کر نہیں گئی ہے۔ آپ کو پتا نہیں ہے کیا کہ کچن میں وہ صرف اس وقت جاتی ہے جب اسے بھوک لگتی ہے یا خالہ کی ڈانٹ اسے وہاں پہنچاتی ہے۔ اس سے زیادہ دیر وہ کچن میں ٹھہر ہی نہیں سکتی۔'' شاہ میر نے بے فکری سے جواب دیا تھا۔ نانی امی تھوڑی دیر بعد ہی اسے دیکھنے گئی تھیں اور ان کی اپنے لیے تشویش دیکھ کر اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔

کھانے کی میز پر بیٹھا وہ بڑے ذوق و شوق سے میمونہ کے ہاتھوں کا پکا کڑھائی گوشت کھا رہا

تھا۔

"سچ بتاؤ یہ تم نے ہی پکایا ہے۔" ماہین کو وہ بلاوجہ کی تعریفیں کرنا ایک آنکھ نہیں بھا رہا اس نے کڑھائی گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ نانا ابا بھی میمونہ کے پکائے سالن کی تعریف کر تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی سب کی داد سمیٹ رہی تھی۔ باقی سب سے تو اس کی نارمل بات چیت ہو مگر شاہ میر سے اس کا بات کرنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ پتا نہیں اتنا خوش کس بات مسکراہٹ چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بعد میں کچن میں جا کر اس نے تھوڑا سا چکھ کر دیکھا تھا۔

"اتنا بھی کوئی خاص نہیں پکا۔" اس کے دل نے کہا تھا اور اپنی اس سوچ پر وہ بری طرح ہو گئی تھی۔

بواجی رات کے کھانے کا اہتمام کر رہی تھیں۔ میمونہ اور نانی امی آتش دان کے پاس باتیں کر رہی تھیں۔ شاہ میر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ماہین کو کچن میں آتا دیکھ کر وہ پرشفقت اندا مسکرائی تھیں۔

"کچھ چاہیے بیٹا۔"

"نہیں بس ویسے ہی بوریت ہو رہی تھی۔" وہ خاموشی سے کھڑی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا پکا رہی ہیں۔"

"شاہ میر کے لیے پکا رہی ہوں۔ پتا نہیں تم لوگ اسے کیا کہتے ہو۔ مجھ سے تو نہ یہ چیز جاتی ہیں نہ کھائی جاتی ہیں۔ پتا نہیں تم لوگ یہ کیسے اتنے شوق سے کھاتے ہو۔"

وہ سامنے رکھے پاستا کے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی تھیں۔

"لائیں میں پکاؤں۔" بواجی کی حیران شکل اسے بری طرح شرمندہ کر گئی تھی۔ اسے ا ہوا کہ اور سب کی طرح بواجی بھی اسے کام چور اور پھوہڑ سمجھتی ہیں۔ اس نے بڑے دل سے اور اہتمام کے ساتھ پاستا بنایا تھا۔ کچن سے فارغ ہو کر نکلی تو لاؤنج میں شاہ میر بھی بیٹھا ہوا تھا

"کہاں تھیں ڈیئر کزن۔" وہ اسے کچن سے نکلتا دیکھ چکا ہے۔ ماہین کو اچھی طرح معلوم

"کچن میں تھی۔" وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی تھی۔ اسے معلوم تھا پاستا شاہ میر کی ف پر بنا ہے۔ وہ اٹالین، فرنچ اور چائنیز کھانوں کا دیوانہ تھا۔ اسے پلیٹ میں کڑھائی گوشت ڈالتا نانی امی نے ٹوکا تھا۔

"پاستا لو نا۔ میں نے خاص طور سے تمہاری وجہ سے بنوایا ہے۔"

"نانی امی اس سالن کے آگے کوئی اور چیز کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ منہ میں پانی بولا تھا۔

"ویسے بھی بواجی میری پسند کے کھانوں کی اتنی بری طرح ریڑھ لگاتی ہیں۔"

"تم چکھ کر دیکھو۔ پاستا اچھا بنا ہے۔" نانا ابا نے جواباً کہا تھا۔ مگر وہ انکار میں سر ہلاتا کھانے لگا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ نیچے محفل جمی ہوئی تھی۔ سب مذاق اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سب سے نمایاں آواز شاہ میر کی تھی۔ اچانک اس کا دل

سارو نے کو چاہنے لگا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی تھی۔ اپنی یہ تمام کیفیت خود اس کے لیے بڑی اجنبی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس سے اس کی سب سے قیمتی چیز چھین رہا ہو۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کاش میں اس روز سب سے چھپ کر اکیلی نہ نکلی ہوتی۔" بے اختیار اس نے سوچا۔

"کاش میں نے شاہ میر کو کسی عورت کے چیخنے والی بات نہ بتائی ہوتی۔" اس کے ذہن میں کئی کاش چکرا رہے تھے۔ اپنی اس سوچ پر اسے ندامت بھی ہو رہی تھی۔ وہ بے قصور اور معصوم لڑکی ان ظالموں کے شکنجے سے کیونکر نکل پاتی۔ ایک طرف اسے میمونہ سے ہمدردی ہو رہی تھی اور دوسری طرف وہ اسے سخت بری لگ رہی تھی۔

"باجی آپ اتنی جلدی سونے لیٹ گئیں۔ نیچے سب کے ساتھ اتنا مزہ آ رہا تھا۔ میر بھائی اتنی مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ میرا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔" میمونہ نے اسے تکیے میں منہ دیئے پڑے دیکھ کر کہا تھا۔ ماہین کا اس سے بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"میر بھائی۔" ماہین کو اس کا طرز تخاطب بھی زہر لگا تھا۔ اسے کس نے حق دیا ہے کہ یہ شاہ میر کو میر کہے۔ شاہ میر کو میر کہنا سب سے پہلے ماہین ہی نے شروع کیا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ گھر والے اور نانا ابا، نانی امی وغیرہ بھی اسے میر ہی کہنے لگے تھے وہ اکثر اسے چھیڑنے کے لیے "سرہانے میر کے آہستہ بولو" یا میر کا کوئی اور مصرعہ گنگنایا کرتی تھی۔

اپنی بات کا جواب نہ پا کر وہ سمجھی کہ شاید ماہین سو چکی ہے اس لیے خود بھی خاموشی سے اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سو چکی تھی۔ ماہین نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر چھائی معصومیت اسے اپنی دن بھر کی تمام سوچوں پر بری طرح شرمسار کر گئی۔

"کتنی دکھی اور تنہا ہے یہ لڑکی اس کا دنیا میں کوئی نہیں اور میں۔۔۔ کتنی چھوٹی سوچ ہے میری۔" وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی۔ اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ جو کچھ بھی فیل کر رہی ہے اگر ویسا ہے بھی تو بھی اسے میمونہ کے ساتھ اپنا رویہ اچھا ہی رکھنا ہے۔ مگر خود سے کیے اس عہد سے وہ صبح صبح ہی پھر گئی۔

صبح اس کی آنکھ سات بجے کھلی حسب معمول فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ خود کو لعنت ملامت کرتی وہ قضا پڑھنے کھڑی ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ میمونہ کو دیکھنے کمرے سے باہر نکلی۔ یقیناً اس نے اسے نماز کے لیے اٹھایا ہوگا اور وہ اٹھی نہیں ہوگی۔ ماہین نے سوچا۔ میمونہ نے اسے بتایا تھا کہ ان کے ہاں صبح سویرے اٹھا جایا جاتا ہے اور اسے بھی نماز پڑھ کر دوبارہ نیند نہیں آتی۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان لیا مگر میمونہ نہیں ملی تو وہ پریشان ہو گئی۔

"نانی امی پتا نہیں میمونہ کہاں چلی گئی ہے۔" تخت پر بیٹھی قرآن شریف پڑھتی نانی امی کو اس نے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اطلاع دی تھی۔ جواب میں نانی امی نے بڑے اطمینان کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تمہارے نانا ابا اور میر اسے اپنے ساتھ واک کے لیے لے گئے ہیں۔" نانا ابا نے اسے بھی کئی بار کہا تھا کہ وہ صبح ان لوگوں کے ساتھ واک کے لیے جایا کرے مگر اس سے جلدی اٹھا ہی نہیں

جاتا تھا۔ وہ چپ چاپ نانی امی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''اٹھ ہی گئی ہو تو جا کر بواجی کا تھوڑا ہاتھ بٹا دو۔ بے چاری اکیلی لگی ہیں۔'' نانی امی کے ٹوکنے پر وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی۔ شاہ میر اور میمونہ کو ایک ساتھ لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر اس کے دل کو جیسے کسی نے مسل دیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ کتنے خوش لگ رہے تھے۔

''نانا ابا کو ان کے دوست مل گئے تھے۔ ہم لوگ اسی لیے پہلے آ گئے۔'' وہ نانی امی کو جواب دیتا وہیں بیٹھ گیا تھا۔ بواجی کے ساتھ مل کر اسے ناشتا لگاتے دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔

''لگتا ہے اب کی بار آپ لوگوں کو یہاں سے سگھڑ بنا کر ہی بھیجیں گی۔'' وہ اسے سنانے کے لیے زور سے بولا تھا۔ جواب میں نانی امی بے ساختہ مسکرا دی تھیں جبکہ وہ بدستور سنجیدگی سے کام کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

زبیدہ اور شہباز بھی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی تھی کہ میمونہ کے بابا کو کافی عرصہ سے سلو پوائزننگ کی جا رہی تھی۔

ماہین کے خیال سے میمونہ کا مسئلہ حل ہو چکا تھا اور اب اسے واپس اپنے گاؤں چلے جانا چاہیے تھا۔ اپنی اس سوچ پر اسے ایک پل کے لیے شرمندگی بھی ہوئی تھی مگر وہ نانی امی سے یہ بات کہے بنا رہ بھی نہیں پائی تھی۔ نانی امی نے اس کی بات سن کر بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسے کیسے اکیلی بچی کو وہاں بھیج دیں۔ بے چاری کا وہاں اب ہے ہی کون۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''تو کیا اب یہ مستقل یہیں رہے گی۔ کبھی واپس جائے گی ہی نہیں۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

''سچ بات تو یہ ہے کہ اب مجھے بھی اس بچی سے عجیب سے انسیت ہو گئی ہے۔ ہم دونوں ویسے بھی یہاں اکیلے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد اس کے ہونے سے گھر میں رونق رہے گی۔ دولت بہت بڑی چیز ہے۔ اس کی دولت، کم عمری اور معصومیت سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دیں گے جسے اس کی دولت کا لالچ نہ ہو۔ پھر یہ آرام سے اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گاؤں جائے، اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرے۔ تب تک اس کا یہیں رہنا مناسب ہے۔'' نانی امی نے تفصیلی جواب دیا تھا۔ نانا ابا اپنے کسی کام سے شاہ میر کو کوئٹہ بھیج رہے تھے۔ نکلتے وقت نانی امی نے اسے ایک لمبی چوڑی لسٹ پکڑا کر کہا تھا۔

''یہ کچھ چیزیں وہاں سے منگوانی ہیں یاد سے لے آنا۔ میمونہ کے لیے چار پانچ ریڈی میڈ سوٹ بھی لے لینا۔ سردی کی وجہ سے میں تو بازار جا نہیں پا رہی۔ فی الحال ان کپڑوں سے کام چلا لے گی۔ پھر بعد میں اسے ساتھ لے جا کر اس کی پسند کے کپڑے دلوا لاؤں گی۔'' شاہ میر نے بغیر منہ بنائے بڑے اطمینان سے لسٹ لے لی تھی۔ ماہین بظاہر میمونہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی مگر دھیان سارا اسی کی طرف تھا۔ اسے تو خالہ یا اپنی بہنوں کو شاپنگ پر لے جانا سخت برا لگا کرتا تھا اکثر وہ صاف

انکار کر دیا کرتا تھا۔

''بھئی مجھے یہ خواتین کی شاپنگ سخت زہر لگتی ہے۔ مجھے تو آپ لوگ معاف ہی رکھیں۔'' اور آج وہ کتنے آرام سے بغیر کوئی اعتراض کیے چلا گیا تھا۔

رات تقریباً نو بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ شاہ میر آ گیا ہے۔ ہاتھ میں تین چار شاپرز اٹھائے وہ اندر داخل ہوا تھا۔

''میر بھائی آ گئے۔'' میمونہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تھی۔ ماہین اور وہ دونوں کچن میں مصروف تھیں۔ بواجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے آج سارا کام ان دونوں ہی نے مل کر کیا تھا۔ میمونہ سارا کام چھوڑ چھاڑ کر باہر بھاگی تھی۔ ماہین خاموشی سے کھڑی اس کا بے تابانہ انداز دیکھ رہی تھی۔

''آپ کے بغیر اتنی بوریت ہو رہی تھی۔ میں ماہین باجی سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ میر بھائی نہیں ہیں تو گھر میں کتنا سناٹا ہو رہا ہے۔'' وہ لاؤنج میں میر کے پاس کھڑی تھی۔ خوشی اور سرشاری اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھی۔ شاہ میر اس کے انداز پر ہنس پڑا تھا۔

''چلو اس طرح مجھے اپنی اہمیت پتا چل گئی۔ اچھا یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھتا ہوا بولا تھا۔ میمونہ بھی خوشی خوشی سامنے فلور کشن پر بیٹھ گئی تھی۔ شاہ میر نے شاپر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ ایک ایک کر کے تمام سوٹ بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔

''بھئی یہ سب سوٹ تو نانی امی نے منگوائے ہیں۔ تمہیں پسند آئیں گے یا نہیں یہ مجھے نہیں پتا۔ البتہ یہ سوٹ میری طرف سے تمہارے لیے گفٹ ہے اور یہ تمہیں یقیناً پسند آئے گا۔'' وہ ایک ڈبا کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا اندر بلیک کلر کا بے حد خوب صورت اور دیدہ زیب سوٹ رکھا ماہین کو دور ہی سے نظر آ گیا تھا۔

''بہت اچھا ہے۔ بہت پیارا ہے۔ مجھے یہ رنگ بہت اچھا لگتا ہے۔'' وہ سوٹ نکال کر دیکھنے لگی تھی۔

''میں ماہین باجی کو دکھا کر آتی ہوں۔'' وہ سوٹ ہاتھ میں لیے کچن کی طرف آئی تھی۔ اسے اس طرف آتا دیکھ کر وہ جلدی سے اوون کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''دیکھیں ماہین باجی! میر بھائی میرے لیے کتنا پیارا جوڑا لائے ہیں۔'' وہ دیدہ زیب رنگوں سے کڑھے اس اسٹائلش سوٹ کو اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

''بہت پیارا ہے اور یہ کلر تمہارے اوپر اچھا بھی بہت لگے گا۔'' وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ شاہ میر نے اسے آج تک کبھی تحفے میں کچھ نہ دیا تھا۔ وہ سب کزنز آپس میں عید پر، ایک دوسرے کی سالگرہ یا کسی اور کامیابی پر گفٹس کا تبادلہ کیا کرتے تھے مگر شاہ میر نے اسے کبھی کسی موقع پر کچھ نہ دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان دونوں کی آپس میں کبھی بنی ہی نہیں تھی۔ ماہین نے پھر بھی ایک دو بار اسے گفٹ دیا تھا مگر شاہ میر نے ایسی زحمت کبھی نہ کی تھی۔ یہ بات آج سے پہلے اس نے کبھی محسوس بھی نہیں کی تھی کہ وہ اور سب کو تو کبھی نہ کبھی گفٹ اور کارڈ دے دیا کرتا تھا مگر اسے نہیں۔ آج یہ بات اسے بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد شاہ میر نے نانی امی کو ان کی مطلوبہ تمام اشیاء کے شاپرز پکڑائے تھے۔ نانی امی نے بھی اس کے لائے کپڑوں کی بے حد تعریف کی تھی۔

''میں نے کہہ تو دیا تھا مگر سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں تم کیا اٹھا لاؤ گے۔ مگر سب سوٹ اچھے ہیں۔'' وہ اس کے لائے تحفے کی بھوکی نہیں تھی اس کے پاس ایک سے ایک اور قیمتی لباس موجود تھا مگر جب وہ میمونہ کے لیے بطور گفٹ سوٹ لا سکتا تھا تو کیا ماہین کے لیے نہیں۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ اپنا موازنہ کرنا نہیں چاہتی تھی مگر لاشعوری طور پر کر رہی تھی۔ آنکھوں میں کچھ چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور زبردستی خود کو سمجھاتی وہاں بیٹھی رہی تھی۔ کمرے میں جا کر وہ کتنی دیر تک روئی تھی۔ اس نے شاہ میر کے بارے میں کبھی بھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ بلکہ اس کی تو زیادہ تر شاہ میر کے ساتھ لڑائی ہی رہا کرتی تھی۔ اسے خود نہیں پتا تھا کہ لڑتے لڑتے وہ کب اس کے بارے میں اس طرح سوچنے لگی تھی۔

''کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس بار ضد کر کے یہاں نہ آئی ہوتی۔ جس طرح اب تک اپنی ان فیلنگ سے انجان تھی ویسے ہی رہتی۔ کم سے کم یہ سب تو نہ دیکھتی۔ وہ میرے سامنے کسی اور کو اہمیت دے رہا ہے۔ مجھے اگنور کر رہا ہے۔ اسے میری کوئی پروا نہیں۔'' روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

''کیا بات ہے آج کل بڑی چپ رہنے لگی ہو۔'' وہ اس کے برابر میں بیٹھتا ہوا بولا تھا۔ ماہین نے میگزین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' وہ خود کو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے بولی تھی۔ ''یہ بات اسے کبھی بھی پتہ نہیں چلنی چاہیے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تو یہ میرا کتنا مذاق اڑائے گا۔ کتنا ہنسے گا مجھ پر۔ مجھے اس کے سامنے خود کو مضبوط رکھنا ہے۔'' اس کے اندر سے آواز ابھری تھی۔

''غلط فہمی صرف ایک بندے کو ہو سکتی ہے۔ سارے گھر کو تو نہیں۔ نانا ابا اور نانی امی مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہے اس وجہ سے تمہارا موڈ آف ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور ڈالتا ہوا بولا تھا۔

''بس ویسے ہی شاید گھر یاد آ رہا ہے۔ ممی سے فون پر بھی تین چار دن سے بات نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے۔'' وہ مزید تکرار کیے بغیر اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ اس طرح بن بن کر اس نے کبھی کسی کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ وہ بلا کی منہ پھٹ اور آؤٹ اسپوکن لڑکی تھی۔ جو اس کے دل میں ہوتا وہ کہہ دیتی۔ چاہے سامنے والے کو اچھا لگے یا برا وہ کبھی کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ مگر آج اسے ایسا کرنا پڑ رہا تھا تو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

''میر بھائی۔'' میمونہ شاہ میر کو آواز دیتی لان میں آ گئی تھی۔

''دیکھیں میں نے آپ کے لیے اخروٹ کا حلوہ بنایا ہے۔ کھا کر بتائیں کیسا بنا ہے۔'' وہ پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر خود بھی سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔

''لڑکی تم میری اسمارٹنیس کا ناس مار کر ہی رہو گی۔ یہ حلوے کھا کھا کر میرا کیا حال ہو گا ذرا بتاؤ لگتا ہے اب مجھے شام میں بھی ایک گھنٹہ جوگنگ کرنی پڑا کرے گی۔'' وہ مصنوعی خفگی ظاہر کرتا ہوا بولا

تھا۔ جواب میں میمونہ ہنس پڑی تھی۔ وہ اچانک پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اس جگہ جیسے وہ موجود ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں اس سے لاتعلق آپس میں مصروف تھے۔ اسے اٹھتا دیکھ کر میمونہ تعجب سے بولی۔

''ماہین باجی! کیا ہوا کہاں جا رہی ہیں۔ اچھا ذرا یہ حلوہ کھا کر بتائیں کیسا بنا ہے۔ میر بھائی میری اتنی محنت سے بنائے حلوے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' وہ پلیٹ اس کی طرف کر کے بڑی معصومیت سے بولی تھی۔ ماہین کو اس پل وہ بے انتہا بری لگ رہی تھی۔

''مجھے اخروٹ کا حلوہ پسند نہیں ہے۔'' وہ بے مروتی سے جواب دیتی اندر آ گئی تھی۔ میمونہ کے لیے اس کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔

''کیا ہوا ماہین باجی کو آپ نے کچھ کہا ہے۔'' وہ شاہ میر سے مخاطب ہوئی تھی۔

''مجھے کیا پتا کیا ہوا ہے۔ خود ہی جا کر پوچھ لو۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا تھا۔

''وہ اس طرح کبھی بھی نہیں بولتیں۔ آپ ہی نے کچھ کہا ہو گا۔'' وہ بے اعتباری سے بولی تھی۔

''اچھا تم اب یہ ماہین نامہ بند کرو اور مجھے سکون سے حلوہ کھانے دو۔'' وہ ہنوز مطمئن انداز میں بولا تھا۔

☆☆☆

جرمنی سے نانا ابا کے دوست اور ان کی فیملی پاکستان آئی ہوئی تھی۔ بطور خاص نانا ابا سے ملنے کے لیے وہ لوگ زیارت بھی آئے تو نانا ابا نے ان کے آنے کی خوشی میں ڈنر کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے اپنے خاص دوستوں اور ان کی فیملیز کو بھی مدعو کیا۔ بیس پچیس مہمانوں کی وہ گیٹ ٹو گیدر اچھی خاصی پر رونق اور ہنگامہ پرور تھی۔ اتنے دنوں کے طاری جمود کے بعد وہ بھی پارٹی کی تیاریوں میں لگ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ میمونہ کے ساتھ اس کا انداز معمول کے مطابق تھا۔ شاہ میر سے بھی بات چیت ہو رہی تھی۔ میمونہ نے شاہ میر کا لایا بلیک سوٹ پہنا تھا۔ اس کی تیاری کے آگے ماہین کو اپنا پرپل ویلوٹ کا سوٹ ایک دم بکواس لگنے لگا تھا۔ وہ خود کو سرزنش کرتی بوا جی کے ساتھ دعوت کے انتظامات دیکھنے میں مگن تھی لان میں فنکشن کا سارا ارینجمنٹ کیا گیا تھا۔ شاہ میر لان میں کھڑا ملازمین سے سٹنگ ارینجمنٹ میں کچھ ردوبدل کروا رہا تھا۔

''ماہین ذرا کمرے سے میرا والٹ لا دو پلیز۔'' وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر والٹ تلاش کرنے کے بعد اس سے مخاطب ہوا تھا۔ پہلے جیسی بات ہوتی تو وہ تڑخ کر جواب دیتی۔

''خود لاؤ میں تمہاری نوکر نہیں ہوں۔'' مگر اس وقت وہ بغیر کچھ بولے چپ چاپ اندر آ گئی تھی۔ آج کل اس کا دل اتنا بے چین اور مضطرب رہتا تھا کہ اسے کسی سے بات کرنا اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ شاہ میر کے کمرے میں آئی تو والٹ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

''یہ تو اس سے پوچھا ہی نہیں کہ والٹ کہاں رکھا ہے۔'' وہ جھنجھلائی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پر دیکھا اس کے بعد بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر دیکھا۔ مگر والٹ ندارد، سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر دیکھا تو سامنے ہی والٹ پڑا تھا۔ وہ والٹ اٹھا کر دراز واپس بند کرنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر دراز کے سب سے

آخری کونے میں رکھی نیلے رنگ کی مخملیں ڈبیا پر پڑی۔ وہ دراز بند کر کے فوراً وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر فطری تجسس اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔

''بری بات ہے۔ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔ کسی کی چیزوں میں بغیر اجازت گھسنا انتہائی بے ہودہ حرکت ہے۔'' وہ ان تمام آوازوں کو نظر انداز کرتی ڈبیا نکال چکی تھی۔ کھولے بغیر ہی اندازہ تھا کہ اس میں کوئی جیولری ہے۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک بے حد خوب صورت، نازک اور نفیس نیکلس رکھا ہوا تھا۔ سونے کی موٹی سی چین اور نیچے خوب صورت نگ جڑا ہوا لاکٹ جس پر "M" بنا ہوا تھا۔ اتنا قیمتی تحفہ وہ کسے دینے والا تھا۔ یہ بات سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہی تو تھا۔ شاہ میر کا میمونہ کے لیے غیر معمولی التفات اس کو ضرورت سے زیادہ توجہ دینا۔ یہ سب کچھ یونہی تو ہونا تھا۔ یہ تو متوقع تھا۔ پھر اسے اتنا دکھ کس بات پر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسو بے دردی سے صاف کیے تھے۔ ڈبیا واپس دراز میں رکھ کر وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ملازم کے ہاتھ شاہ میر کا والٹ بھجوا کر وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں خود کو مصروف کرنے لگی۔ فنکشن بے حد شاندار رہا تھا۔ کھانے کے بعد نانا ابا کے دوست ان سے مخاطب ہوئے۔

''اتنے زبردست ڈنر کے بعد کوئی گانوں وانوں کا پروگرام بھی ہونا چاہیے۔''

''بھئی اس کے لیے میر سے رجوع کرو۔ کالج یونیورسٹی میں اسے ہی شوق رہا ہے گلوکاری کا۔''

نانا ابا کے کہنے پر سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ کچھ سناؤ۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔

''یہ کیا تم لڑکیوں کی طرح نخرے بازی کر رہے ہو تھوڑا سا کچھ سنا دو۔'' نانا ابا نے ٹوکا تو وہ بلآخر آمادہ ہو ہی گیا۔

تم واقعی اچھی لڑکی ہو
یا مجھ کو اچھی لگتی ہو
چہرے کی اداسی دور کرو
کیوں جی اپنا رنجور کرو
وہ وعدے وفا نبھانے کے
تم بھول گئیں مجھے یاد رہے
کیا شان تمہاری گھٹ جاتی
جو ایفا کرنے آ جاتیں
اب کن باتوں میں کھوئی ہو
اب کن سوچوں میں ڈوبی ہو
چہرے کو ذرا اٹھاؤ تو
آنکھیں بھی چار کرو دیکھو
تم غم چھوڑو دل کی بات کہو
تم ہنستی اچھی لگتی ہو
چہرے کی اداسی دور کرو

وہ بڑے جذبے سے گا رہا تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ اکثر خاندان کے فنکشنز میں اسے گانے کے لیے کہا جاتا تھا۔ مگر آج وہ یہ نظم کسی خاص وجہ سے گا رہا ہے ماہین کو اندازہ تھا۔ اس نے ایک نظر میمونہ کو دیکھا تو وہاں بڑے خوب صورت تاثرات درج تھے۔ وہ بڑے انہماک اور توجہ سے شاہ میر کو گاتا سن رہی تھی کہ دیکھ رہی تھی ماہین سمجھ نہیں پائی۔

''بائی داوے یہ ذکر کس خوش قسمت کا تھا۔'' نانا ابا کے دوست انکل ہمدانی نے بے تکلفی سے شاہ میر کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

''انکل کچھ تو سیکریٹ بھی رہنے دیں۔'' وہ بے فکری سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تھا جواب میں نانا ابا اور انکل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اس کا دل یہاں سے بری طرح اچاٹ ہو رہا تھا۔ مارے باندھے وہ مہمانوں کے جانے تک وہاں رکی رہی تھی۔ ساری رات وہ جاگتی رہی تھی۔ کبھی خوب صورت جگمگ کرتا M اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا کبھی جھلملاتا بلیک سوٹ۔ کبھی تم ہنستی اچھی لگتی ہو کی بازگشت سنائی دینے لگتی۔

''نانی امی میں واپس جا رہی ہوں۔'' صبح ناشتے کی میز پر وہ نانی امی سے مخاطب ہوئی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر صرف وہ نانا ابا اور نانی امی ہی موجود تھے۔ شاہ میر اور میمونہ ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے۔ شاید کل کی تھکن اتار رہے تھے۔

''اتنی اچانک خیر تو ہے۔'' نانی امی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''جی وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا پرسوں میری فرینڈ کی انگیجمنٹ ہے۔ رات کو کلینڈر پر نظر پڑی تو یاد آیا اگر میں نہیں گئی تو وہ سخت ناراض ہوگی۔''

جانے کا کیا بہانہ کرنا ہے یہ وہ رات ہی سوچ چکی تھی۔ اس میں جھوٹ تھا بھی نہیں۔ کنزی کی واقعی پرسوں انگیجمنٹ تھی۔ جھوٹ بس صرف اتنا تھا کہ یہ بات اسے شروع وقت سے یاد تھی یہاں آنے سے پہلے ہی وہ اس سے معذرت کر کے اور گفٹ دے کر آ گئی تھی۔ نانا ابا اور نانی امی کے پاس آنے سے زیادہ اس کے لیے کوئی فرینڈ کبھی بھی اہم نہیں رہی تھی۔ وہ یہ تمام چھٹیاں ان دونوں کی سنگت میں بتانا چاہتی تھی مگر اب ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے دور چلی جانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی عزت اور اپنا بھرم ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھا۔ وہ شاہ میر کو کبھی بھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دے گی۔ یہاں رہی تو اس کے کسی نہ کسی عمل سے وہ ضرور کچھ نہ کچھ جان جائے گا کہ وہ بہت ذہین ہے اور ایسا وہ کبھی بھی نہیں ہونے دے گی۔ اسے یقین تھا یہ تمام باتیں جو ابھی اسے بہت تکلیف دے رہی ہیں اس کی قوت برداشت سے زیادہ لگ رہی ہیں رفتہ رفتہ وہ انہیں اتنی شدت سے محسوس نہیں کرے گی۔ کراچی جا کر یونیورسٹی پڑھائی اور اپنی دوستوں میں لگ کر وہ یقیناً بہل جائے گی۔

''اگلا سمسٹر بریک آئے گا تو میں ساری چھٹیاں یہیں گزاروں گی پرامس۔'' وہ نانا ابا کا اداس چہرہ دیکھ کر شرمندگی سے بولی تھی۔

''پھراب تو آپ لوگ اکیلے بھی نہیں ہیں۔ ابھی تو خیر میر بھی ہے اور اس کے جانے کے بعد فی الحال میمونہ تو ہے ہی۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی تھی۔ اس کے انداز پر وہ ہنس پڑے تھے۔

''تمہاری کمی کبھی بھی کوئی بھی پوری نہیں کرسکتا میری جان۔'' نانا ابا کا یہ جملہ اس کا سیروں خون بڑھا گیا تھا۔ کتنے دنوں بعد اس نے کوئی ایسی بات سنی تھی جو اسے خوش کرنے کا باعث بنی تھی۔

''بہت سے لوگ ہیں جن کے لیے میں سب سے زیادہ اہم ہوں۔ ہر ایک حسن پرست نہیں ہوتا۔'' اس کے دل سے آواز ابھری تھی۔

''کب کی سیٹ کرواؤں؟'' نانا ابا نے ناشتا ختم کر کے دریافت کیا تھا۔

''آج یا کل کی۔ جو بھی اویل ایبل ہو۔'' اس کے جواب پر وہ ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اسے آج شام کی فلائیٹ میں سیٹ مل گئی تھی۔ اس کے سر سے جیسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔ اب اسے صرف چند گھنٹے اور یہ اعصاب شکن صورت حال برداشت کرنی تھی پھر وہ آرام سے اپنے گھر میں ہوگی۔ اس نے طمانیت سے سوچا تھا۔

کمرے میں آ کر وہ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ میمونہ واش روم سے نکلی تو اسے سامان پیک کرتا دیکھ کر تعجب سے بولی۔

''کیا ہوا۔ آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟''

''ہاں۔'' وہ مختصر جواب دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

''کہاں؟'' وہ بے اختیار اس کے پاس آ گئی تھی۔

''کراچی۔'' جواب پھر مختصر تھا۔

''لیکن ابھی تو آپ کی چھٹیاں باقی ہیں اور کل تک تو آپ کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اتنی اچانک کیوں جا رہی ہیں۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جانے کا سن کر وہ پریشان ہو گئی ہے۔

''بھئی آج یا کل مجھے واپس تو بہر حال جانا ہی تھا۔ میری دوست کی منگنی ہے اس لیے جا رہی ہوں۔'' اس کی معصوم و سادہ شکل زیادہ دیر اسے سخت انداز برقرار رکھنے میں ناکام کر گئی۔

''ابھی مت جائیں پلیز۔'' وہ رو دینے کو تھی۔ ماہین کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا کہے۔

''تمہاری ہی وجہ سے تو جا رہی ہوں۔ تم نے مجھے ہرا دیا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔ جبکہ دوسری طرف وہ زار و قطار رونا شروع ہو گئی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر ماہین ایک پل کے لیے بالکل حیران رہ گئی۔

''پاگل ہو بالکل، کراچی کوئی اتنا دور تھوڑی ہے۔ تمہارا جب دل چاہے نانا ابا کے ساتھ آ جانا۔ پھر ہم فون پر بھی باتیں کرسکتے ہیں۔ میں بھی جلدی چکر لگاؤں گی۔'' وہ اسے سمجھانے لگی۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد وہ میمونہ کو چپ کرانے اور سمجھانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے دل میں میمونہ کی طرف سے جو بال آ گیا تھا وہ صاف ہو گیا تھا۔

''اگر یہ لڑکی شاہ میر کی پسند ہے تو کچھ غلط تو نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اسے کوئی بھی پسند کرسکتا ہے۔ مجھے بڑے دل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جیلس ہونا، دوسروں کی خوشیوں سے حسد کرنا تنگ دل

اور چھوٹے لوگوں کا کام ہے۔ میں حاسد نہیں ہوں۔'' وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ وہ پیکنگ سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو لاؤنج میں نانا ابا اور شاہ میر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے تھے۔

''سنا ہے آپ واپس جا رہی ہیں۔'' شاہ میر نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ ماہین کو پتا نہیں کیوں بڑی معنی خیز محسوس ہو رہی ہوئی۔

''ٹھیک سنا ہے۔'' وہ اس کی مسکراہٹ نظر انداز کرتی اطمینان سے بولی۔

''کیا اسے شک ہو گیا ہے۔'' کچن کی طرف جاتے اس نے تشویش سے سوچا تھا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ صرف میرا وہم ہے۔ ٹھیک ہے وہ بہت جینئیس ہے بہت انٹیلیجنٹ ہے مگر اتنا پہنچا ہوا بھی نہیں کہ اسے دوسروں کے دل کا حال معلوم ہوسکے۔'' اس نے خود اپنی ہی سوچ کی نفی کی تھی۔ شاہ میر اس کے بعد بھی کافی دیر تک بیٹھا نانا ابا سے پتا نہیں کون سے مذاکرات کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ لنچ کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ شام چار بجے اس کی روانگی تھی۔ اسے ایئرپورٹ چھوڑنے نانا ابا جا رہے تھے۔ نانی امی اور میمونہ نے اسے گیٹ تک آ کر خدا حافظ کہا تھا۔

''جب عدالت سے زبیدہ اور اس کے بھائیوں کو سزا سنا دی جائے تو مجھے یہ خوش خبری فوراً سنانا۔'' اس نے میمونہ کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے کہا تھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔ شاہ میر شاید اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے ایئرپورٹ کیوں نہیں جا رہا یا خدا حافظ کہنے کیوں نہیں آیا، ماہین نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا۔ اس قسم کے مینرزان دونوں ہی نے کبھی بھی ایک دوسرے کے لیے شو نہیں کیے تھے۔ نانا ابا سے رخصت ہو کر اپنا ہینڈ بیگ اور بورڈنگ پاس ہاتھ میں لیے وہ ویٹنگ لاؤنج میں آ گئی۔ اس کی فلائیٹ کا ٹائم ہونے ہی والا ہے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی پتا نہیں کیا کیا سوچے جا رہی تھی۔ آتے وقت کا سفر جو اس نے شاہ میر کی سنگت میں طے کیا تھا یاد آ رہا تھا۔

''کیا پتا تھا یہاں سے میں بالکل خالی ہاتھ واپس لوٹوں گی۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے آنکھوں میں ریت بھر دی ہے۔

''یہ کیسا بچپنا ہے۔'' وہ خود سے خفا ہوئی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر کوئی آ کر بیٹھا تھا۔ ارد گرد کئی سیٹس خالی پڑی تھیں۔ اسے اس برابر آ کر بیٹھنے والے پر سخت تاؤ آیا۔ بلا وجہ لڑکیوں کو دیکھ کر فری ہونا۔ وہ ایک سخت نگاہ اس بندے پر ڈال کر وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی کہ ایک سرگوشی نما گنگناہٹ سن کر ٹھٹک گئی۔

''تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔'' یہ آواز تو وہ لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتی تھی۔

''میر تم؟'' وہ ہونق نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی میں، چھوٹی خالہ نے تمہیں میری نگرانی اور سرپرستی میں یہاں بھیجا تھا۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہیں اکیلے جانے دیا جائے گا۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تھا۔

''میں کوئی بچی نہیں ہوں جسے تمہاری نگرانی میں دیا جائے۔'' وہ تپ گئی تھی۔

''اچھا تو ماہین انصاری بڑی ہو چکی ہیں۔ تب ہی ایئرپورٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھ کر آنسو

بہارہی تھیں۔'' وہ اس کے گال پر ٹھہرے آنسو کو اپنی انگلی کی پور پر روکتا ہوا بولا اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ کب اس کی آنکھ سے آنسو بہا تھا۔ وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ شاہ میر کے سامنے اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے۔

''تمہارے جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔'' وہ بات بدلنے کے لیے بولی تھی۔

''پروگرام تو آپ کا بھی نہیں تھا۔ ویسے یہ کس بے چاری دوست کی اچانک منگنی کروا رہی ہو۔ خدا کرے تمہاری زبان مبارک ہو اور اس کی جلدی سے منگنی شادی رخصتی سب ہو جائے۔'' وہ شرارتی انداز میں بولا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں نے جھوٹ بولا ہے۔ چل کر خود دیکھ لینا۔ تمہیں یقین آ جائے گا۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔ جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''چور کی ڈاڑھی میں تنکا اسے ہی کہا جاتا ہے۔'' وہ مزہ لیتے ہوئے بولا تھا۔ ماہین ایک دم چپ ہوگئی تھی۔ اسی وقت فلائیٹ کی اناؤنسمنٹ ہوئی تو وہ کھڑا ہوگیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر ماہین بھی اٹھ گئی۔ جہاز میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی وہ رن وے کا جائزہ لے رہی تھی شاہ میر بھی خاموشی سے بیٹھا پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے تمہارا میرے لیے اتنا پوزیسو ہونا بہت اچھا لگا ہے۔'' شاہ میر کی یہ بات اسے کرنٹ لگا گئی تھی۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی وہ ہوگئی تھی۔ وہ جس چیز سے بھاگ کر یہاں سے جانا چاہتی تھی اس سے بھاگ نہیں پائی تھی۔ وہ اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اپنے ہاتھ نم ہوتے اور دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ کیسے خود کو چھپائے۔ اسے غلط ثابت کرے۔ وہ بس یہی سوچ رہی تھی۔

''وہ لڑکی جس کی تم سب سے بڑی ہمدرد اور ویل وشر تھیں تمہیں میری وجہ سے وہ بھی بری لگنے لگی۔ کل جب تم اس بے چاری کو سخت نگاہوں سے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں تو مجھے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا۔'' وہ جیسے تصور سے اسی وقت کو انجوائے کر رہا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی کسی کو گھور کر دیکھنے کی۔ تمہیں بلا وجہ کی خوش فہمی ہو رہی ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر غصے سے بولی تو وہ شرارت سے ہنس دیا تھا۔ اس کی شرارتی ہنسی ماہین کو طیش دلا رہی تھی۔

''الٹا خود اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے تھے۔ سخت چیپ لگ رہے تھے یہ تھرڈ کلاس حرکتیں کرتے ہوئے۔'' وہ غصے سے بولی تھی۔

''یعنی تم مجھے اتنا بغور آبزرو کر رہی تھیں کہ میں کسے دیکھ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔'' وہ شوخی سے بولا۔ ''اس کے لیے بطور خاص کسی آبزرویشن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی اندھا بھی اس بات کو فیل کر سکتا تھا کہ ہیزل گرین آنکھیں اور لمبے سلکی بالوں پر آپ دل و جان سے فدا ہو چکے ہیں۔ وہ

ہو بہو آپ کے آئیڈیل کے مطابق جو ہے۔'' اسے خود احساس نہیں ہوا کہ اس کی باتوں سے جیلسی ظاہر ہو رہی ہے میر اس کے انداز پر ہنس پڑا تھا۔

''بس تمہاری یہی بات اور یہی attitude مجھے اپیل کرتا ہے۔ ویسے اپنا آئیڈیل میں نے تمہیں کب بتایا تھا؟''

''مجھے کیوں بتاتے۔ عماد بھائی کی مہندی پر سب کے سامنے کہا تھا۔'' وہ اس کے ہنسنے پر غصے سے بولی تھی۔

''اوہ خدا تمہیں اتنی پرانی بات اب تک یاد ہے۔ میں تو بھول بھی گیا تھا۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر یاد کرتے ہوئے بولا تھا۔

''یعنی تم اتنے پہلے سے میرے بارے میں سوچتی ہو۔'' وہ خوش ہو کر بولا ماہین کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے وہ دوبارہ بولا۔

''بھئی اس میں برا ماننے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ اب سب کے سامنے میں یہ تو کہنے سے رہا تھا کہ میری آئیڈل کے بال شولڈرز تک ہوں گے، بے چاری انہیں لمبا کرنے کے لیے کئی نسخے آزماتی ہوگی مگر بال بڑے نہیں ہوتے ہوں گے۔ انڈہ، دہی، دودھ، ہرا دھنیا، پودینہ، ٹماٹر، چائے کی پتی، ماش کی دال، آٹا، بیسن اور پتا نہیں کیا کیا لگاتی ہوگی مگر بال ایک انچ نہ بڑھتے ہوں گے۔'' شاہ میر کی سنجیدگی سے کہی اس بات پر وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں پائی تھی۔ اکثر چھٹی والے روز شاہ میران کے گھر آ جایا کرتا تھا اور اکثر ہی ایسا ہوتا کہ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے کبھی وہ سر پر انڈہ، کبھی مہندی یا کوئی اور چیز لگائے ہوتی پھر وہ سمیر وغیرہ کے ساتھ مل کر اس کا ریکارڈ لگایا کرتا تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔

''سچی بات یہ ہے کہ میں صرف انسانیت کے ناتے اور ہمدردی میں اس سے بات کر رہا تھا۔ میری اس کے بارے میں ایسی کوئی فیلنگ نہیں تھیں۔ مگر اس روز لان میں جب تم اسے میرے پاس سے اٹھا کر لے گئیں تو میں چونکا۔ ذرا غور کرنے سے ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ تمہارے بارے میں اس طرح میں نے پہلے کبھی بھی نہیں سوچا تھا مگر اس روز مجھے تمہارا وہ جیلس روپ بہت اچھا لگا۔ پھر اس کے بعد تو میں صرف تمہیں ستانے کے لیے اسے اتنی زیادہ اہمیت دیتا تھا اور تمہیں جان کر اگنور کرتا تھا۔ میرے لیے وہ چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

''ہاں چھوٹی بہنوں کو اتنے ہی والہانہ انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے نظمیں گائی جاتی ہیں اور ان کے لیے سب سے چھپا کر گولڈ کے گفٹ لیے جاتے ہیں۔'' وہ جل کر بولی تھی۔ اس کی بات پر شاہ میر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

''تم سے کس نے کہا میں نے اسے گولڈ کا گفٹ دیا ہے۔'' وہ ہنسی روکتا ہوا بولا۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے M کے لاکٹ والی چین تمہاری دراز میں دیکھی ہے۔'' وہ اس کے انداز پر تپ گئی تھی۔

''تم کبھی بڑی بھی ہوگی کہ نہیں۔ M سے کیا صرف میمونہ ہی آ سکتا ہے ماہین نہیں۔'' وہ ذرا چڑ کر بولا تھا۔

''مجھے اور اتنا قیمتی گفٹ تم دو گے۔ تمہارا ہارٹ فیل نہیں ہو جائے گا۔ کبھی چار روپے کی چیونگم تو دی نہیں ہے۔'' وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ اس کی بات کے جواب میں بجائے کچھ کہنے کے وہ جیکٹ کی پاکٹ میں سے کچھ نکالنے لگا۔ ماہین خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے جیب سے وہی نیکلس نکالا تھا۔ اسے نیکلس کا لاک کھول کر اپنی طرف ہاتھ بڑھاتا دیکھ کر وہ بے اختیار پیچھے ہٹی۔

''کیا کر رہے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' وہ اس کی بات کا کوئی نوٹس لیے بغیر ذرا سا اس کی طرف جھکا اور چین اس کے گلے میں ڈال کر پیچھے سے لاک لگانے لگا۔ سامنے سے آتی ایئر ہوسٹس کو دیکھ کر وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

''اب تو آ گیا یقین کہ یہ چین بھی تمہارے لیے تھی۔ وہ نظم بھی تمہارے لیے تھی اور اسے والہانہ انداز میں دیکھنا بھی صرف تمہاری وہ جل ککڑی اور روتی بسورتی شکل دیکھنے کے لیے تھا۔'' وہ اس کی اتنی فضول سی حرکت پر اب تک شرمندہ سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''سنو کیا تم شرما رہی ہو۔'' وہ شرارتی انداز میں بولا تھا۔ ماہین کا سر مزید جھک گیا تھا۔

''ویسے تم نے وہ مثل تو ضرور سنی ہو گی کہ دل آیا گدھی پر تو پری کیا چیز ہے۔ بس میرے ساتھ بھی لگتا ہے ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' جواب میں اس کا ردعمل حسب توقع تھا۔ وہ شرمانا ورمانا بھول کر اسے گھورنے لگی تھی۔ مگر ان آنکھوں میں وہ لمحے بھر سے زیادہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

''تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔'' وہ آہستہ سے گنگنایا تھا اور وہ واقعی ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

تیرے لیے ہے میرا دل

وہ اسے پچھلے ایک مہینے سے یہاں آتا دیکھ رہے تھے۔ پتا نہیں اس میں ایسی کیا بات محسوس ہوئی تھی جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ خود ان کا تو برسوں پرانا معمول تھا کہ وہ شام میں واک کرنے کے لیے پارک آیا کرتے تھے۔ مگر اس لڑکی کو انہوں نے اس سے پہلے یہاں آتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

یہ ایک مہینہ پیشتر کی بات تھی جب انہوں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ روزانہ چھ بجے کے قریب وہ پارک آتی اور پارک کے کونے میں بالکل الگ تھلگ سی بینچ پر بیٹھ جایا کرتی۔ اتنے وسیع پارک کے قدرے سنسان سی جگہ پر واقع اس بینچ پر کوئی اور بیٹھتا بھی نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی یہ مخصوص بینچ اسے روز ہی خالی ملتی۔ وہ بظاہر کھیلتے کودتے بچوں پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھی رہتی مگر انہیں ایسا لگتا جیسے وہ صرف جسمانی طور پر یہاں موجود ہے ورنہ اس کا دل اور دماغ کہیں اور ہی مصروف عمل ہیں۔ عجیب سی تھکاوٹ اور بےزاری اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہے۔ اسے لوگوں نے بڑا مایوس کیا ہے اور وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کا سوگ منانے یہاں آتی ہے۔

مغرب کا وقت ہوتا اور بچے پارک سے جانا شروع کر دیتے وہ تب بھی ویسے ہی بیٹھی رہتی۔ پھر جب اندھیرا ہلکا ہلکا پھیلنا شروع ہو جاتا وہ بینچ پر سے یوں کھڑی ہوتی جیسے ابھی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔

وہ جو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ لوگوں اور ان کے رویوں کو سمجھنے میں گزار چکے تھے، اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بات کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنے گھر اور گھر کے افراد سے روٹھی ہوئی ایک ناراض سی لڑکی ہے۔

وہ جگہ جہاں وہ رہتی تھی شاید وہاں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس جگہ سے فرار حاصل کرنے کے یہاں چلی آتی تھی۔ مگر یہاں آنے کے باوجود وہ اس جگہ سے متعلق تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک نہیں سکی تھی اسی لیے لاشعوری طور پر سارا وقت وہیں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ روزانہ واک کرتے ہوئے وہ دو تین بار اس کے سامنے سے گزرتے تھے مگر وہ کبھی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

آج ایک دم ان کا دل چاہا کہ اس سے جا کر بات کریں اور اسے سمجھائیں کہ اتنی اداسی اور گرفتگی اچھی نہیں۔ اگر تمہیں کوئی دکھ پہنچا بھی ہے تو اسے برداشت کرنے کی کوشش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو۔

اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ واک کرتے ہوئے اس کے پاس آ گئے اور بولے۔

''ہیلو ینگ لیڈی! کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

وہ اپنے کسی دھیان سے چونک کر ان کو حیران نظروں سے اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ شاید ان کی بات اس نے صحیح طور پر سنی بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے حیرت بھرے تاثرات کے پیش نظر وہ دوبارہ بولے۔

''بیٹا کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

''جی ضرور۔'' وہ کچھ بوکھلا کر بولی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس کے پاس کیوں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بولتے ہی وہ فوراً بینچ پر بیٹھ گئے اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''مجھے نئے نئے دوست بنانے کا بہت شوق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوستی کے معاملے میں، میں بڑا چوزی ہوں صرف انہیں لوگوں سے دوستی کرتا ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں اور تم کیونکہ مجھے بہت اچھی لگی ہو اس لیے میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

ان کے بے تکلفانہ انداز تخاطب پر وہ بے اختیار مسکرا دی اور بولی۔

''آپ تو مجھے جانتے بھی نہیں ہیں پھر میں آپ کو اچھی کیسے لگ گئی؟''

''اچھی لگی ہو اسی لیے تو جاننا چاہتا ہوں کہ میری نئی دوست کون ہے کہاں رہتی ہے وغیرہ وغیرہ ہو گئی ہوں۔''

ان کا دھیما اور پرخلوص سا انداز اسے بے اختیار اپنی گرفت میں لے گیا۔ وہ اب بڑے دھیان اور غور سے ان کی طرف دیکھنے لگی ان کے چہرے پر اتنی شفقت اور محبت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اتنی توجہ سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ قدرے شریر انداز میں بولے۔

''کیا میں آج بھی اتنا ہینڈسم ہوں کہ لڑکیاں اتنے غور سے مجھے دیکھیں؟'' ان کی بات پر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہ اس کے ہنستے مسکراتے چہرے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ پہلے میں ہی اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

''میرا نام سید مبشر لودھی ہے۔ عمر انہتر سال ہے۔ بقول شاعر کبھی ہم خوب صورت تھے۔ اگر تم چالیس پچاس سال پہلے ملی ہوتیں تو دیکھتیں کہ اسمارٹنیس اور خوب صورتی کسے کہتے ہیں۔''

وہ اتنے ہنس مکھ سے تھے کہ وہ اپنی ریزرو رہنے والی نیچر کے باوجود قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''آپ ابھی بھی بہت ہینڈسم ہیں اور اگر خود اپنے منہ سے اپنی ایج نہ بتائیں تو ساٹھ سے زیادہ کے تو لگتے بھی نہیں ہیں۔'' اس کی بات پر وہ بھی ہنس پڑے اور بولے۔

''بچی تم میرا دل رکھنے کو تو ایسا نہیں کہہ رہیں کہ چلو بڑے میاں کو تھوڑا خوش کر دیں۔''

''آئی سویئر میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' پتا نہیں ان کی شخصیت اور بولنے کے انداز میں کیسا جادو تھا کہ وہ خود بخود ان کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھی۔

''چلو تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔'' وہ اس کی بات کا مزا لیتے ہوئے بولے۔

''خیر میں اپنا انٹروڈکشن کروا رہا تھا۔ بڑی مصروف اور بھاگتی دوڑتی زندگی گزاری ہے میں نے۔ اسی لیے اب آرام سے ریٹائرڈ لائف کو انجوائے کر رہا ہوں۔ ان دنوں کچھ لکھنے پڑھنے سے زیادہ ہی شغف ہو گیا ہے۔ اس لیے سارا دن اپنی اسٹڈی میں کتابیں پڑھنے میں گزار دیتا ہوں۔ اپنے یورپ اور افریقہ کے ممالک کے دوروں کے نتیجے میں وہاں کے حالات اور اپنے تجربات پر مبنی دو عدد سفرنامے لکھ چکا ہوں۔ آج کل کچھ قریبی دوستوں کے مشورے پر اپنے مختلف موضوعات پر لکھے گئے آرٹیکلز جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہیں ڈیفنس میں رہتا ہوں۔''

وہ ان سے بڑی مرعوب اور متاثر نظر آ رہی تھی۔

''اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔'' وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

''آپ جیسے عالم فاضل اور انٹیلیکچوئل کے سامنے میں اپنا کیا تعارف کرواؤں۔ بہرحال میرا نام اجالا شہریار ہے اور میں نے انڈس ویلی سے فائن آرٹس میں گریجویشن کی ہے۔ ان دنوں ایک آرٹ اسکول میں جاب کر رہی ہوں۔ میں بھی ڈیفنس ہی میں رہتی ہوں۔''

''اچھا تو میری ننھی دوست ایک آرٹسٹ ہے۔ بھئی میں تو پہلی نظر ہی میں جان گیا تھا کہ تم بڑی ٹیلنٹڈ لڑکی ہو۔'' وہ اپنی تعریف پر مسکراتی ہوئی بولی۔

''اتنی ننھی بھی نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس جنوری میں، میں پورے چھبیس سال کی ہو گئی ہوں۔'' وہ اس کے صاف گوئی سے اپنی عمر بتانے پر ہنس پڑے اور بولے۔

''میرے آگے تو چھوٹی سی بچی ہی ہو۔ خیر یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے دوستی کرنا منظور ہے۔'' وہ جواب میں ان کی بات پر اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا اب تک ہماری دوستی ہو نہیں چکی؟''

''نہیں باقاعدہ دوستی تو نہیں ہوئی نا۔ اب تم دوستی کرنے کے لیے مان گئی ہو تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں دوستی میں بھی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں۔ لہٰذا میری پہلی ڈکٹیشن تو یہ ہے کہ مجھے روتے بسورتے چہرے بہت زہر لگتے ہیں اس لیے اگر مجھ سے فرینڈ شپ کرنی ہے تو جب بھی مجھے ملو ہنستی مسکراتی نظر آنا۔ ٹھیک ہے۔'' وہ اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولے۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے ان کے بھاری مردانہ ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور گردن ہلا دی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے چھوڑ دیا۔ پھر کچھ دیر وہ اس سے فائن آرٹس اور اس کی جاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اذان سے کچھ پہلے وہ اٹھے تو اجالا بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ دونوں چہل قدمی کرتے

ہوئے پارک سے نکل آئے۔ پارک سے پانچ چھ منٹ کی واک پر ان کا گھر تھا۔ سڑک کے کنار کھڑے ہوکر انہوں نے اسے اشارے سے اپنا گھر دکھایا اور چلے گئے تو وہ بھی آگے بڑھ گئی۔

اگلے روز وہ پارک آئی تو وہ اسے واک کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس ایج میں بھی ان کی فٹنس زبردست تھی۔ چھ فٹ قد اور مضبوط ڈیل ڈول۔ ان کی نہ تو کمر جھکی ہوئی تھی نہ ہی چال میں رفتاری نظر آرہی تھی۔ گہری اور چمک دار آنکھیں تو مخاطب کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ داڑھی نے ان کے چہرے کو ایک عجیب سے نورانی ہالے میں لے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر انہوں سے ہاتھ ہلا کر وش کیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی تیز قدموں سے چلتی ان کے پاس آگئی اور بولی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا؟'' وہ شفقت سے مسکرا کر بولے۔

''میں ٹھیک ہوں انکل آپ کیسے ہیں؟''

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آؤ آج بیٹھنے کے بجائے تم بھی میرے ساتھ واک کرو۔''

اسے آفر کرتے انہوں نے چلنا شروع کیا تو وہ بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ تک وہ دونوں واک کرتے رہے اس دوران انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں دوسرے کی پسند ناپسند وغیرہ کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے رہے۔ بات کرتے کرتے اچا کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی تو بوکھلا کر بولے۔

''مارے گئے، وہ الو تو مجھ سے سخت ناراض بیٹھا ہوا ہوگا۔'' اس کی حیران شکل پر نظر پڑی تو بولے۔

''میرا الو تا ہے اویس۔ اسے اکثر میں پیار سے الو ہی کہتا ہوں۔ اب کہیں تم اسے کوئی احمق نہ سمجھ لینا۔ بڑا جینئس اور لائق ہے۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں اسے جاننے والے تمام لوگ کہ بچپن سے لے کر آج تک زندگی کے ہر میدان میں اول رہا ہے۔ پڑھائی میں تو خیر اچھا تھا اسپورٹس میں بھی اس کی کارکردگی نہایت شاندار تھی۔ اسکواش، سوئمنگ اور پولو ان تمام گیمز میں ہمیشہ ہی فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے۔ اس جیسا ڈیبیٹر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑی ہی قطعی نیچر ہے۔ اپنے ارادوں میں اٹل اور قطعی فیصلے کرنے والا۔ دلیر، نڈر اور مستقل مزاج۔ ہارنا تو جیسے سیکھا ہی نہیں ہے۔ آکسفورڈ میں بھی اپنی ذہانت اور لیاقت کے جھنڈے گاڑھ کر آیا ہے۔ اس کے پروفیسرز آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے میرا اتنا پھیلا ہوا بزنس وہی سنبھال رہا ہے۔ مجھے اس نے ریٹائرمنٹ دلوادی ہے۔''

ان کے لہجے میں اپنے پوتے کے لیے محبت، فخر، مان اور کیا کیا کچھ نہ تھا۔ وہ ان کے بکھرے ہوئے ان رنگوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی اس کے لیے اس لہجے میں محبتیں او جتانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کسی کی عزیز از جان نہیں تھی۔ کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس کی خوبیوں کو اپنی والہانہ چاہت کا اظہار کرتا۔ وہ ایک عجیب سے تاسف اور دکھ کو اپنے دل میں گھر کرتا کرنے لگی۔ جبکہ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہے تھے۔

''آج ذرا جلدی گھر جانا ہے۔ تم چل رہی ہو یا ابھی رکو گی؟'' ان کی بات پر وہ ایک

سانس لے کر بولی۔

''نہیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔'' کل کی طرح وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔ ان کے گھر کی اسٹریٹ کے کنارے انہیں خدا حافظ کہتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

پھر ان سے روز پارک میں ملنا جیسے ایک معمول سا بن گیا تھا۔ وہ کیونکہ واک کرنے آتے تھے سو اجالا بھی انہیں جوائن کر لیتی اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی سنگت میں گزار کر جب وہ واپس لوٹتی تو خود کو بہت تر و تازہ اور خوش محسوس کرتی۔ ان کی کمپنی اتنی دلچسپ ہوتی کہ اسے بوریت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ عام بوڑھے افراد کی طرح انہیں نئی نسل میں سینکڑوں خرابیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ محض تنقید کرنے کے لیے یا جنریشن گیپ کے پیش نظر ہمارے زمانے میں تو یوں ہوتا تھا یہ آج کل کی نسل تو نری واہیات ہے۔ جیسے فقرے بھی نہیں بولا کرتے تھے۔ جہاں انہیں اپنے زمانے کا میوزک، فلمیں اور لٹریچر پسند تھا وہیں وہ نئی نسل کے بھی بہت سے گلوکاروں کو پسند کرتے تھے۔ نئے دور کی عمدہ اور معیاری فلمیں اور کتب بھی ان کی من پسند تھیں۔ اسی لیے اسے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ کسی ڈل سے بوڑھے شخص کے ساتھ وقت گزار رہی ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک کے بارے میں ان کی معلومات اتنی اپ ٹو ڈیٹ تھیں وہ خود ان سے بہت کچھ سیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس سے کبھی بھی اس کے گھر یا گھر والوں سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ زیادہ تر وہ لوگ جنرل ٹاپکس پر باتیں کرتے رہتے۔ اسے ان کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ بلا وجہ کے تجسس میں مبتلا ہو کر اس سے پرسنل باتیں نہیں پوچھا کرتے تھے اور کیونکہ وہ اپنے گھر کے حوالے سے کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے ان کی اس عادت سے بہت خوش تھی۔ خود وہ البتہ باتوں باتوں میں اکثر اپنے پوتے کا ذکر کیا کرتے تھے۔

بات چاہے کسی بھی موضوع پر ہو رہی ہوتی اس کا کسی نہ کسی طرح سید اویس لودھی سے لنک جوڑ دیا جاتا تھا۔ اگر کھانے پینے کی بات ہو رہی ہوتی تو وہ کہتے ''اویس کو سی فوڈ اور مختلف قسم کے سلاد کھانے کا بہت شوق ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر پہلے اپنا آدھا پیٹ تو سلاد سے بھر لیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے خانساماں بے چارے کو اس کی وجہ سے مختلف کھانے پکانے کی کتابوں اور ٹی وی پروگراموں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے تاکہ اسے روز نئی سے نئی طرح کے سلاد بنا کر کھلا سکے۔''

اگر کتابوں کی یا پڑھنے پڑھانے کی بات ہو رہی ہوتی تو کہتے۔

''اویس کو بھی میری طرح کتابوں سے عشق ہے۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتا ہے چاہے وہ کوئی میگزین ہو یا کوئی کتاب۔'' وہ اپنے پوتے سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ اسی لیے یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے پاس موجود ہوتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ وہ ایک تیسرے فرد کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔

اس روز بھی وہ ان کے ساتھ واک کرتی ہوئی ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع بعض لوگوں کا اپنی کسی بھی عادت کو نشے کی طرح اختیار کر لینا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اپنے پوتے کا ذکر کرنا نہ بھولے اور بولے۔

''اویس کی ایک یہی عادت مجھے ناپسند ہے۔ حالانکہ اس نے کبھی میرے سامنے سگریٹ نہیں پیا،

لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ اسموکنگ کرتا ہے۔ ویسے اپنی فٹنیس کا اور اپنی ہیلتھ کا اتنا خیال رکھتا ہے روزا صبح باقاعدگی کے ساتھ ایکسر سائز کرتا ہے۔ شام میں سوئمنگ کرتا ہے اور ہفتے میں دو تین بار اسکواش کھیا بھی جاتا ہے مگر اسموکنگ سے باز نہیں آتا۔" ان کی بات بڑے غور سے سنتے ہوئے وہ ایک دم بوا پڑی۔

"وہ کیا آپ کی بات نہیں مانتے؟"

"نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل اس نے کبھی میرے سامنے اسموکنگ کی ہی نہیں۔ اس لیے میں اسے کبھی ٹوک نہیں پایا۔"

اتنے عرصے سے اس کے بارے میں سنتے سنتے اسے اب وہ نادیدہ بندہ بڑا جانا پہچانا سا لگنے تھا۔ اسے یونہی خیال آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے پوتے ہی کا ذکر کرتے ہیں کبھی بیٹے اور بہو کی کوئی بات نہیں کی اپنے اس خیال کے پیش نظر وہ بول اٹھی۔

"آپ کے بیٹا اور بہو کیا کہیں دوسرے ملک میں رہتے ہیں۔"

اس کے سوال پر ایک تاریک سا سایہ ان کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک ویران اور برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ ان کے کچھ کہے بغیر ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اور اب بڑی شرمندگی میں گھری کھڑی تھی۔

"آئم سوری میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔"

اس کی بات پر وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑے دکھی انداز میں دھیرے سے بولے۔

"یہ دکھ تو ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ لیکن بعض اوقات ہمیں اپنے تمام دکھ اور رنج والم اپنے سے وابستہ دوسرے افراد کی وجہ سے دل کے کسی نہاں خانے میں چھپانے پڑتے ہیں۔ لیکن اس طرح کرنے سے بھی اس دکھ کی شدت کم تو نہیں ہو جاتی۔ آج جو میں زندہ ہوں تو صرف اویس کی وجہ سے ورنہ برسوں پہلے جوان بیٹے اور بہو کی موت کی خبر سن کر ہی شاید میں مر گیا ہوتا۔" اس کی اتنی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ان ہنستی مسکراتی زندگی سے بھرپور آنکھوں میں نمی دیکھ سکے اس لیے چپ چاپ سر جھکائے ان کی بھرائی ہوئی آواز سن رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اس سے بولے۔

"آج میں تمہیں اپنے بارے میں بہت ساری باتیں بتاؤں۔" وہ ان کی طرف نظر ڈالے بغیر ان کے ساتھ چلتی بینچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے سنا وہ آسمان پر نگاہیں جمائے بول رہے تھے۔

"کبھی ہمارا ایک محبت بھرا آشیانہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں، میں، صبیحہ اور دانیال رہا کرتے تھے۔ صبیحہ میرے ماموں کی بیٹی تھی۔ ہماری شادی بزرگوں کی مرضی سے طے پائی تھی مگر اس میں ہم دونوں کی پسند بھی شامل تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بڑی ہمدرد، نیک دل اور خدمت گزار، ایسی بیوی قسمت والوں ہی کو ملا کرتی ہے۔ اس نے میری زندگی میں شامل ہو کر اسے ہر لحاظ سے مکمل کر دیا تھا۔ میرے کہے بغیر میرے دل کا حال جان لینے والی وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ پھر ہماری زندگی میں دانیال آ گیا تو جیسے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئیں۔ ہماری زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور تھی۔ وقت گزرتا گیا دانیال بڑا ہو گیا۔ وہ بڑا ذہین اور قابل تھا بالکل میرے اویس کی طرح۔ ہم دونوں میاں بیوی

ـنے بیٹے کی کامیابیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ تھا بھی بہت اچھا بڑا فرماں بردار اس نے تمام زندگی کبھی ـے یا اپنی ماں سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ کبھی ہمارا کہا نہیں ٹالا۔ اس کے اخلاق اور اچھی ـت کے اپنے پرائے سب ہی گن گاتے تھے۔ جب وہ اپنی زندگی میں ہر لحاظ سے سیٹ ہو گیا تو ہم ـں نے اس کی شادی کے بارے میں سوچا۔ صبیحہ اپنے طور پر خاندان کی دو تین لڑکیوں کو اس کے لیے ـرتی تھی۔ مگر اس نے اپنی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ سنایا تو مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا مگر صبیحہ ـتی ماؤں کی طرح اس بات پر ناراض ہو گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے بیٹے نے کسی چیز کے لیے ـکی تھی۔ میرے سمجھانے بجھانے کے باوجود صبیحہ اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹی۔ مگر اس موقع پر ـال بھی حد درجے ضدی اور سرکش ثابت ہوا۔ اس نے فیصلہ سنا دیا کہ شادی کرے گا تو سبین سے ورنہ ـسے بھی نہیں کرے گا۔ بالآخر میرے بہت سمجھانے اور منانے پر صبیحہ اس شادی کے لیے تیار ہو گئی ـدل سے وہ دانیال سے سخت ناراض تھی۔

سبین بہو بن کر ہمارے گھر میں آ گئی تو پتا چلا کہ ہمارے فرماں بردار بیٹے نے کسی غلط چیز کے لیے ـنہ کی تھی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شکل صورت میں تو لاجواب تھی ہی۔ اپنی عادتوں میں ـبے مثال تھی۔ وہ یونیورسٹی میں دانیال سے دو سال جونیئر تھی مگر اس کی سادگی اور معصومیت دیکھ کر ـہی نہیں تھا کہ اس نے اتنا سارا پڑھا ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صبیحہ کا غصہ بھی جاتا رہا اور وہ ـں ساس بہو کے بجائے ماں بیٹی نظر آنے لگیں۔ پھر ہمارے گھر کی رونقوں کو دوبالا کرنے کے لیے ـں آ گیا۔ وہ ننھا فرشتہ اپنے ماں باپ اور دادی کی آنکھوں کا تارا تھا اور میری تو بات ہی کیا تھی مجھے تو ـسے ایک عجیب سا عشق ہو گیا تھا۔ شاید اس کی بے تحاشا محبت خدا نے میرے دل میں اسی لیے ڈال ـی کہ اس بن ماں باپ کے بچے کی پرورش مجھے کرنی تھی۔ دانیال اور سبین کے ہوتے ہوئے بھی وہ ہر ـمیرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کو سوتا بھی میرے پاس تھا۔

پھر جب وہ دو سال کا ہوا تو ایک روز اچانک صبیحہ مجھے چھوڑ گئی۔ اس وقت تو اس کے چلے جانے پر بہت اپ سیٹ ہوا تھا مگر خدا کے ہر کام میں ہی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ بیٹے اور ـغم دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کے جنازے کو اس کے جواں بیٹے نے کندھا دیا تھا وہ ـقسمت تھی اور میں بڑا ہی بدنصیب جس نے اپنے جوان بیٹے کے لاشے کو اپنے کندھے پر اٹھایا تھا ـم یہ کہ مجھے پھر بھی جینا تھا اپنے اویس کی خاطر۔ دانیال کے دوست کی شادی تھی جس میں شرکت کے ـوہ اور سبین حیدر آباد گئے تھے۔ اویس مجھ سے مانوس ہونے کے سبب میرے پاس ٹھہر گیا تھا۔

شادی میں شرکت کر کے واپس آتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایکسیڈنٹ اتنا ـید تھا کہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے۔ یہ اطلاع پا کر میرا جو حال ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ بس یہ ـلہ اس دنیا میں میں اکیلا ہو گیا تھا۔ میرا آشیانہ تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا تھا۔ میرا دل مرنے کو چاہنے لگا تھا۔ ـمجھے جینا تھا۔ اپنے دانیال کی نشانی کی حفاظت کرنی تھی۔ وہ پانچ سال کا معصوم بچہ اسے تو شاید اپنے ـان کا صحیح سے اندازہ بھی نہیں تھا۔

اسے تو اس وقت یہ پتا بھی نہیں تھا وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ بس پھر اویس کی خاطر ـسنے خود کو سنبھالا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا احساس بچہ تھا۔ میرے کہے بنا میرا ہر دکھ اس نے اپنے اندر اتار

لیا۔ہم دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات کی وضاحت کے لیے لفظ استعمال نہیں کرنے پڑ
وہ مجھے اور میں اسے مکمل طور پر جانتے ہیں۔ہماری محبت بڑی نرالی اور انوکھی ہے۔''

ان کی آنکھ سے بہنے والے اس واحد آنسو کو اس نے اپنے ہاتھ سے پونچھ دیا تھا اور پھر اپنی انگل
پور پہ ٹھہرے اس آنسو کو دیکھ کر ان سے بولی تھی۔

''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔اتنے دکھ اٹھا کر بھی اتنے خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔تقدیر
شاکی نہیں آپ کو اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔''

اس کی بات کے جواب میں ایک تھکی ہوئی اداس سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔

''اللہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔اس نے اگر مجھ سے کچھ لے لیا تو اس سے کئی گنا بڑ
کر دیا بھی تو ہے اور جو واپس لے لیا وہ بھی تو اسی کا تھا۔اسی کی تو عنایت تھی کہ اس نے ایک اچھی بیوی ا
فرماں بردار بیٹا مجھے دیا تھا اور اب بھی اس کا رحم و کرم مجھے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔میرا اولا
میرے پاس ہے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔''

کچھ دیر بعد جب وہ اپنے گھر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ
جو ہر دم اللہ سے اور اپنی قسمت سے ناراض رہا کرتی تھی اچانک بدل گئی ہے۔اسے محسوس ہوا کہ دنیا م
صرف وہی دکھی اور تنہا نہیں اس سے بھی بڑھ کر غمزدہ اور تنہا لوگ موجود ہیں لیکن وہ اپنے دکھوں سے سمجھ
کر لیتے ہیں اور اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں۔

کتنے عرصے بعد اس روز وہ سکون سے سوئی تھی۔وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی جس نے ایک ا
اچھے مخلص انسان سے اسے ملوا دیا جو اسے درست راستہ دکھا رہا ہے اور اسے زندگی کی طرف واپس آ
میں مدد دے رہا ہے۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ تین روز سے پارک میں نہیں آ رہے تھے۔ان کے نہ آنے سے وہ بڑ
بے کل اور اداس سی ہو رہی تھی۔روزانہ بڑی آس سے پارک آتی اور مغرب کے وقت تک بیٹھ کر ان
انتظار کرتی رہتی مگر وہ نہ آتے۔آہستہ آہستہ اس کی اداسی پریشانی میں بدلتی جا رہی تھی۔انہوں نے ا
بتایا تھا کہ روزانہ شام کے وقت پارک آنا ان کا برسوں پرانا معمول ہے اور اب وہ اپنے معمول سے ہ
گئے تھے تو وہ فکر مند ہو گئی تھی۔

ان چار مہینوں میں وہ ان کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ ان سے ملے بغیر اسے کسی پل چین نہیں آ
تھا۔اب پانچویں دن بھی وہ اسے پارک میں نظر نہ آئے تو وہ خود کو روک نہیں پائی اور چلتی ہوئی اسی سڑک
پر مڑ گئی جس پر وہ روز مڑا کرتے تھے۔انہوں نے اسے اشارے سے دکھا کر بتایا تھا کہ کارنر سے پانچوا
مکان ان کا ہے۔وہ دل ہی دل میں ان کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگتی پانچویں مکان کے سامنے آ
گئی۔ان کا گھر بھی ان کی شخصیت کی طرح عالیشان تھا۔گو وہاں تمام ہی مکانات اچھے بنے ہوئے تھے
ڈیفنس جیسے پوش علاقے کا وہ وی۔آئی۔پی فیز تھا۔لیکن ان کا گھر دیگر گھروں کے مقابلے میں بہت

خوب صورت تھا۔گیٹ پر موجود چوکیدار سے وہ ابھی ان کے بارے میں پوچھنے ہی والی تھی کہ اندر سے
ایک گاڑی بڑی تیز رفتاری سے گیٹ کے پاس آ کر ہارن بجانے لگی۔چوکیدار نے اسے چھوڑ کر جلدی
سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔اتنی دیر میں وہ نیم پلیٹ پر جلی حروف میں لکھا ''سید مبشر لودھی'' پڑھ کر
کنفرم کر چکی تھی کہ وہ درست جگہ پہنچی ہے۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو اس نے اس امید پر گاڑی کی طرف بغور دیکھا کہ شاید وہ اس میں
موجود ہوں مگر اندر موجود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بندے کو دیکھ کر اس کی امید مایوسی میں بدل گئی۔وہ جو
تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دینا چاہتا تھا اپنے گیٹ پر کھڑی ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر رک گیا جو دیکھ
بھی اس کی طرف رہی تھی۔گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ اس سے بولا۔

''فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''انکل ہیں گھر پر؟''اس کی بات پر وہ ایک لمحے کو حیران ہوا تو وہ فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت
کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے مبشر انکل سے ملنا ہے۔''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔''وہ ایک سرسری نگاہ اس کے چہرے
پر ڈال کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو وہ بے ساختہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کی گاڑی کے بالکل پاس آ کر
کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا ہو گیا ہے انہیں؟''

''کچھ ہارٹ ٹربل ہو گئی ہے اس وجہ سے ہوسپٹلائز کرنا پڑا ہے۔''اب کے لہجہ بڑا بے زار اور
کوفت زدہ تھا۔وہ شاید کہیں جانے کی جلدی میں تھا اور یہ بلاوجہ کی انکوائری اسے پسند نہیں آ رہی تھی اسی
لیے چہرے پر بڑے ہی بے مروت سے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ ''بی بی مجھے معاف
کرو اور ذرا جلدی میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

اس کے بے زار سے انداز کو دیکھنے کے باوجود وہ دوبارہ بول پڑی۔

''کس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں؟''اسے ہاسپٹل کا نام بتا کر وہ تمام تر مروت بالائے طاق رکھتے
ہوئے گاڑی آگے بڑھا گیا تو وہ بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی واپس اپنے گھر آ گئی۔

کچھ لوگوں کے ساتھ آپ تمام عمر گزار دیں مگر آپ کے اور ان کے درمیان کوئی جذباتی وابستگی اور
ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک پل ہی میں اپنے بن جاتے ہیں جن سے
ایک بار مل کر بار بار ملنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔جن سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی ایک اپنائیت سی
محسوس ہوتی ہے۔کچھ اسی قسم کا تعلق جڑ گیا تھا اس کا سید مبشر لودھی کے ساتھ۔وہ جو اس کے کچھ بھی نہیں
لگتے تھے اور جنہیں وہ چار ماہ پہلے تک جانتی بھی نہیں تھی آج ان کی علالت کا سن کر بے قرار ہو گئی تھی۔

گھر آ کر اس نے ہاسپٹل فون کر کے وہاں کے ملاقات کے ٹائم کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا
تھا کہ صبح آٹھ سے دس اور شام پانچ سے سات بجے تک ملنے کے اوقات مقرر ہیں۔اس کا بس نہیں چل
رہا تھا کہ وہ اڑ کر پہنچ جائے اور ان کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کرے۔مگر ان سے ملنا اب کل سے پہلے ممکن
نہ تھا اس لیے وہ اپنے بے چین دل کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔اس نے اپنوں کی بے اعتنائیاں سہی

تھیں رشتے ناتوں پر اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اب جو ایک پرخلوص اور ہمدرد سے انسان نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک بہل بھی گئی تھی کہ ان کی بیماری اسے انجانے وسوسوں میں مبتلا کرنے لگی۔ اس شخص کو وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی تو وہ انہیں اپنے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں پائی تھی۔ ابھی تو اسے ان سے ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں اپنے دل کا تمام بوجھ ان کے سامنے ہلکا کرنا تھا۔ ابھی تو اس نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ان سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ ابھی تو وہ ان کے ہونے کو ڈھنگ سے محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ جدائی کا، بچھڑ جانے کا عفریت اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

اس رات وہ اپنے رب کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے اس محسن کے اور پیارے سے انسان کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی۔

صبح وہ جلدی جلدی دو چار لقمے نگل کر اور اسکول فون کر کے کہ وہ آج نہیں آسکے گی ہاسپٹل چلی آئی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی کہ سب خیر ہو، وہ بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے معمول کے مطابق ہنستے مسکراتے اور قہقہے بکھیرتے ہوئے ہوں اور ریسپشن سے روم نمبر معلوم کر کے اپنے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ سب سے پہلی تسلی تو اسی بات سے ہوئی تھی کہ وہ آئی سی یو میں نہیں تھے۔ یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے اندر سے ''یس کم ان'' کی آواز سنی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیڈ کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھا وہ شاید انہیں ناشتا کروا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہونے پر وہ دونوں ہی سر گھما کر نووارد کو دیکھنے لگے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

''آہا میری بیٹی آئی ہے۔ اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہونا میں کل سے تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔'' انہیں ہشاش بشاش اور باتیں کرتا دیکھ کر اس کی کب سے بے ترتیب دھڑکنیں معمول پر آئی تھیں۔

''السلام علیکم کیسے ہیں آپ۔'' وہاں موجود اس بندے کی وجہ سے وہ یونہی کھڑی ہوئی فارمل انداز میں ان کی خیریت پوچھنے لگی ورنہ دل تو اس کا یہ چاہ رہا تھا کہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر بہت سارو ئے اور کہے۔

''اب دوبارہ کبھی بیمار مت ہوئیے گا۔''

''وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں کو تو شوق ہے مجھے بیمار بنا کر بستر پر ڈالنے کا۔'' وہ اپنے برابر بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''تم کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا۔'' وہ پرتکلف انداز میں سامنے موجود صوفے پر بیٹھنے لگی تو وہ ٹوکتے ہوئے بولے۔

''وہاں اتنی دور کیوں بیٹھ رہی ہو۔ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔'' وہ اپنے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنانے لگے تو وہ کچھ جھجکتی ہوئی ان کے بائیں طرف ذرا سا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید اس کے آنے سے بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ اسی لیے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

''اویس یہ اجالا ہے۔ میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا کہ پارک میں میری ایک بہت ہی پیاری سی دوست بنی ہے، وہ یہی ہے۔''

وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھے شخص سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو اتنی دیر سے اپنے پاپا جانی کے لیے باعث مسرت بن جانے والی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دھیان آیا تھا کہ کل جب وہ ہاسپٹل جانے کی جلدی میں گھر سے نکل رہا تھا تو یہی لڑکی گیٹ پر کھڑی ملی تھی۔ اس وقت اسے ہاسپٹل پہنچ کر پاپا جانی کے ذاتی معالج ڈاکٹر ثروت حسین بخاری سے ملنا تھا۔ اس لیے وہ بڑی بے مروتی سے اس سے ڈھنگ سے بات کیے بغیر چلا گیا تھا۔ عام حالات میں وہ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ اگر کوئی اسے مغرور اور گھمنڈی سمجھتا تھا تو اس کے بلا سے۔ وہ ہر کسی سے بے تکلف ہوتا تھا نہ ہر ایک کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ اپنے انہیں رویوں کی بدولت وہ اپنے حلقے میں مغرور مشہور تھا۔ لڑکیاں بالخصوص اس کے مغرورانہ انداز پر بڑا چڑا کرتی تھیں۔ مگر یہاں مسئلہ اس لڑکی کا تھا جو اس کے پیارے پاپا جانی کو پیاری تھی اس لیے اسے اپنے کل کے رویے پر افسوس سا ہو رہا تھا۔

''ہیلو کیسی ہیں آپ؟'' اپنی عادت کے برخلاف وہ بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا کر اس سے مخاطب ہوا۔ شاید کل کے رویے کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر بولی۔ وہ ان سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی مگر اس وقت اس کی موجودگی کے سبب کچھ ریزروی ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''پتا ہے اویس یہ اجالا بڑی زبردست آرٹسٹ ہے۔ اس کے ہاتھ کے بنے اسکیچز دیکھو تو حیران رہ جاؤ مجھ سے تو اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ یہ میرا ایک شاندار سا پورٹریٹ بنائے گی۔''

وہ شاید اس کی جھجک محسوس کر گئے تھے اسی لیے ماحول میں بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس تعریف سے وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی تھی جبکہ وہ مسکرا کر بولا۔

''یہ آپ کا شوق ہے یا پروفیشن؟'' اس کے جواب دینے سے پہلے وہ دوبارہ بول اٹھے۔

''بھئی اس نے فائن آرٹس میں گریجویشن کر رکھا ہے اور بہت پروفیشنل قسم کی جینئس سی ٹیچر ہے یہ آرٹ اسکول میں پڑھاتی ہے خیر سے میری بیٹی۔''

انہیں شاید دوسروں کی تعریفیں کر کے انہیں آسمان پر چڑھانے میں بہت مزا آتا تھا اسی لیے دل کھول کر اس کی تعریف کر رہے تھے جبکہ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کچھ شرمندہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بارے میں بات ہونا چاہے وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہی کچھ پریشان سا کر دیا کرتی تھی۔ انہیں اچانک ایک خیال آیا تو بولے۔

''تمہیں میرے یہاں ایڈمٹ ہونے کا کیسے پتا چلا؟'' ان کے اس سوال پر ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں سامنے بیٹھے شخص کی طرف اٹھی تھیں پھر وہ پرسکون انداز میں بولی تھی۔

''میں آپ کے گھر گئی تھی۔ وہیں سے پتا چلا تھا۔'' اویس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا شاید وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

''اچھا تو تم گھر گئی تھیں۔ یعنی یہ کہ تم نے مجھے مس کیا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولے تو اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''پاپا جانی باتیں اپنی جگہ لیکن آپ پلیز ناشتا تو کریں۔'' وہ دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھاتا ہوا

بولا تو وہ بڑی بے دلی سے گلاس ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئے۔ انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کے دل کی تسلی ہوگئی تھی اس لیے اب اسے اپنا یہاں مزید رکنا بڑا بے محل محسوس ہو رہا تھا۔ ان دادا پوتے کی پرائیویسی میں مداخلت اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی اس لیے اپنا سائڈ میں رکھا ہوا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''اچھا انکل میں چلتی ہوں۔''

''اتنی جلدی، ابھی کچھ دیر تو اور رکو۔'' وہ بڑی بے ساختگی میں اس کا ہاتھ تھام کر بولے تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''مجھے کچھ کام ہے۔ میں ان شاء اللہ کل پھر آؤں گی۔'' وہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا تھا۔ اس کی معذرت کے جواب میں مجبوراً انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ کھڑی ہوگئی۔

''تم جاؤ گی کیسے؟'' ان کی فکر مندی پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں۔ جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''اچھا خدا حافظ۔'' اس کی بات پر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''بہت اچھا لگا تمہارا آنا بہت شکریہ۔'' وہ ان کے شکریہ کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سامنے موجود اس اخبار کے پیچھے چھپی شخصیت کی موجودگی اسے کھل کر کچھ کہنے نہیں دے رہی تھی اس لیے خاموشی پر اکتفا کرتے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ ایک دم اخبار رکھ کر کھڑا ہوگیا اور دروازے کے باہر تک اس کے ساتھ آتا ہوا بولا۔

''اللہ حافظ۔'' وہ حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جو کل ایک اکھڑ اور بد دماغ سا شخص محسوس ہوا تھا اور آج اتنا باادب اور مہمان نواز۔ اپنی حیرت کو چھپاتی وہ اسے اللہ حافظ کہتی کوریڈور میں آگے بڑھ گئی تھی۔

اگلے روز وہ ان سے ملنے شام کے وقت آئی تھی اور یہ دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ اکیلے تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ کل کی نسبت وہ آج ان سے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں بس یہ اویس کو وہم ہوگیا ہے کہ وہ بیمار ہوگئے ہیں۔

''بالکل باؤلا ہے یہ اویس ذرا سا بی پی کیا ہائی ہوا اس نے تہلکہ مچا دیا جیسے میں کتنا خطرناک بیمار ہوگیا ہوں۔ اصل میں مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے نا شاید اس لیے میرے لیے اتنی فکر کرتا ہے۔ اتنے دنوں سے میرے ساتھ لگا بیٹھا ہے۔ اس وقت بھی میں نے زبردستی گھر بھیجا ہے کہ جا کر تھوڑی دیر آرام کر کے آؤ۔ حالانکہ میں نے کتنا سمجھایا ہے کہ بچے اتنی جلدی اوپر جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے تمہارے بچوں کی بھی شادیاں کروانی ہیں۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق ہنسنے ہنسانے میں مصروف تھے۔ حالانکہ ان کے چہرے ہی سے کمزوری اور بیماری ظاہر ہو رہی تھی مگر شاید انہیں اپنی تکلیفوں کا اشتہار لگوانا پسند نہیں تھا اسی لیے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہے تھے۔ اس روز وہ ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ زبردستی یہاں سے ڈسچارج ہونے کا پروگرام بنا چکے ہیں اس لیے شاید وہ کل گھر چلے جائیں۔

''ریسٹ ہی تو کرنا ہے وہ میں گھر پر بھی کر سکتا ہوں۔'' وہ مطمئن انداز میں بولے تھے۔

اگلے روز اس ادھیڑ بن میں مصروف وہ فیصلہ ہی نہیں کر پائی کہ ان سے ملنے جائے یا نہ جائے۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوگئے ہیں یا نہیں۔ وہ دن تو یونہی گزر گیا۔ اس سے اگلے دن جمعہ تھا۔ اسی لیے وہ اسکول کی چھٹی جلدی ہونے پر گھر واپس آ رہی تھی۔ گاڑی گھر کی طرف موڑتے اسے خیال آیا کیوں نہ ان کے گھر پر معلوم کرلیا جائے کہ وہ واپس آگئے ہیں یا نہیں۔ اس سوچ کے ذہن میں آنے کی دیر تھی کہ وہ فوراً گاڑی ان کی گلی میں موڑ گئی۔ ان کے گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر اس نے چوکیدار سے ان کی موجودگی کی بابت دریافت کیا اور جواب اثبات میں آیا تو اس نے کہا۔

''اندر جا کر انکل کو بتا دیں کہ اجالا ملنے آئی ہے۔''

چوکیدار نے وہاں سے گزرتے کسی ملازم کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا اور اس سے بولا۔

''آپ اندر تشریف لے جایئے۔'' اس کی بات پر وہ گیٹ سے اندر داخل ہوگئی اور بغور ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ لان میں موجود پودوں کی بہتات سے وہ ابھی اچھی طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ملازم بھاگتا دوڑتا اس کی طرف آیا اور اس سے بولا۔

''آپ جلدی سے اندر چلیں وہ اتنے ناراض ہو رہے ہیں کہ آپ کو باہر کیوں کھڑا کیا ہوا ہے۔''

اسی ملازم کی ہمراہی میں وہ گھر کے مختلف حصوں سے گزرتی آخر کار لاؤنج میں سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر چڑھتی ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شاید اب خود ہی کمرے سے باہر نکلنے والے تھے اسی لیے کھڑے ہوئے نظر آئے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آؤ بیٹا بیٹھو۔'' اسے بٹھا کر وہ ملازم کی طرف متوجہ ہوئے۔

''صرف نام ہی کے اخلاق ہو ورنہ اخلاق اور تمیز چھو کر بھی نہیں گزری۔ بتاؤ ذرا اتنی دھوپ میں بچی کو باہر کھڑا کیا ہوا ہے۔'' ان کی ڈانٹ کھاتا وہ بے چارہ باہر جانے لگا تو وہ فوراً بولے۔

''میری بیٹی پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہے۔ بڑی اچھی سی خاطر تواضع ہونی چاہیے۔'' وہ انہیں منع کرنا چاہتی تھی کہ وہ صرف کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے آئی ہے مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں ہی نہیں تھے۔ اس نے جانے کے لیے زیادہ زور دیا تو بولے۔

''کیا گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟ اگر ایسی بات ہے تو یہاں سے فون کر کے بتا دو کہ تم میرے پاس ہو اور اب میرے ساتھ لنچ کر کے ہی جاؤ گی۔''

''میرے لیے کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ میں اگر سارا دن بھی گھر سے غائب رہوں تو کسی کو قطعاً کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وہ پہلی مرتبہ اپنی ذات کے حوالے سے ان سے کچھ بولی تھی۔ انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا صرف ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولے۔

''پھر تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تم اسکول سے سیدھی یہیں آ رہی ہو ایسا کرو منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔'' انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اتنے آرام سے موضوع بدل دیا کہ وہ حیران رہ گئی۔ وہ جتنا تکلف کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اسے اتنا ہی گھر کا فرد بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہیں ان کے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر اس نے ان کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ اسے اصرار کر کے مختلف چیزیں کھلا رہے تھے۔

''یہ بریانی لو، یہ چکن لو۔ اچھا سوئٹ ڈش تھوڑی اور لے لو۔'' ان کے اتنے اصرار پر مجبور اسے اپنی روٹین سے ہٹ کر کچھ زیادہ ہی کھانا پڑ گیا۔ وہ خود پرہیزی کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ دو تین گھنٹے کے ساتھ گزار کر جب وہ واپس جانے لگی تو وہ اس سے کہنے لگے۔

''میں تو اس بیڈ ریسٹ کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ اویس ہاسپٹل سے لانے پر صرف اس شر راضی ہوا تھا کہ میں گھر پر مکمل آرام کروں گا۔ اسی لیے آج کل پارک جانے پر بھی پابندی عائد ہے۔ تم آئی ہو تو بہت اچھا لگا ہے۔ کیا تم کل بھی آؤ گی؟''

وہ شاید تنہائی سے بری طرح گھبرا گئے تھے۔ اس نے بے اختیار ہامی بھر لی اور وہ بہت خوش ہو تھے۔

اگلے روز بھی وہ اسکول سے سیدھی یہیں آ گئی تھی۔ کل کی ڈانٹ پھٹکار کی وجہ سے اخلاق صاحب سچ مچ کے با اخلاق انسان بن گئے تھے اور اسے دیکھ کر مسکرا کر بولے تھے۔

''صاحب اپنے کمرے میں ہیں آپ وہیں چلی جائیں۔'' صاحب کے التفات سے اتنی بار وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اس لڑکی کی کیا حیثیت اور مرتبہ ہے۔ سیڑھیاں چڑھتی وہ اوپر پہنچی اور ان کے کمر کی طرف جانے کے لیے کوریڈور میں آگے بڑھی تب ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اویس باہر نکا اسے اتنے آزادانہ اور مالکانہ انداز میں کوریڈور میں پھرتے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا جبکہ وہ اس سامنے پا کر کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ اس نے خود ہی اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ وہ کل کی طرح آج بھی گھ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس کا گھر تھا اور وہ یہاں کہیں بھی اور کسی بھی وقت پایا جا سکتا تھا۔ اپنی بے تکلفی پر شرمساری ہوتی وہ بے اختیار رک گئی تھی۔

''السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟'' وہ اتنے عام سے انداز میں اس سے سلام دعا کرنے لگا جی یہاں آنا اس کے معمولات میں شامل تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کے منہ سے آواز بھی بڑی مری مری سی نکلی تھی۔ وہ ایک آدھ سیکنڈ اس چہرے کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

''پاپا جانی اپنے بیڈروم میں ہیں۔ یہ سامنے والا کمرہ ان کا ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے بتایا تو وہ فوراً اسی طرف بڑھ گئی۔ وہ شاید کہیں جا رہا تھا اس لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اسے دیکھ کر وہ حسب معمول بہت خوش ہوئے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے پاس گزار کر وہ واپ گھر آ گئی تھی۔ اگلے دن سے اس کے اسکول میں چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں اس لیے اس کا صبح کا ٹائم بھ فارغ ہو گیا تھا۔ صبح ناشتے اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کر وہ ان کے گھر چلی آئی۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ گھر پر اکیلے ہی ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر اس کے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ لنچ ٹائم تک وہ ان کے پاس رکی تھی۔ اس دوران انہوں نے اسے اپنی اسٹڈی بھی دکھائی تھی وہاں موجود کتابوں کا ذخیرہ دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ وہاں ایک سے ایک نادر اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ اس نے وہیں اسٹڈی میں بیٹھ کر انہیں ان کی من پسند کتاب پڑھ کر سنائی تھی۔ فلور کشن پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور بڑے غور و فکر سے اسے سن رہے تھے۔ ان کے

اصرار پر اس نے دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا تھا۔ اس دوران تین چار مرتبہ اویس نے فون کر کے ان کی طبیعت پوچھی تھی۔ وہ اپنے لیے اس کی بے قراری پر مسکراتے ہوئے اسے تسلی دیتے رہے تھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ پھر اس طرح روز ان کے پاس آنا جیسے ایک معمول سا بن گیا تھا۔

اتوار کے دن کے علاوہ وہ روزانہ صبح دس ساڑھے دس بجے ان کے پاس چلی آتی تھی۔ اس دوران اس کا کبھی بھی اویس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس کی موجودگی میں اس کا فون بہت مرتبہ آتا تھا۔ اسے اس طرح ان کے پاس آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس روز بھی وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اخلاق ان کے لیے ناشتے کے ٹرے سجائے چلا آیا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے کڑوا سا منہ بنایا اور بولے۔

''پی تو لیا تھا صبح میں نے دودھ، اب یہ ناشتے کی کیا تک بنتی ہے۔'' وہ بڑی عاجزی اور خوشامدانہ انداز میں ٹرے ان کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

''اویس بھائی کا چار بار فون آ چکا ہے کہ پاپا جانی نے ناشتا کیا یا نہیں۔ اگر آپ نے ابھی بھی ناشتا نہیں کیا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گے۔''

''ایک تو اس لڑکے نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ زبردستی اوٹ پٹانگ چیزیں کھلائے چلا جاتا ہے۔ صبح بھی مجھ سے ناراض ہو کر گیا تھا کہ میں اس کے سامنے ناشتا کیوں نہیں کر رہا۔'' وہ بڑی بے زاری اور ناراضی سے بول رہے تھے۔

''انکل وہ ٹھیک تو کہتے ہیں۔ آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ تھوڑا سا چکھ لیں۔ پلیز میری خاطر۔'' ان کا دیا مان اور محبت اس سے ایسے جملے بلوا گیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی کسی سے نہ کہے تھے۔

''یہ پھیکے بدمزا کھانے تو میں کسی کی خاطر بھی نہیں کھا سکتا۔ تنگ آ گیا ہوں میں یہ بدذائقہ اور پرہیزی چیزیں کھا کھا کر۔'' وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح روٹھے ہوئے انداز میں بولے تو وہ مسکرا دی اور بولی۔

''اچھا آپ مجھے بتائیں آپ کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں آپ کی پسند کے مطابق کھانا بنا کرلاؤں گی۔'' وہ انہیں کسی بچے کی طرح ڈیل کرنے لگی تو وہ کچھ حیرانی سے بولے۔

''تم بناؤ گی؟''

''کیا میں بناؤں گی۔ آپ نے کیا مجھے بالکل ہی پھوہڑ اور بدسلیقہ سمجھ لیا ہے۔ جلدی بتائیں کیا بناؤں۔'' وہ کھڑی ہو گئی تھی جیسے اب یہ مہم وہ سر کر کے ہی رہے گی۔

''مجھے ارہر کی دال چاول اچار کے ساتھ کھانا ہیں۔ خوب مرچوں والی دال جس پر اصلی گھی کا بگھار لگا ہوا ہو۔'' وہ منہ میں پانی بھرتے ہوئے بولے۔

''اور بعد میں اویس سے ڈنڈے کھاؤں کہ میرے پاپا جانی کو اصلی گھی اور اچار کیوں کھلایا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو وہ بھی مسکرا دیے اور کہنے لگے۔

''چلو اصلی گھی نہ سہی کورن آئل کا بگھار بھی چلے گا۔'' اخلاق چپ چاپ کھڑا ان کے مذاکرات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اخلاق کے ساتھ ہی کچن میں آ گئی۔ وہاں

موجود خانساماں نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا۔ گزشتہ چند روز سے گھر میں پابندی سے آتی اس ا
کا صاحب سے کیا رشتہ ہے یہ بات وہاں کے تمام ملازمین کے لیے سوالیہ نشان تھی۔ یہ گھر جس میں
عورت کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملازم بھی سارے مرد ہی تھے وہاں انہوں نے پہلی مرتبہ کسی لڑ
آتے دیکھا تھا۔ وگرنہ اس سے پہلے یہاں صرف بطور مہمان تھوڑی بہت دیر کو ہی خواتین یا لڑکیاں آ
دیکھی گئی تھیں۔ اخلاق اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ خانساماں سے چیزوں کے بارے میں پو
جلدی جلدی ہاتھ چلانے میں مصروف تھی۔ دال چڑھ گئی اور چاول اس نے چن لیے تو سوچا کہ اس
پکنے میں تو تھوڑی دیر لگے گی جبکہ وہ بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس خیال کے آنے پر وہ سوچنے لگی کہ ا
کیا دے۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد اس نے ان کے لیے گریپ فروٹ کا جوس نکالنے کا سوچا۔ وہ
پریس میں گریپ فروٹ کا جوس نکال رہی تھی جب اسے لاؤنج سے آتی آواز سنائی دی جو یقیناً اولیہ
تھی وہ اخلاق سے کہہ رہا تھا۔

"پاپا جانی نے کچھ کھایا؟" وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ پتا نہیں اس کی اپنے گھر میں اتنی بے تکلف
وہ پسند بھی کرتا ہے یا نہیں۔ اس شخص کے چہرے پر موجود تاثرات سے وہ کبھی بھی نہیں جان پائی تھی
اس کے لیے کس انداز سے سوچتا ہے۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ شاید اسے ناپسند ہی کرتا ہے۔

اخلاق سے کچھ کہتا وہ کچن کی طرف آ گیا تھا۔

"شاہد! پاپا جانی کے لیے کھانا نکالو میں ــــ" وہ بڑے مصروف انداز میں بولتا ہوا کچن
دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے حیرانی سے دیکھ
تھا۔ شاید اتنا بے تکلف مہمان اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے ا
کہ یہ گھر اجالا کا ہے وہ یہاں مہمان ہے۔ وہ اتنے استحقاق سے کچن میں ٹیبل کے پاس کھڑی ہوئی تھ
"السلام علیکم۔" وہ اپنے آپ بھی بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ مگر بہر حال اس نے سلام کر
میں پہل کر دی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" اس کے چہرے پر پھیلی شرمندگی دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھ
شاید توقع نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس وقت بھی گھر آ سکتا ہے اور اب اسے سامنے پا کر وہ بڑا گلٹی فیل کر
تھی۔

"خیریت سے ہیں آپ؟" وہ اس کی شرمندگی نظر انداز کر کے بڑے عام سے انداز میں
اس نے گردن ہلا کر اپنی خیریت سے آگاہ کر دیا تھا۔

اسے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اجا
کب سے اٹکی ہوئی سانس بحال کی تھی۔ ہارٹ بیٹ کو نارمل کرتی وہ جگ اور گلاس ٹرے میں رکھ
کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ انہیں جوس پلا کر وہ فوراً گھر سدھارے گی۔ بغیر د
نوک کیے وہ آرام سے اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا میری قسمت میں ہمیشہ ہی اس شخص کے سامنے شرمندہ ہونا لکھا گیا ہے۔ کیا سوچ رہا
کہ میں کتنی ال مینرڈ اور ان کلچرڈ لڑکی ہوں۔" وہ اپنے بے ڈھنگے پن کو کوس کر رہ گئی تھی۔ وہ دونو
میں کوئی بات کر رہے تھے۔ اسے ایک دم اندر آتا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے تم بھی دشمنوں کے کیمپ میں شامل ہو گئی ہو۔" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے دیکھ کر
اضی سے بولے تو وہ احتجاجاً چیخ اٹھا۔

"یہ دشمنوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"میں کوئی تم سے ڈرتا ہوں اچھی بھلی میری بیٹی کو بھی پتا نہیں کیا پٹیاں پڑھائی ہیں کہ گھنٹے بھر سے
ن میں جتی ہوئی تھی۔" وہ اس تمام گفتگو سے بے نیاز ان کے سامنے ٹرے رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اور وہ دال چاول کیا ہوئے؟" انہوں نے برا سا منہ بنا کر اس سے دریافت کیا۔

"وہ ابھی پک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اور لگے گی۔" اسے سامنے پا کر وہ بڑے رسمی سے انداز میں
ں جواب دے کر اپنے ہاتھوں پر نظریں جما کر بیٹھ گئی۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے
ں جوس پلاتی۔

"صرف تمہاری وجہ سے یہ پی رہا ہوں۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔" وہ خفا
سے انداز میں بولتے گلاس میں جوس ڈال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ وہ اس جادو اثر لڑکی کو دیکھ کر رہ
یا تھا جو اتنے آرام سے وہ کام سرانجام دے گئی تھی جسے کرنے میں وہ صبح سے ناکام تھا۔

"آپ کو یاد ہے نا آج ڈاکٹر بخاری سے اپائنٹمنٹ ہے۔ میں اپنے کمرے میں ہوں آپ تیار
جائیں تو مجھے بلوا لیجیے گا۔" انہوں نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے بے توجہی سے اس کی بات سنی تھی
۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی اب جو ان کے جانے کا سنا تو
ا کے کمرے سے نکلتے ہی خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حالانکہ اسے مزید رکنے کے لیے مجبور کر رہے تھے
ر اس نے سہولت سے معذرت کر لی تھی۔ جانے سے پہلے دال بگھار کر اور شاہد کو بتا کر کہ انکل کو تھوڑی
بعد دال چاول کھلا دینا وہاں سے چلی آئی۔

اگلے دو روز وہ ان سے ملنے نہیں آئی اور صرف فون کر کے ہی ان سے بات چیت کر لی۔ حالانکہ وہ
ی تھی کہ وہ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے وہ خود بھی تو ان سے ملنے اور باتیں کرنے کی اتنی عادی ہو گئی
ا کہ ان سے ملے بغیر وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر وہاں موجود وہ قدرے مغرور اور اکھڑ سا بندہ
ا کے وہاں جانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ شاید اپنے پاپا جانی کے لحاظ میں اسے کچھ
تا تو نہیں تھا مگر اجالا کو اندازہ تھا کہ وہ ایک غیر اور انجان لڑکی کا اتنے بے تکلفانہ انداز میں اپنے گھر آنا
نہیں کرتا۔ اور کسی کے گھر ناپسندیدہ اور زبردستی کا بن بلایا مہمان بن کر جانا اسے بڑا آکورڈ سا لگ رہا
اور جو کسی روز وہ تمام تر لحاظ اور مروت ایک طرف رکھ کر اس سے کہہ دے کہ محترمہ آپ ہمارا پیچھا چھوڑ
ں سکتیں تو وہ تو شرم اور غیرت کے مارے شاید مر ہی جائے۔

مگر تیسرے ہی دن وہ اپنے عہد سے پھر گئی کہ اب وہاں نہیں جانا اور دوبارہ سے ان کے گھر جانے
ے لیے تیار ہونے لگی۔ اسے پتا تھا کہ ان دنوں وہ اپنی بیماری کے ہاتھوں تنگ آ کر بڑے ڈپریس سے
ہنے لگے تھے اور ان کی اداسی وہ ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اور دل سے
ا کے لیے بہت کم مسالے اور ہلکا سا نمک ڈال کر حلیم بنایا۔ ان کے پرہیز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس
ے مرغی کا گوشت استعمال کیا۔ ڈونگے میں حلیم کے اوپر خوب اچھی طرح ہرا دھنیا اور لیموں وغیرہ سجا کر
فارغ ہوئی تو خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کر لیتی ہوں وہ اکیلے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ بھی ہوا تو ڈرائیور

کے ہاتھ حلیم بھجوادوں گی۔ ممی نے اسے کچن میں مصروف دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا۔
''کیا پکا رہی ہو؟'' عرصہ ہوا وہ گھر اور گھر سے متعلق تمام امور سے لاتعلق ہو چکی تھی۔
سرسری سے انداز میں جواب دیا تو وہ جو شاید سعود کے لیے کچھ پکانے آئی تھیں اپنے کام میں مص
ہو گئیں۔ وہ فون کرنے کے لیے لاؤنج میں آ گئی۔ تیسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا تھا۔ اخلا
آواز وہ اچھی طرح پہچان گئی تھی۔
''میں اجالا بول رہی ہوں۔'' اس کے استفسار پر وہ بولی تھی۔
''کیسی ہیں آپ؟ صاحب آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔''
اتنے دن سے وہ ان کے گھر مستقل آ جا رہی تھی اسی لیے وہ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بڑی اپنا
سے اس سے بول رہا تھا یا پھر شاید گھر کے مالک کی اس والہانہ محبت اسے بتا گئی تھی کہ وہ کوئی عام سی لڑ
نہیں ہے۔
''انکل ہیں گھر پر؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے مطلب کی بات کیسے پوچھے۔
''ہاں وہ گھر پر ہی ہیں۔ آپ بات کریں گی کیا ان سے؟''
''اویس بھی ہیں گھر پر۔'' اس نے لہجے کو بڑا سرسری سا بنا کر پوچھا جیسے یہ بات وہ یونہی ا
پوچھ بیٹھی تھی۔
''اویس بھائی تو کہیں گئے ہوئے ہیں آپ کو کیا ان سے کوئی کام ہے؟'' لاؤنج کا دروازہ کھ
اندر آتا اویس اپنا نام سن کر رک گیا۔ اس وقت اس کا کوئی بھی کال اٹینڈ کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھ
لیے دور کھڑا ہو کر صرف یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ کہیں کوئی ضروری فون نہ ہو۔ دوسری طرف یا
کون تھا جس سے وہ بڑی خوش اخلاقی سے کہہ رہا تھا۔
''اچھا آپ آ رہی ہیں۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ صاحب خوش ہو جائیں گے۔ اللہ حافظ''
وہ فون رکھ کر مڑا تو اویس کو کھڑا دیکھ کر سلام کرتا ہوا غالباً اندر پاپا جانی کو اس کی آمد کے بارے میں بتا
کے لیے چلا گیا۔ اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ فون کس کا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت م
کپڑے چینج کرنے گھر آیا تھا اسے جم خانہ جانا تھا۔ مگر اپنا جانے کا پروگرام فی الفور ملتوی کر کے وہ
لاؤنج میں بیٹھ گیا۔
وہ اپنے بارے میں بڑا خود آگاہ تھا۔ اسے پتا تھا کہ لوگ اسے مغرور کہتے ہیں۔ کتنے لوگ اس
بات کرنے اور اس کے قریب آنے کے لیے ہزاروں جتن کرتے ہیں اور وہ انہیں منہ بھی نہیں لگا
اپنے پاپا جانی اور قریبی دوستوں کے علاوہ اس کا دیگر تمام افراد کے ساتھ ایسا رویہ ہوتا تھا جیسے وہ ان
بات کر کے کوئی بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ وہ عام طور پر لوگوں سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔
لڑکی اجالا شہریار جو اس کے پاپا جانی کو بڑی عزیز ہو گئی تھی اس کے لیے وہ اپنے تمام اصول اور ضا
ترک کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ دیگر افراد کی طرح شاید وہ بھی اسے مغرور اور خود پرست سمجھتی
شاید وہ خود بھی دوسروں سے لیے دیے رہنا اور کم بات چیت کرنا پسند کرتی ہے اسی لیے اس سے
ہونے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ وہاں اس کی موجودگی میں آنے سے پرہیز کر رہی تھی۔ اس
اب تک کی زندگی میں صرف لڑکیوں کو اپنے پیچھے بے وقوفوں کی طرح منڈلاتے دیکھا تھا۔ شاید

ان سب سے مختلف تھی اور اس کی یہ غلط فہمی کہ وہ اس کی یہاں آمد کو پسند نہیں کرتا وہ اسے دور کر دینا چاہتا
اگر اس کے پاپا جانی اس لڑکی سے محبت کرتے تھے اس کے ساتھ وقت گزارنا انہیں اچھا لگتا تھا تو وہ
کون ہوتا تھا اعتراض کرنے والا۔ وہ تو الٹا اس کا شکر گزار تھا کہ وہ یہاں آ کر ان کو کمپنی دیتی ہے ان کا
پریشن کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔
ٹھیک دس منٹ بعد وہ لاؤنج کا سلائڈنگ ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس
کی نظر صوفے پر بیٹھے اویس پر پڑی تو وہ دل ہی دل میں اخلاق کو گالیاں دیتی آگے بڑھی۔ آ گئی تھی تو
واپس تو جایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اخلاقاً کھڑا ہوتا ہوا بولا۔
''السلام علیکم۔'' اس نے بڑی بے دلی سے سلام کا جواب دیا۔
''آپ بیٹھیے پاپا جانی کے کسی دوست کا فون آیا ہوا ہے وہ اس میں بزی ہیں۔'' وہ بڑی نرم سی
مسکراہٹ چہرے پر لاتا ہوا بولا۔ اسے مجبوراً صوفے پر بیٹھنا ہی پڑ گیا۔ اسے بٹھا کر وہ خود بھی سامنے بیٹھ
گیا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑا اڈونگا اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ
وہ کچھ الجھی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھی۔
''میں اتنے دنوں سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا لیکن اتفاق سے آپ سے ملاقات نہیں ہو
رہی تھی۔''
وہ تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔
''آپ پاپا جانی کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ انہیں اتنا ٹائم دیتی ہیں۔ ظاہر ہے آپ کی اس مہربانی پر
مجھے آپ کا شکریہ تو ضرور ہی ادا کرنا چاہیے تھا۔'' وہ اتنے بھاری بھرکم تشکرانہ الفاظ پر بوکھلا کر رہ گئی۔ لیکن
اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ کہنا بھی ضروری تھا اس لیے کچھ نروس سے انداز میں بولی۔
''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ پلیز اس ذکر کو رہنے دیجیے۔''
''آپ کہہ رہی ہیں تو رہنے دیتا ہوں ورنہ یہ آپ کا میرے اوپر احسان ہی ہے۔ پہلے میں آفس
میں بیٹھ کر پاپا جانی کی طبیعت کی طرف سے پریشان رہتا تھا اب آپ کے ہونے سے تسلی رہتی ہے کہ وہ
اکیلے نہیں ہیں۔'' وہ کچھ شرمندہ سی سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔
''ہم لوگوں کی اس سے پہلے آپس میں اتنی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود
پاپا جانی کی بدولت میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ جب سے آپ انہیں ملی ہیں ان کے
پاس آپ کے علاوہ بات کرنے کے لیے کوئی ٹاپک ہی نہیں ہوتا۔ اجالا یوں کرتی ہے وہ اسکیچز بھی اچھے
بناتی ہے۔ اسے کوکنگ بہت اچھی آتی ہے۔ وہ بڑی نرم دل اور ہمدرد ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے جملے
میرا خیال ہے میں روز ہی سنتا ہوں۔'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں مسکرا کر بول رہا تھا۔ اس کی بات پر
ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لہرائی تھی۔
''مجھ سے بھی وہ آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ پہلے جب میں ان سے
پارک میں ملا کرتی تھی اس وقت بھی آپ کا غائبانہ تعارف تھا۔'' وہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر
دھیمے سروں میں بولی تھی۔
''اس غائبانہ تعارف میں یقیناً میری خوب تعریفیں ہی ہوتی ہوں گی۔ بقول میرے دوستوں کے

میرا دماغ انہیں الٹی سیدھی تعریفوں نے خراب کیا ہے۔“
وہ بڑی شگفتگی سے مسکرا کر بولا۔ وہ ابھی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی
سیڑھیاں اترتے نظر آئے۔
”کل کہاں تھیں بے وفا لڑکی۔ میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔“ وہ دور ہی سے بولتے ہوئے ز
آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
”لگتا ہے تم مجھ سے بور ہوگئی ہو۔“
”نہیں انکل ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میں کچھ بزی تھی اس لیے نہیں آسکی تھی۔“ وہ ایک
بوکھلا کر وضاحت کرنے لگی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہ خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
”اس میں کیا ہے؟“ ان کی نظر ٹیبل پر رکھے ڈونگے پر پڑی تو پوچھنے لگے۔
”میں آپ کے لیے حلیم بنا کر لائی ہوں۔“ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
”حلیم لائی ہو۔ زبردست، لیکن یہ میرے کھانے پینے کا دشمن مجھے کبھی بھی حلیم نہیں کھانے
گا۔ اسے تو ہر بات میں کولیسٹرول اور کیلوریز کا غم ستاتا رہتا ہے۔“ وہ کچھ مایوسی سے بولے۔
”نہیں میں نے اس میں چکنائی وغیرہ بالکل نہیں ڈالی۔ آپ آرام سے کھا سکتے ہیں۔“ ا
بات پر وہ خوش ہوتے ہوئے بولے۔
”ایسی بات ہے تو لاؤ ابھی کھا کر دیکھا جائے تم نے کیسا حلیم پکایا ہے۔“ اخلاق کی تلاش
نظریں دوڑاتے وہ اسے موجود نہ پا کر اس سے بولے۔
”ذرا بھاگ کر کچن سے ایک پلیٹ اور چمچہ تو لے آؤ۔“ اویس مسکراتا ہوا پاپا جانی کی بے تابی
رہا تھا۔
”جلدی لے آئیں ورنہ یہ اسی میں شروع ہو جائیں گے۔“ وہ اس کے بدلے ہوئے ب
انداز پر دل بھر کر حیران ہوتی کچن سے پلیٹ چمچہ لے آئی۔ پہلا چمچہ منہ میں ڈالتے ہی انہوں نے
شان میں قصیدہ خوانی شروع کر دی تھی۔ حلیم کی شان میں زمین آسمان ایک کیے جا رہے تھے اور وہ
چاپ بیٹھی انہیں کھاتا دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔
”تم جم خانہ نہیں گئے۔“ انہیں اچانک اس کا دھیان آیا تو پوچھنے لگے۔
”کچھ تھکن ہو رہی ہے اس لیے پروگرام کینسل کر دیا ہے۔“
”شاہد ذرا اچھی سی کافی تو پلواؤ۔“ انہیں جواب دے کر وہ شاہد کو آواز دینے لگا۔
”شاہد کو رہنے دو۔ آج ہمیں ہماری بیٹی کافی بنا کر پلائے گی۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ
ہوئے اویس سے مخاطب ہوئے تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔
”ان سے پوچھ تو لیں کہیں وہ مائنڈ نہ کر جائیں کہ ہمارے ہاں مہمانوں سے کام کروایا جاتا
”مہمان کیوں ہوئی یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ کیوں اجالا کیا تم اسے اپنا گھر نہیں سمجھتیں۔“ ا
وقت بہت بری پھنسی تھی۔ انکل تو اس سے ہمیشہ ہی اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے مگر وہ اس کی مو
کے سبب بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ کافی بنانے کے لیے کھڑی ہو
وہ دونوں ہی شاید اس کی بوکھلاہٹ اور نروس ہونے کو محسوس کر گئے تھے اس لیے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کافی بنا کر وہاں آئی تو وہ آپس میں گفتگو میں مشغول تھے۔ ان دونوں کو کپ سرو کر کے وہ اپنا کپ لے کر انکل کے برابر میں بیٹھ گئی۔ کافی کا سپ لیتا وہ ان سے مخاطب ہوا۔
”میں آپ کو بتانا تو بھول ہی گیا۔ ویزا مل گیا ہے۔ اب آپ ڈسائڈ کر لیں کہ کب چلنا ہے۔“
اس کی بات پر وہ ایک دم خوش ہو اٹھے تھے۔
”دیر کس بات کی ہے۔ میں تو ابھی تیار ہوں۔ تم اپنی سہولت دیکھ لو، اسی حساب سے سیٹس کنفرم کروالو۔“ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہاں جانے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ خود ہی اسے بتانے لگے۔
”ہم دادا پوتا ہر سال کہیں نہ کہیں گھومنے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ میں اس کے پیچھے لگا رہتا ہوں اور یہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال مٹول سے کام لیتا رہتا ہے اور پھر آخر کار سو نخروں کے بعد کہیں یہ حضرت اویل ایبل ہوتے ہیں۔ اس بار صورت حال کچھ ڈفرنٹ ہے۔ انہیں کیونکہ وہم ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی طبیعت کے پیش نظر تبدیلی آب و ہوا کی شدید ضرورت ہے اس لیے میرے کہے بغیر خود ہی پروگرام ارینج کر لیا۔ پیرس، روم اور لندن تو پہلے ہی ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ واپسی میں آتے ہوئے عمرہ بھی کر لیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس کا ویزا بھی فوراً ہی مل گیا۔“ ان کی وضاحت پر وہ کچھ بجھے ہوئے انداز میں بولی۔
”کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں آپ؟“
”کم سے کم ایک مہینہ تو ضرور لگے گا۔“ وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر کہنے لگے۔
”اچھا تم یہ بتاؤ وہاں سے تمہارے لیے کیا لاؤں۔“ وہ شاید اسے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اویس کافی کا کپ ہاتھ میں لیے بڑی فرصت سے اس کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔ اس نے انکار میں گردن ہلا دی تو وہ کہنے لگے۔
”ٹھیک ہے پھر میں اپنی مرضی سے جو بھی لے آؤں چپ چاپ رکھ لینا یہ مت کہنا کہ یہ چیز تو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“ اسی وقت اویس کے موبائل کی بیل بجی تھی وہ ایکسکیوز کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

اس کے رویے سے کچھ حوصلہ ملا تھا اسی لیے وہ اگلے دن دس بجے ان کے گھر آ گئی تھی۔ وہ خود تو گھر پر موجود نہ تھا انکل البتہ گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ کل رات بارہ بجے کی فلائٹ سے وہ لوگ روم جا رہے ہیں پھر وہاں سے پیرس، لندن اور آخر میں جدہ۔ ان کی بات پر وہ بہت اداس ہو گئی تھی۔ ان سے اتنے دن کی جدائی کا سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اگلے دن اس نے انہیں فون پر ہی اللہ حافظ کہہ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان کے سامنے جا کر رو پڑے گی اور وہ اس کے رونے پر حیران ہوں گے ان کے گھومنے پھرنے کے لیے کہیں جانے پر رونے کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف سے گزر رہے تھے۔ وہ جوان سے روز ملنا ایک روٹین سا بن گیا تھا اب ان

کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ایک مہینہ پورا ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی نہیں آئے ہیں۔ پھر وہ روز ہی فون کر کے معلوم کرتی اور ہر روز ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یونہی کرتے دس روز مزید گزر گئے تھے۔ صرف ایک مہینہ اور دس دن ان کے بغیر صدیوں کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ ناشتے کے بعد بے دلی سے اپنے کمرے میں لیٹی وقت گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت حمیدہ نے اطلاع دی تھی کہ اس کا فون ہے۔ وہ اندازے لگاتی کہ کس کا فون ہو سکتا ہے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ دوسری طرف انکل کی آواز سن کر وہ خوشی کے مارے چیخ اٹھی تھی۔

''اتنے دن لگا دیے آپ نے میں آپ کو اتنا یاد کر رہی تھی۔'' دوسری طرف وہ حیران ہو کر کہہ رہے تھے۔

''اتنے زیادہ دن تو نہیں لگے۔ صرف ایک مہینہ اور دس دن زیادہ تو نہیں ہوتے۔''

''آپ کے لیے نہیں تھے میرے لیے زیادہ تھے۔ آپ کا کیا ہے آپ تو وہاں گھوم پھر رہے تھے انتظار میں تو میں سوکھ رہی تھی۔'' وہ اس کے روٹھے لہجے پر بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

''مجھے کیا پتا تھا میری بیٹی اتنی شدت سے مجھے یاد کر رہی ہے ورنہ میں اور جلدی آ جاتا۔ خیر یہ بتاؤ تم مجھ سے ملنے یہاں آ رہی ہو یا میں تمہارے گھر آ جاؤں؟''

''میں آ رہی ہوں، ابھی فوراً۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔ انہیں اللہ حافظ کہتے ہی وہ فوراً ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اور اس کے گھر کے درمیان مشکل سے دس منٹ کا واکنگ ڈسٹنس تھا۔ ابھی اس نے تیز قدموں سے طے کیا تو تین چار منٹ کے اندر ہی ان کے گھر پہنچ گئی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور اویس فلور کشن پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انگریزی اور اردو کے تین چار اخبارات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''کیا اسپیڈ ہے بھئی ابھی تو پاپا جانی نے کارڈلیس رکھا ہی تھا کہ آپ پہنچ بھی گئیں۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''ویسے آپ دونوں ہی کا ایک سا حال ہے۔ یہ پاپا جانی رات کو بارہ بجے آتے کے ساتھ ہی آپ کو فون کھڑکانے والے تھے وہ تو میں نے روک دیا کہ ان شاء اللہ صبح بھی ہو گی۔ کسی کے گھر فون کرنے کا یہ بڑا ہی اوڈ ٹائم ہے۔'' اس کی بات پر پاپا جانی جو اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا رہے تھے بول پڑے۔

''تم کیوں جل رہے ہو۔ ہماری محبت ہے۔'' اسے فارغ کر کے وہ اجالا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کیسی ہے میری بیٹی۔ کچھ کمزور سی لگ رہی ہو کیا بات ہے۔'' وہ ان کی فکرمندی پر مسکرا دی اور تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کا ٹور کیسا رہا؟''

''ٹور ایک دم شاندار رہا ہم دونوں دادا پوتا خوب گھومے۔ لندن میں تو کچھ رشتے دار اور دوست احباب رہتے ہیں ان سے ملنا ملانا رہا۔ وہاں اتنی کوئی خاص تفریح نہیں ہوئی البتہ روم اور پیرس ہم نے فرصت سے گھوما۔'' وہ اسے اپنے دورے کی تفصیل سنانے لگے تھے۔

''آپ تو اس سے پہلے بھی وہاں بہت مرتبہ گئے ہوئے ہوں گے۔'' وہ بڑے شوق سے دریافت کرنے لگی۔

''ہاں روم تیسری مرتبہ اور پیرس چھٹی مرتبہ گیا ہوں میں۔ سب سے پہلی دفعہ پیرس اپنی یونیورسٹی کے دنوں میں گیا تھا اور وہ شہر مجھے اتنا اچھا لگا تھا کہ شادی کے بعد ہنی مون کے لیے میں اور صبیحہ پیرس ہی گئے تھے۔'' وہ کسی تصور میں کھوئے اسے بتا رہے تھے۔ اویس ان دونوں کو باتوں میں مگن دیکھ کر دوبارہ اخبار میں غرق ہو گیا تھا۔

''اخلاق میرے کمرے میں جو بلیک کلر کا شو پر رکھا ہے وہ لے کر آؤ۔'' انہوں نے اخلاق کو با آواز بلند آواز دی اور وہ سر ہلاتا کمرے کی طرف چلا گیا تو وہ اس سے کہنے لگے۔

''اخلاق بتا رہا تھا کہ تم روزانہ فون کر کے پوچھتی تھیں ہم لوگوں کے بارے میں۔''

''ہاں آپ نے اتنے دن جو لگا دیے۔ ایک مہینے کا کہہ کر گئے تھے۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''اصل میں ارادہ تو خالی عمرہ کر کے واپس آ جانے کا تھا پھر میں نے سوچا کہ پندرہ دن کا ویزا مکمل استعمال کرنا چاہیے قسمت والے ہوتے ہیں وہ جنہیں اللہ اپنے در کی حاضری نصیب کرتا ہے۔ اس لیے پروگرام سے ہٹ کر یہ اضافی دن مکہ مدینہ میں گزر گئے۔'' اسی وقت اخلاق نے ایک بھاری بھرکم شو پر لا کر ان کے سامنے رکھا۔

''اجالا کے لیے لائم جوس اور میرے لیے ایک کپ گرما گرم کافی کا جلدی سے لے کر آؤ۔'' وہ بیگ میں سے سامان نکالتے ہوئے اس سے بولے۔

''یہ پرفیومز میں نے تمہارے لیے پیرس سے خریدے ہیں اور یہ پینٹنگ بطور خاص تمہارے لیے وینس سے خریدی ہے۔ ہم لوگ دو دن کے لیے وینس بھی گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ آرٹسٹ بندی ہے اس لیے کسی نادر و نایاب پینٹنگ سے بڑھ کر کوئی اور تحفہ کیا ہو گا اور یہ چین لندن سے خریدا تھا۔ اب پتا نہیں یہ چیزیں تمہیں اچھی لگی بھی ہیں یا نہیں بہرحال۔ میں نے سوچا تم دوسری لڑکیوں کی طرح کاسمیٹکس اور جیولری تو زیادہ استعمال کرتی بھی نہیں ہو۔ اس لیے اس قسم کی کوئی چیز نہیں لی۔''

وہ اتنے زیادہ قیمتی تحائف قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

''انکل آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ لیکن یہ سب بہت زیادہ ہے۔ بس ایک آدھ چیز کافی تھی۔'' وہ انہیں انکار کرنا بھی چاہ رہی تھی اور کرتے ہوئے ڈر بھی رہی تھی کہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں یہ چیزیں پسند نہیں آئیں۔'' وہ جان بوجھ کر اس کی بات کو غلط رنگ دینے لگے تو وہ بے اختیار بولی۔

''سب چیزیں بہت اچھی ہیں لیکن۔۔۔''

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر خفگی بھری انداز میں بولے۔

''میں تمہیں صرف بیٹی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں اور تم میرے ساتھ غیریت برت رہی ہو۔ یہ اویس بھی تو ہے۔ تمہاری طرح اس کے لیے بھی میں نے پرفیومز خریدے بلکہ اس نے ضد کر کے مجھ سے پیسے بٹورے، تمہارے ہی جیسا چین اس کے لیے بھی لیا۔ اس نے تو مجھ سے کوئی بھی چیز لیتے ہرگز تکلف

نہیں کیا تم کیا اس سے بھی بڑی ہوگئی ہو۔" ان کی ناراضی سے سہم کر وہ جلدی سے بولی۔

"آپ ناراض تو مت ہوں آئم سوری۔"

"آئندہ اگر تم نے میرے ساتھ غیروں والی بات کی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔" اویس ا تمام بات چیت سے بے نیاز اخبار میں کھویا ہوا تھا۔ اخلاق نے ٹرے لا کر سامنے رکھی تو اس نے ل جوس کا گلاس اٹھالیا۔

"مدینہ میں ایک اتنا خوب صورت گولڈ کا بریسلٹ خریدتے خریدتے رک گیا۔ حالانکہ تمہارے ہاتھ میں بہت اچھا لگتا۔ لیکن میں نے تمہیں کبھی جیولری پہنے ہوئے دیکھا ہی نہیں اس لیے سو کہ شاید تم پسند نہیں کرتیں۔" وہ کافی پیتے ہوئے بولے۔

"نہیں مجھے الجھن سی ہوتی ہے۔ اگر کبھی کہیں آنے جانے کے لیے پہن بھی لوں تو سخت کوفت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سا وزن میرے اوپر لدا ہوا ہے۔ سانس گھٹنے لگتی ہے۔" وہ اپنے سا رہنے کی وجہ بتانے لگی تو وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

"اویس میں تم سے کہہ رہا تھا نا اس کی ہر بات سبین جیسی ہے۔ وہ بھی اسی کی طرح میک اپ ا زیورات سے بے زار رہا کرتی تھی۔" انہوں نے اویس کو مخاطب کیا تو وہ اخبار پر سے سر اٹھا کر اس طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دوبارہ اپنی نظریں اس پزل کی طرف گاڑ دیں جسے وہ حل کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر وہ کچھ بے مزا سے ہوئے۔

"یہ لڑکا کبھی نہیں سدھرے گا۔" انہوں نے دل میں سوچا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ دوبا اجالا سے مخاطب ہوئے۔

"صبیحہ تو سخت چڑا کرتی تھی سبین کی اس عادت سے۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھی۔ اگر کبھی کہنے سننے کچھ پہن بھی لیا تو تھوڑی دیر بعد ہی سب اتار کر بیٹھی ہوئی ہوتی تھی۔ بالکل تمہاری طرح دھلے ہو۔ منہ سے رہا کرتی تھی۔"

"انہیں تیار ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سجا سنوار کر اور خوب تیار کر کے ا دنیا میں بھیجا تھا ان مصنوعی سہاروں کی انہیں بالکل بھی حاجت نہیں تھی۔"

وہ سامنے دیوار پر لگی اس تصویر پر جس میں ایک بے حد حسین لڑکی ایک نہایت خوبرو مرد کے سا کھڑی تھی نظریں جما کر بولی۔ ہر بار ان کے گھر آ کر اس تصویر کو دیکھ کر وہ یہی سوچا کرتی تھی کہ شاید ا ہی جوڑے کو چاند سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ وہ دونوں حسن و خوب صورتی کا مجموعہ تھے۔ ایک پرفیکٹ کپل۔

"تمہارے سادگی سے رہنے کی بھی کیا یہی وجہ ہے۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولے تو وہ جھینپ کر رہ گئی۔

"میں اپنی بات تو نہیں کر رہی تھی۔ میں تو عادتاً ہی ایسی ہوں۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی تو کہنے لگے۔

"کیوں تمہارے خیال سے کیا تم خوب صورت نہیں ہو؟" انہوں نے ذرا سی بات کا ایشو بنا بحث کو طویل کر دیا تھا۔ وہ ایک نظر اویس پر ڈال کر جوان لوگوں سے یکسر بے نیاز اور بے گانہ محسوس ہو

تھا بولی۔

"اللہ کا شکر ہے اس نے تمام چیزوں کے ساتھ بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو تو حسن کا مجسمہ بنا نہیں سکتے تھے۔ کچھ لوگوں کو تو میرا جیسا بھی ہونا تھا بڑا عام سا۔" اس کی بات پر وہ تاسف سے گردن ہلا کر بولے۔

"لڑکی تم انکساری سے کام لے رہی ہو تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے اپنی خوبصورتی کا۔" ان کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"آپ کو تو میں پیاری لگوں گی ہی۔" وہ ان کی بات کو انجوائے کرتے ہوئے بولی تھی۔

"کیوں تم خود کس کو پیاری لگنا چاہتی ہو؟ کون ہے وہ جس کے تعریف کرنے پر تمہیں اپنی خوب صورتی کا یقین آئے گا۔"

وہ بڑے صاف گو بلکہ کسی حد تک منہ پھٹ بھی ہیں یہ بات وہ جانتی تھی لیکن اس حد تک ہوں گے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس وقت ان کی اس بات پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھی۔

سامنے بیٹھے بندے نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب بڑے غور سے اس کا سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے سر جھکائے ہوئے بھی پتا تھا کہ وہ دونوں ہی بڑی فرصت سے اس کے چہرے کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اس قسم کی صورت حال کا سامنا اسے زندگی میں پہلی مرتبہ کرنا پڑ رہا تھا اور وہ سخت نروس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت سے جلد سے جلد پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ اس طرح کی باتیں تو اس نے کبھی اپنی دوستوں میں بیٹھ کر بھی نہیں کی تھیں کہاں کہ دو عدد مردوں کے سامنے۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ کپ اور گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس کچن میں رکھ آئے اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی سے ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"انکل آپ کے لیے کافی اور لاؤں؟" وہ جو ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے اسے شوخ نظروں سے دیکھ رہے تھے بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"نہیں رہنے دو۔" اس کی حالت پر شاید انہیں ترس آ گیا تھا اس لیے قہقہہ مختصر کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور وہ جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ کچن میں آ کر دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پی کر اس نے اپنے حواس بحال کیے اور پھر وہیں کھڑے ہو کر دو چار منٹ گزار دیے۔ کچھ دیر بعد وہ لاؤنج میں واپس آئی تو خود کو کسی حد تک نارمل کر چکی تھی۔

"اچھا انکل میں چلتی ہوں۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے ان سے بولی تو وہ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں مجھے گھر جا کر اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ بہت سے کام نبٹانے ہیں۔ اور ویسے بھی میں نے تو ناشتہ ہی اتنا لیٹ کیا تھا لنچ تو شاید ہی کروں۔"

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ بھوک نہیں ہے تو کوئی بات نہیں خالی ہمارا ساتھ دینے کے لیے بیٹھ جانا۔" وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

''انکل دیر ہو جائے گی۔ سچ مجھے بہت کام ہے۔''

اویس شاید اخبار پڑھ چکا تھا اسی لیے اب فرصت سے بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

''ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ تم بہانے بازی کر رہی ہو لیکن پھر بھی مان لیتا ہوں کہ تمہیں جلدی ہے لیکن کھانا تو تمہیں پھر بھی کھانا پڑے گا۔'' اس سے کہتے انہوں نے شاہد کو آواز دے کر کھانا لگانے کے لیے کہا۔

''تمہاری خاطر آدھا گھنٹہ پہلے ہی لنچ کر لیتے ہیں۔'' وہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

اویس اس کی بے بسی پر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ وہ اسے اصرار کر کے مختلف چیزیں پیش کرنے لگے تو وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آپ نے کہا تھا خالی ساتھ دینے کے لیے بیٹھ جانا۔'' اس کی بات پر اویس بڑی سنجیدگی کے ساتھ پاپا جانی سے مخاطب ہوا۔

''یہ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ کو اپنے کہے لفظوں کا احترام کرنا چاہیے۔'' اجالا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی سنجیدگی سے سلاد کھاتا پاپا جانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا یا یونہی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاد ڈال کر انکل کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ کھانا کھا کر وہ فوراً ہی گھر لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

انکل نے واپس آنے کے بعد دوبارہ پارک آنا شروع کر دیا تو اس نے بھی اپنی سابقہ روٹین بحال کر لی۔ اب وہ دونوں پھر پہلے کی طرح روزانہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ واک کرتے اور دنیا جہاں کے موضوعات پر دل کھول کر اظہار خیال کیا جاتا۔ اسے ان کے گھر گئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ جب انکل سے پارک میں ملاقات ہو جاتی تھی تو پھر گھر جانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ وہ خود دو چار مرتبہ اسے گھر بلا چکے تھے لیکن وہ گئی نہ تھی۔

اس روز وہ اور انکل پارک سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ اسی وقت ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ دونوں ہی نے چونک کر دیکھا تھا۔ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے اویس ان لوگوں سے مخاطب تھا۔

''کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو؟ آیئے میں ڈراپ کر دوں۔'' اس کے شرارتی انداز پر وہ بے اختیار مسکرا دی جبکہ انکل بڑی شان بے نیازی سے کہنے لگے۔

''ہم ہر ایرے غیرے سے لفٹ نہیں لیا کرتے۔ میاں اپنا راستہ ناپو۔'' ان کی بات کو اس نے خوب انجوائے کیا پھر اس سے بولا۔

''آپ کی بھی یہی رائے ہے!'' وہ اسے اپنی جانب توجہ پا کر بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔

''آپ آج کل ہیں کہاں؟ نظر نہیں آ رہیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''یہیں ہوں مجھے کہاں جانا ہے۔ انکل سے تو روز ملاقات ہوتی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے داب دیا۔ انکل گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے بولے۔

''اجالا اب یہ اتنا اصرار کر رہا ہے تو میرا خیال ہے بیٹھ جانا چاہیے۔ آجاؤ شاباش۔'' وہ اس کے ابر کی نشست سنبھالتے ہوئے اس کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول گئے تو اسے بھی گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔

''چلو اس بہانے آج اجالا کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ اس بے مروت لڑکی نے تو کبھی اپنے گھر نہیں ایا۔'' گاڑی اس کے گھر جانے والی سڑک پر مڑی تو انکل بولے۔ ان کی بات پر وہ کچھ پریشان سی وگئی۔ اپنے گھر کا تصور اس کے لیے اتنا بھیانک تھا کہ وہ خود وہاں بمشکل جایا کرتی تھی اب انہیں لازمی ندر چلنے کی آفر کرنی پڑے گی۔ وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ گاڑی اس جہنم کے سامنے رکی جسے اس کا گھر ونے کا اعزاز حاصل تھا تو وہ بڑی بددلی سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

''آیئے انکل اندر چلیے۔'' انداز ایسا تھا جیسے مجبوراً بلا رہی ہو اور وہ جنہیں چہرہ شناسی کا دعوا تھا کیسے س کا چہرہ نہ پڑھ پاتے۔

''پھر کسی وقت آئیں گے ان شاء اللہ اللہ حافظ۔'' انہوں نے پرشفقت انداز میں مسکرا کر معذرت ی تو اویس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان لوگوں کو اللہ حافظ کہتی وہ گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆

وہ اسٹڈی میں بیٹھے اویس سے اپنے آرٹیکلز کمپیوٹر پر ٹائپ کرا رہے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے کی ورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا جبکہ وہ کچھ فاصلے پر راکنگ چیئر پر بیٹھے اسے ٹائپ کرتا دیکھنے کے ساتھ مختلف شوروں سے نواز رہے تھے۔ جہاں کچھ ترمیم کرنی ہوتی وہ وہیں بیٹھے بیٹھے کروا دیتے۔ ان دنوں وہ اپنی کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے کام میں مصروف تھے اور فارغ وقت میں اویس ان کا بھرپور ساتھ دیا کرتا تھا۔ کوریڈور سے آتی اجالا کی آواز کو ان دونوں ہی نے تعجب کے ساتھ سنا تھا وہ شاید اخلاق سے پوچھ رہی تھی۔

''انکل کہاں ہیں؟'' انہوں نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا تھا رات کے دس بجے اس کا آنا خاصا تعجب خیز تھا۔ وہ زیادہ تر دن میں یا بہت سے بہت ہوا تو شام میں آیا کرتی تھی۔ اتنے دنوں سے تو وہ ان کے گھر آ بھی نہیں رہی تھی اتنے دنوں بعد آتا وہ بھی رات کے وقت وہ اس کی آمد کی وجہ سوچنے لگے انہیں خیال آیا کہ وہ آج شام پارک بھی نہیں آئی تھی۔ اویس ان کی فکر و پریشانی سے لاتعلق ٹائپنگ میں مصروف تھا۔ اسی وقت وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''بیٹا اتنی رات کو آئی ہو سب خیر تو ہے۔'' اسے اندر آتا دیکھ کر سب سے پہلے یہی جملہ ان کے منہ سے نکلا۔ وہ ان کے سوال کا کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے ان کی طرف آئی اور کارپٹ پر ان کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''میں آپ سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔'' اتنی تہذیب یافتہ اور شائستہ لڑکی سے وہ یہ توقع کبھی بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ بغیر سلام کیے آتے ہی عجیب لایعنی باتیں شروع کر دے گی۔ انہوں نے غور سے

اس کی طرف دیکھا تو وہ انہیں بہت بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتی وحشت اور دیوانگی انہیں درحقیقت خوف زدہ کر گئی۔ اویس کی بورڈ اور مونیٹر سے نظریں ہٹائے اسے ہی دیکھنے لگا تھا مگر وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کرتے ہوئے بولی۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟'' انہیں وہ اس وقت کوئی نفسیاتی مریضہ محسوس ہو رہی تھی اس کی حالت انہیں تشویش میں مبتلا کرنے لگی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''اجالا کیا بات ہے بیٹا۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔''

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔'' وہ ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات دہرانے لگی وہ اس کی نا سمجھ میں آنے والی کیفیت پر پریشان سے ہو کر اویس کو دیکھنے لگے اس نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اس کی بات کا جواب دیں۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''جھوٹ بولتے ہیں آپ۔'' وہ اپنے سر پر رکھا ان کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''اگر مجھ سے محبت کرتے تو میرے بارے میں پوچھتے میں کون ہوں میرے گھر والے کون ہیں اور میں گھر سے بے زار ماری ماری کیوں پھر رہی ہوں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی تھی۔

''نہیں میری جان میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تم خود سے میرا اوپر بھروسہ کر کے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔'' وہ نرم لہجے میں بولے۔ جس اجالا کو وہ جانتے تھے وہ اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جو اس وقت ان کے روبرو تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کیس کے ساتھ کس طرح پیش آئیں۔

''ابھی جب میں گھر سے گاڑی لے کر نکلی تو میرا دل چاہا کہ سامنے سے آتے ٹرک سے گاڑی ٹکرا دوں میں ایسا کرنے بھی والی تھی پھر اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میرے مرنے پر تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہو گا۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں شکر ہے اب میرے مرنے پر کوئی تو اداس ہو گا۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی کہ آخر لوگ خودکشی کیسے کر لیتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر لینا کتنا مشکل کام ہے لیکن یہ کوئی اتنا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ آپ میرے مرنے کے بعد بھی مجھے یاد رکھیں گے نا۔''

وہ اس وقت قطعاً اپنے حواسوں میں نہیں تھی وہ اس کی باتوں پر دہل کر رہ گئے تھے۔

''اجالا ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے گھر والوں سے کوئی ناراضی ہو گئی ہے۔ شاباش مجھے بتاؤ۔'' وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو سنوارتے ہوئے وہ اسے نارمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اچانک ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

''مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں ان وانٹڈ ہوں اور وہ ماریہ کہہ رہی تھی کہ میری بددعاؤں کی وجہ سے اس کا بچہ مر گیا ہے، میں اس سے جیلس ہوتی ہوں۔ اسے خوش دیکھ کر جلتی رہتی ہوں اور میری وجہ سے اس کی زندگی جہنم بنی ہوئی ہے۔''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اویس ایک دم اٹھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں پاپا جانی کی اپنی حالت اس کے رونے کی وجہ سے خراب نہ ہو جائے۔ یہ لڑکی جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا رونا آخر کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے گھٹنوں پر رکھا اس کا سر اس نے آرام سے اٹھایا تو وہ دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

پاپا جانی تو چپ سادھے بیٹھے ہوئے بس ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس کا تو شاید ذہنی اور شعوری نظام مکمل طور پر مفلوج ہو گیا تھا اس لیے اسے دیکھ کر بھی نہیں چونکی اور ان سے کہنے لگی۔

''اور وہ سعود آرام سے کھڑا اس کی ساری باتیں سنتا رہا تھا پھر جب میں گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلی اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ ہاں ہوتی ہوں میں جیلس۔ مجھ سے کسی کی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔ جب میں خوش نہیں ہوں تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے خوش ہونے کا۔ میرا دل چاہتا ہے سارے لوگوں سے ان کی خوشیاں چھین لوں میں روؤں تو سب روئیں ہاں میں نے مارا ہے اس کے بچے کو۔'' وہ پھر چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''اجالا ہوش میں آؤ۔'' اویس نے اسے جھنجھوڑا۔

''دیکھو تمہاری وجہ سے پاپا جانی کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اپنا نہیں تو ان کا خیال کرو۔'' اس کی بات پر وہ بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ دو تین منٹ بعد اس نے محسوس کیا کہ رونے کی آواز بند ہو گئی ہے۔ ڈرتے ڈرتے اپنے سینے پر رکھا اس کا سر اٹھایا۔ تو اس کا بے ہوش وجود اس کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گیا۔

''اویس ڈاکٹر کو فون کرو۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔'' پاپا جانی اسے بے ہوش دیکھ کر سراسیمگی سے بولے۔

''پاپا جانی آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔'' وہ ان کے پریشان چہرے پر نظر ڈال کر تسلی دینے لگا۔

''کیسے پریشان نہ ہوں۔ میری بچی ایسے حالوں میں پہنچ جائے اور میں آرام سے رہوں۔'' وہ اپنا غصہ اور پریشانی اس پر نکالنے لگے۔

''ہاتھ پاؤں چھوڑ دینے اور پریشان ہونے سے آج تک تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔'' وہ کچھ ناراضی بھرے لہجے میں کہتا اسے سنبھال کر اور سہارا دے کر کھڑا ہوا۔ اس کے بے ہوش جسم کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ آہستہ قدموں سے چلتا اسے لے کر وہ پاپا جانی کے بیڈ روم میں آ گیا اور بڑے آرام سے احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے پیچھے وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے اور بیڈ پر اجالا کے برابر میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے دو تین سورتیں پڑھ کر اس کے اوپر پھونکی تھیں۔ اویس اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالتا ہوا اسے آوازیں دے کر بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد بھی جب وہ ہوش میں نہ آئی تو اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر اس کے اوپر جھک کر اسے آواز دی۔

''اجالا۔ اٹھو۔'' وہ اب ڈاکٹر کو فون کرنے ہی والا تھا کہ اس کے وجود میں حرکت محسوس کر کے رک گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں بہت دور سے کوئی اسے آواز دے کر بلا رہا ہے۔ یہ آواز کس کی ہے وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو وہاں موجود دونوں ہی

افراد نے شکرادا کیا۔ اپنے بالکل قریب جھک کر کھڑے ہوئے اویس کو دیکھ کر وہ ایک دم اپنے حواسوں میں واپس آ گئی ایک نظر خود پر اور ایک اپنے برابر بیٹھے انکل پر ڈال کر اٹھ بیٹھی۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے وہ اپنی کچھ دیر پہلے کی دیوانگی پر شرمسار بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس سے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ہوش و خرد سے بیگانگی کے عالم میں وہ جو کچھ کر گزری تھی وہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ ساری زندگی کبھی کسی کے سامنے نہ کھلی تھی اپنے خول میں بند لوگوں سے دور دور رہی تھی۔ لوگوں کے لیے وہ ہمیشہ ایک بند کتاب کی طرح رہی تھی۔ کیا ہو جاتا جو وہ آج یہاں نہ آتی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ گاڑی واقعی کہیں ٹکرا دیتی۔ یوں خود کو بے نقاب کر کے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ کس حساب میں وہ ان لوگوں کو پریشان کرنے چلی آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے ان لوگوں کی نظروں سے چھپ جائے جو پتا نہیں اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

''بیٹا دودھ پیو گی؟'' اس نے اپنے برابر بیٹھے انکل کی آواز سنی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ انکار میں گردن ہلا سکے۔

''اویس شاہد سے کہو ایک گلاس دودھ لائے۔'' انہوں نے اویس سے کہا تو وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں گھر جاؤں گی۔'' وہ ان دونوں سے نظریں چرائے سر جھکا کر بولی تھی۔ وہ اب مزید ایک لمحہ بھی ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شاید اپنی محبت سے مجبور ہو کر کچھ کہنے والے تھے کہ اویس فوراً ہی واپس اس کی طرف آتا ہوا بولا۔

''چلیں پاپا جانی اجالا کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔'' وہ اس حالت میں اسے واپس بھیجنے کے لیے کسی قیمت پر راضی نہیں تھے لیکن اویس آنکھوں میں اصرار لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر درج تاثرات ان سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ابھی اس سے کچھ مت پوچھیں وہ بڑی بے چارگی کے عالم میں بیڈ پر سے اٹھے اور اس سے بولے۔

''چلو تمہیں گھر چھوڑ دیں۔'' وہ اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتی بستر پر سے اتر آئی۔ کھڑے ہوتے ہی اسے پورا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا وہ لہرا کر بستر پر گرنے ہی والی تھی جب دائیں طرف کھڑے اویس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گرنے سے بچایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کے آگے اس کی مزاحمت بے کار ثابت ہوئی۔ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ انکل ان دونوں کے پیچھے چلتے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اویس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اویس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ انکل اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان خود کو ایک دم بہت بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ کیا کرنے والی تھی یہ تو وہ جان چکے تھے لیکن اب یہاں سے جا کر وہ کیا کرے گی یہ سوچ انہیں شدید پریشان کر رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی اور اس میں بیٹھے تینوں ہی افراد کسی نہ کسی فکر میں غلطاں تھے۔

''میں آج کے بعد کبھی ان لوگوں سے نہیں ملوں گی۔ کبھی ان کے گھر نہیں آؤں گی۔'' وہ اپنے دل

میں مصمم ارادہ کر رہی تھی۔

''لیکن آج کے بعد میں ہوں گی تو کہیں جاؤں گی۔ بس اب اس زندگی کی قید سے چھٹکارا پالوں گی پھر جس کا جو دل چاہے میرے بارے میں سوچتا رہے۔''

کچھ دیر پہلے جو ایک شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی وہ ایک دم زائل ہو گئی اور وہ ہلکی پھلکی ہو کر بیٹھ گئی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رکی تو وہاں کا پرسکون سا ماحول دیکھ کر اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ کسی کو کیا پروا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ اگر مر بھی گئی تھی تو کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا بیٹھ کر اس کا سوگ مناتا یا اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور بغیر ان لوگوں کی طرف دیکھے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

''اجالا ایک منٹ رکو۔'' اپنے پیچھے انکل کی آواز سن کر وہ رک گئی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آ رہے تھے۔

''جو سوال تم نے مجھ سے کیا تھا وہی میں تم سے کر رہا ہوں کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بولے۔ وہ بہت بدتمیزی کے ساتھ انکار کر کے ان کا دل توڑ دینا چاہتی تھی۔ کیا فرق پڑتا تھا جہاں اتنے بہت سے افراد اسے برا سمجھتے تھے اگر ان میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔ اس کی صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنی سوچ کے برخلاف وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

''پھر میں تمہیں اس محبت کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں تم خود کو ہرگز بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔ اجالا میری جان میں اپنوں کو روتے روتے تھک چکا ہوں اب مجھ میں کوئی دکھ، کوئی صدمہ جھیلنے کی ہمت نہیں بچی۔ اویس اور تم ہی اب میری واحد پونجی ہو۔ اس عمر میں مجھے کوئی دکھ نہ دینا۔''

ان کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر گئے۔ اویس گاڑی میں بیٹھا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

''صرف میری خاطر تمہیں زندہ رہنا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گی۔'' ان کی محبت اس کے اندر کی سوئی ہوئی اجالا کو جگا رہی تھی جو محبتوں کی متلاشی تھی۔ جو یہ چاہتی تھی کہ کوئی تو ہو جو اسے پیار کرے بے حد اور بے حساب۔ جس کے لیے وہ بہت خاص ہو۔ جس کے لیے اس کا ہونا بہت اہمیت رکھتا ہو اور اب وہ ہستی اس کے سامنے کھڑی تھی جس سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن خونی رشتوں سے بڑھ کر وہ اسے چاہ رہے تھے۔ وہ کیسے انہیں مایوس کر سکتی تھی۔ بے اختیار اس نے گردن ہلا کر ان سے وعدہ کر لیا تو وہ مطمئن ہو کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ جب تک وہ اندر داخل نہیں ہو گئی وہ لوگ وہیں موجود رہے تھے۔

☆☆☆

''میں اپنے ماں باپ کی ان چاہی اولاد ہوں ایک ایسی اولاد جسے اس کے والدین نظر انداز کر دیں جس گھر میں میں نے آنکھ کھولی وہاں کسی کو میری ضرورت نہ تھی۔ میرا وجود وہاں کے مکینوں کے لیے باعث زحمت تھا۔ لیکن صرف دنیا والوں کے لیے بظاہر یہ کلچرڈ اور مہذب انسان اندر سے وہی روایتی مرد

تھا جو عورت کا استحصال کر کے اس پر ظلم کر کے اپنی انا کی تسکین کرتا ہے۔ انہیں دنیا میں اگر کسی سے محبت تھی تو ان کی ماں تھیں۔ ہماری دادی جو پوتے کھلانے کی آرزو میں دن گن گن کر گزار رہی تھیں۔ اکلوتے بیٹے کا ولی عہد دیکھنا ان کا اولین اور دیرینہ خواب تھا۔ لیکن خدا کی خدائی کے سامنے ان کا کچھ نہ چلا تھا اور میری ممی کے ہاں پہلی اولاد بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ دادی بہت ناراض ہوئی تھیں لیکن ڈیڈی نے انہیں سمجھا بجھا کر منالیا تھا کہ اگلی بار ضرور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

صبا آپی کے بعد حنا بجو کی پیدائش نے دادی کے ساتھ ساتھ ڈیڈی کو بھی آگ بگولہ کر دیا۔ دونوں نے مل کر ممی پر زندگی تنگ کر دی۔ انہیں ہر طرح کی اذیت دی گئی، طعنے اور دھمکیاں دی گئیں۔ ڈیڈی کو اپنی دونوں بیٹیوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ گھر آتے تو بیوی اور بیٹیوں کو برا بھلا کہتے اور کمرے میں بند ہو جاتے۔ میری ممی تیسری بار پریگیننٹ ہوئیں تو بہت ڈری ہوئی تھیں ان کے اس گھر میں رہنے کا دارومدار اب صرف آنے والے ننھے مہمان پر تھا۔ بیٹی ہونے کی صورت میں انہیں اس گھر سے نکال دیا جانا تھا۔ ڈیڈی چیخ چیخ کر بے شمار مرتبہ انہیں طلاق دے دینے کی دھمکی دے چکے تھے۔ خدا کو بھی شاید ممی کی بے بسی پر ترس آ گیا تھا۔ اس لیے اس بار وہ اپنے شوہر اور ساس کے سامنے سرخرو ہو گئی تھیں۔ ممی نے اس بار جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ میں اور میرا بھائی سعود جو مجھ سے تین منٹ چھوٹا تھا۔

میں پیدائشی طور پر بڑی صحت مند اور ہٹی کٹی تھی اور سعود بڑا کمزور مریل اور بیمار سا بچہ۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ تمام گھر والے ہر قیمت پر اس بچے کی جان بچانا چاہتے تھے۔ میری ممی کو اپنا گھر بچانا تھا اس لیے، ڈیڈی کو دادی کو خوش کرنا تھا اس لیے، اور دادی کو بیٹے کا وارث دیکھنا تھا اس لیے۔ سب کے پاس اسے توجہ دینے کی معقول وجہ موجود تھی۔ ایسے میں کسی کو بھی اس بچی کا خیال نہ آیا جو ماں کی آغوش سے محروم آیا کے رحم و کرم پر گھر میں پڑی رہتی تھی۔

ایک مہینے ہاسپٹل رہ کر جب سعود ڈاکٹروں کی پیشن گوئی کے باوجود صحت یاب ہو کر گھر آ گیا تو گھر میں گویا خوشیوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ وہ سب ہی کا چہیتا اور لاڈلا تھا۔ لیکن ممی اور دادی کا بالخصوص۔ ممی اسے ایک لمحے کو بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ وہ ان کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آیا تھا اس نے انہیں طلاق جیسے منحوس داغ سے بچا لیا تھا تو وہ کیوں نہ اسے چاہتیں۔ ممی کے پاس میرے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ انہیں تو شاید یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ سعود کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک بیٹی کو بھی جنم دیا تھا جس کا انہوں نے ابھی تک نام بھی نہیں رکھا۔

میری پیدائش کے دو ماہ بعد میری نانی کوئٹہ سے آئیں تو انہوں نے ہی میرا نام رکھا "اجالا شہریار"۔ میرا نام تو خود میرے لیے ایک لطیفہ ہے۔ جس کی اپنی زندگی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہو وہ اجالا کیسے ہو سکتی ہے۔ نانی نے ممی کو ان کی لاپروائی پر سخت سست سنائیں کہ ان کی غفلت کے نتیجے میں بچی بے یار و مددگار آیا کے رحم و کرم پر پڑی ہے اور جسے گھر والوں کی بے توجہی محسوس کر کے آیا بھی اکثر بھول جاتی ہے۔ کئی دفعہ وہ بچی بھوک سے نڈھال ہو کر بلک بلک کر روتی خود ہی چپ ہو کر سو جاتی ہے اور آیا اسے دودھ بنانا بھول جاتی ہے۔ ممی نے واضح طور پر اپنی بے زاری کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں اب مزید اولاد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں سعود کے ساتھ یہ بھی کیوں پیدا ہو گئی۔ ممی اور ڈیڈی دونوں ہی نے مجھے نظر انداز

کر دیا تو نانی مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گئیں۔ نانی وہاں میرے ماموں کے گھر میں رہتی تھیں۔ جسے اس کے ماں باپ نہ چاہیں اس سے کوئی اور کیا پیار کرے گا سو ماموں ممانی کا رویہ کوئی خاص اچھا نہ تھا۔ وہ نانی کی مروت میں میری اپنے گھر آمد کو قبول کر گئے تھے۔

ڈیڈی ہر مہینہ ایک خطیر رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا کرتے تھے اور ممی کسی آتے جاتے کے ہاتھ کپڑے اور کھلونے بھیج کر اپنی محبت کا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ نانی نے وہیں اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھیں انہیں بیٹی کی نالائقی اور لاپروائی پر بہت غصہ تھا۔ وقت گزرتا رہا میں آٹھ سال کی ہو گئی۔ اس دوران ممی ڈیڈی کے ہاں ان کے نہ چاہنے کے باوجود بھی دعا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ ہو بہو دادی کی کاپی تھی۔ اسی لیے دادی اسے بہت پیار کرتی تھیں۔ اس کے پیدا ہونے کے کچھ ماہ بعد ہی دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

میری آٹھویں سالگرہ کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نانی ایک رات ایسی سوئیں کہ پھر اٹھی ہی نہیں۔ مجھ سے محبت کرنے والی واحد ہستی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اور میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کوئی پرائی اولاد کو کب تک اپنے پاس رکھتا سو ماموں نے مجھے واپس کراچی بھجوا دیا۔ میری واپسی میرے گھر والوں کے لیے اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ مجھے ایئر پورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے ڈرائیور کو بھیج دیا گیا تھا۔ میری واپسی پر گھر والوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میں ممی کے گلے لگنا چاہتی تھی ان کی خوشبو محسوس کرنا چاہتی تھی مگر انہوں نے دور سے میرے سلام کا جواب دے کر میری خیریت پوچھی تھی۔ میں جھجک کر رک گئی تھی۔ ڈیڈی اور بہن بھائیوں کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا لیا دیا سا تھا۔ جیسے میں کوئی آؤٹ سائڈر تھی جو اچانک ان کے گھر آ کر رہنے لگی تھی۔

پتا نہیں مجھے اپنے ساتھ لے جا کر نانی نے اچھا کیا تھا یا برا اس بات کا فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکی۔ اگر وہ مجھے ساتھ نہ لے جاتیں تو ہو سکتا تھا میری بھی اس گھر میں کوئی جگہ نکل آتی۔ وہ سب اتنے عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے تھے وہ سب ایک تھے اور میں بالکل الگ۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی کو میری ضرورت نہ تھی۔ دادی کی وفات کے بعد اب گھر میں ممی کا رعب تھا وہ اب کوئی ڈری سہمی عورت نہ تھیں ان کا بیٹا ان کی طاقت تھا۔ وہ سعود سے بے تحاشا محبت کرتی تھیں اس کے آگے ڈیڈی اور بہنوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر سعود ان سے کہتا کہ آپ میری خاطر سمندر میں چھلانگ لگا دیں یا آگ میں کود جائیں وہ ایسا کر گزرتیں۔ وہ اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتی تھیں اور ڈیڈی اب صرف بزنس مین تھے۔ ہزار کو لاکھ کیسے بنانا ہے اور لاکھ کو کروڑ ان کی سوچ بس یہیں تک محدود تھی۔ انہیں گھر اور بچوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ سعود جس کی خاطر وہ ممی کو طلاق دیتے دیتے رہ گئے تھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں البتہ دعا سے وہ باقیوں کی نسبت پیار کیا کرتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ دادی جیسی تھی۔

میں گھر والوں میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس گھر کا ایک حصہ بنانا چاہتی تھی اس لیے میں نے سب کا بہت خیال رکھنا شروع کر دیا۔ ڈیڈی کافی کے شوقین تھے میں رات کو سونے سے پہلے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کافی بنا کر ان کے لیے لے جایا کرتی تو وہ بغیر کچھ کہے کپ میرے ہاتھ سے لے لیتے تھے۔ ہر بار میں سوچتی کہ آج ضرور ڈیڈی مجھے پیار کریں گے اور کہیں گے میری بیٹی کتنی

اچھی ہے اپنے ڈیڈی کا کتنا خیال رکھتی ہے مگر میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔

ممی کی محبت حاصل کرنے کے لیے میں نے سعود کا بہت زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ مجھے سعود میں ان کی جان ہے اور ان کی جان مجھے بہت پیاری تھی۔ میں اپنی ساری پاکٹ منی اور چیزیں اسے دے دیا کرتی۔ اس کے جنرل پر ڈائی گرام بنا دیا کرتی کہ وہ مجھ سے خوش ہوگا تو ممی خوش ہو جائیں گی۔ اپنی بہنوں کا ہر کام نوکروں سے بھی پہلے دوڑ دوڑ کر کر دیتی کہ وہ مجھ سے باتیں میں ان میں گھل مل جاؤں۔ یہاں میں تھوڑی کامیاب بھی ہو گئی۔ صبا آپی اور حنا بجو مجھ سے کچھ ہو گئیں اور اکثر مجھ سے باتیں بھی کرنے لگیں۔

دعا البتہ سب سے مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ صرف شکل کی ہی نہیں بلکہ عادتوں میں بھی جیسی تھی۔ انہیں کی طرح ضدی اور سرکش۔ اس کا دل چاہتا یا کوئی مطلب ہوتا تو مجھ سے بات کر مجھے اگنور کر دیتی۔

ڈیڈی نے صبا آپی اور حنا بجو کی شادیاں بہت کم عمری میں کر دیں۔ وہ بلا کے اسٹیٹس بندے تھے اسی لیے ان کے دونوں داماد ان کی طرح ویل آف فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔ ان د شادی کے بعد میں کچھ اور اکیلی ہو گئی لیکن میں نے گھر والوں کا خیال رکھنے والا اپنا رویہ ترک میں ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس گھر میں اپنی جگہ بنانی تھی۔ میں اپنی محبت اور خدمت کے دل جیت لینا چاہتی تھی۔ میری اطاعت گزاری پر دعا میرا مذاق اڑاتی تھی کہ مجھے کسی مڈ گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ یہ خدمت اور وفا شعاری وغیرہ جیسی لغویات وہاں بہت کارآ ہوتی ہیں۔

دن گزرتے رہے میں انٹر کر کے آرٹس اسکول میں آ گئی۔ انہیں دنوں سعود کو ہماری چھوٹی ماریہ سے طوفانی قسم کا عشق لاحق ہو گیا۔ ممی تو بیٹے کی خواہش پر دل و جان سے راضی تھیں لیکن خالہ کا مڈل کلاس گھرانہ اپنے اکلوتے بیٹے کے شایان شان نظر نہ آ رہا تھا۔ لیکن اب ممی کوئی پہلے ڈیڈی سے ڈر جانے والی عورت نہ رہی تھیں سو ڈیڈی کے آگے بیٹے کا مقدمہ لڑنے کھڑی ہو گئیں ڈیڈی کو ہتھیار ڈالنے پڑ گئے اور اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر ایک دس ہزار ماہوار کمانے وا پونجیے کے گھر پہنچ گئے۔ ماریہ اور خالہ اس رشتے پر بہت خوش تھیں۔ سب ہی کو پتا تھا انہوں کرنی ہے۔ بیٹی کے اس زوردار عشق میں وہ برابر کی شریک تھیں۔ انہیں اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی جائیداد اور اکلوتا داخو بردو داماد درکار تھا۔ سو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن ان کے جواب نے حیران کر دیا تھا وہ ماریہ کا رشتہ صرف اس قیمت پر دینے کو تیار تھیں کہ میرا رشتہ ان کے بیٹے خالد سے طے کر دیا جاتا۔ سعود کے لیے ممی اس مقولے پر یقین رکھتی تھیں کہ "جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔" سو انہیں اس سودے بازی میں کوئی برائی نظر نہ آ رہی تھی۔

خالد مکینیکل انجینئرنگ کر کے نوکری کی تلاش میں مصروف تھا۔ ایسا داماد ڈیڈی کے قابل قبول ہو سکتا تھا۔ گھر میں پھر ایک نئی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ممی کو خالد میں ہر خوبی اور ڈیڈی کو ہر آ رہی تھی۔ رہ گئی میں تو مجھ سے اس سلسلے میں کچھ بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ سعود کے انکار پر مشتعل ہو کر گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو ممی روتی ہوئی میرے پاس آ گئیں اور کہ

یں ڈیڈی کے سامنے اس رشتے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کروں اور انہیں مجبور کروں کہ وہ ہاں کر دیں۔

مجھے خالد سے کوئی دلچسپی نہ تھی میری تو اس سے بطور کزن بھی بات چیت نہ تھی لیکن ممی کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کا یہ موقع میں گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے ان کی بات مان کر ڈیڈی کے پاس چلی آئی۔ وہ میری اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔ مجھے کلاس ڈفرنس کے عیوب گنوانے لگے۔ مجھے سمجھانے لگے کہ رشتے ناتوں میں کی جانے والی بلیک میلنگ انہیں بالکل پسند نہیں۔ وہ خالد کے متبادل کے طور پر بے شمار لوگوں کے نام میرے سامنے گنوانے لگے جن سے وہ میری شادی کر سکتے تھے اور جو برے ہم پلہ بھی تھے۔ لیکن میں ان کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی اور جب تک ان سے اپنی بات منوا نہ لی ہاں سے ہٹی نہیں۔

خالہ اس رشتے کے طے ہو جانے پر بہت خوش تھیں۔ سعود کا ماریہ کے ساتھ اور میرا خالد کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ ماریہ کو تو بیاہ کر ہمارے گھر آنا تھا۔ لیکن ڈیڈی کبھی بھی اپنی بیٹی کو ایک سو بیس گز کے ایک معمولی سے گھر میں رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میں اسے ان کی اپنے آپ سے محبت جان کر خوش ہوتی رہی تھی آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے وہ ان کی مجھ سے نہیں اپنے آپ سے محبت تھی۔ سکندر شہریار خان کی بیٹی کسی معمولی گھر میں بیاہ کر جائے ان کی ناک نیچی نہ ہو جاتی۔ انہوں نے خالد کا اسٹیٹس ہمارے برابر لانے کے لیے فوری طور پر اس کے لیے امریکہ میں اچھی جاب اور رہائش کا بندوبست کیا اور وہاں ایک بہت ہی اچھی فرم میں اس کی نوکری کا انتظام ہو گیا تھا۔ جتنے ڈالرز کی جاب اسے ڈیڈی کے توسط سے ملی تھی وہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ وہ امریکہ چلا گیا اور خالہ کے گھر کے حالات بتدریج بدلنے لگے۔

ہمارے درمیان نکاح جیسا مضبوط بندھن قائم ہو جانے کے باوجود اس نے کبھی مجھ سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں اس کے سرد و سپاٹ انداز پر حیران ہوا کرتی تھی۔ میرے سامنے ماریہ اور سعود صبح شام ایک دوسرے سے ملتے، فون پر لمبی لمبی باتیں ہوتیں اور وہ جس کے ساتھ مجھے زندگی گزارنی تھی میرے وجود سے لاتعلق تھا۔ اس کے اسی رویے کی بدولت میرے دل میں بھی اس کے لیے کچھ خاص قسم کی فیلنگس پیدا نہ ہو سکیں۔ میں ان دنوں اپنے مستقبل سے ڈرنے لگی تھی۔

مجھے لگتا تھا میری زندگی بھی ممی ڈیڈی کی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے میں گزر جائے گی۔ میں محبتوں کی متلاشی تھی۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جس کے ساتھ مجھے اپنی زندگی گزارنی ہے وہ کوئی بھی ہو لیکن مجھ سے بے حد محبت کرتا ہو۔ میرا وجود اس کے لیے خوشی کا باعث ہو۔ وہ بن کہے میرے دل کی ہر بات سمجھ جائے۔ وہ امیر ہو یا غریب لیکن میری عزت کرے مجھے سچا پیار دے اور خالد میں مجھے ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"میرا B.F.A کمپلیٹ ہوا تو میں نے وقت گزاری کے لیے آرٹ اسکول جوائن کر لیا۔ ان ہی دنوں سعود کے اصرار پر ماریہ رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی۔ ورنہ ڈیڈی تو ہم دونوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ خالد اتنی جلدی شادی کے لیے آمادہ نہ تھا سو ڈیڈی نے چپ سادھ لی۔ ماریہ ایک ت ہی کی ذہن کی لڑکی تھی۔ اسے تو شاید سعود سے سچی محبت بھی نہیں تھی۔ اس کا خواب تو ایک امیر گھرانے کی بہو بننا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانا اور سیر و تفریح کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کی

تمام حرکات کسی نو دولتیے جیسی تھیں۔

دعا سے اس کی بالکل بھی نہیں بنتی تھی۔ لیکن وہ ڈیڈی کی چہیتی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کے نو دولتی پن کا دل کھول کر مذاق اڑاتی۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر ندیدوں کی طرح پلیٹ لبالب بھ دعا اس کو مسخرانہ نظروں سے دیکھتی۔ میری البتہ اس سے نہ تو کوئی دوستی تھی نہ دشمنی۔

دن گزرتے رہے ڈیڈی کو میری رخصتی کی فکر کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ ممی البتہ پر سکو انہیں دنوں میں زندگی آندھیوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا کسی کا دکھایا تھا لیکن خود میرے ساتھ اس سب کے صلے میں کیا ہوا؟ میں ساری زندگی اپنوں کی محبت میں بھاگتی رہی۔ لوگوں کے دل جیتنے کے لیے خدمت اور فرماں برداری کے ہتھیار استعمال کرتی

ایک روز مجھے پتا چلا کہ میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میں خالی ہاتھ کھڑی سوچ رہی تھی کہ ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ میں ان چاہی تھی اور اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان چاہی ہی رہ

خالد دو مہینوں کی چھٹی لے کر پاکستان آیا تھا اور جو خبر کسی بم کی طرح میرے اعصاب کو تو تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی چچا زاد نزہت سے شادی کر رہا تھا۔ خالہ نے ڈیڈی کے احتجاج پر خود کو لا تع کر کے اسے بیٹے کی ضد اور بغاوت قرار دیا تھا۔ ڈیڈی کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان خالد کو اس کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ ہے کیا دو ٹکے کا انسان جسے انہوں نے کرا نے برابر جگہ دی تھی تو اس نے جواباً بڑے آرام اور سکون سے مجھے طلاق دے دی۔

کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی میں مصلوب کی جا رہی تھی۔ میں نے جو قدم ممی کو خوش کر لیے اٹھایا تھا وہ میری بربادی پہ ختم ہوا تھا۔ خالہ کے گھر خالد کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جا کل تک جو وہ بیٹے کی ضد اور بغاوت سے ناراض نظر آ رہی تھیں آج بڑے آرام سے اپنی بہو کے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ خالہ کے گھر کے کسی بھی فرد کی ہمارے گھر آمد پر مکمل پابندی عا تھی۔ ڈیڈی ان میں سے کسی کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے بقول ممی کا مڈ گھرانہ اس قابل ہی نہ تھا کہ ان سے کوئی تعلق رکھا جائے۔ ڈیڈی کے منہ سے کلاس کا طعنہ مار برا لگا تھا۔ اس نے مجھ سے خوامخواہ کا بیر باندھ لیا تھا۔ اصولاً تو مجھے اس سے برا سلوک کرنا چا اس کا بھائی میری بربادی کا ذمہ دار تھا مگر ہمارے گھر الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔

سعود کو بھی مجھ میں سو طرح کے عیب نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ ڈیڈی نے ماریہ کے عل بھی شادی میں شرکت کی اجازت نہ دی تھی۔ اس رات میں ممی کے لیے چائے لے کر ان کے ک طرف آئی تو اندر سے آتی سعود کی آواز نے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔ وہ ممی سے ڈیڈی کے احتجاج کر رہا تھا۔ براہ راست ڈیڈی سے ٹکر تو وہ لے نہیں سکتا تھا آخر یہ گھر اور تمام کاروبار ملکیت تھا اور سعود ہرگز بھی اتنا بے وقوف نہ تھا۔ کاش اس روز میں نے ممی اور سعود کی باتیں نہ سن کم از کم خود اپنی نظروں میں کچھ تو معتبر رہ جاتی ان کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ خالد ایک عر نزہت کو پسند کرتا تھا۔ خود نزہت بھی اس میں انٹرسٹڈ تھی۔ لیکن اسے اپنے ہی جیسے ایک مڈ گھرانے میں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ اسے دولت، رتبہ، عالیشان مکان اور قیمتی گاڑی چاہیے سب کچھ خالد کی چھوٹی موٹی نوکری میں ہونا ممکن نہ تھا۔ ہمارے ہاں سے ماریہ کے لیے رشتہ گیا

پے مسئلہ کا حل میری صورت میں نظر آ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ سعود ماریہ کے عشق میں بری طرح گرفتار ہے اور اس سے بھی کڑی شرائط اگر رکھی ئیں وہ تب بھی ماریہ ہی سے شادی کرے گا۔ اس نے خالہ کو اس بات کے لیے آمادہ کیا تو وہ بھی بیٹے ہموا بن گئیں۔ مجھے خالہ، خالد یا نزہت کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ دکھ تو مجھے اپنوں کی بے اعتنائی کا سعود اور ممی دونوں خالد کی نزہت سے محبت کے بارے میں آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے نمال کیا جا رہا ہے مجھے سونے کی چڑیا سمجھا جا رہا ہے لیکن سعود کے سر پر ماریہ کا عشق سر چڑھ کر بول رہا اور ممی سعود کی محبت میں اپنی بیٹی کی بازی لگانے کو بھی تیار تھیں۔ خالہ اور خالد انہیں لاعلم سمجھتے تھے لیکن ن کی غلط فہمی تھی۔ ممی کا خیال تھا کہ میرے جیسی امیر باپ کی بیٹی سے شادی ہو گی تو خالد خود بخود نزہت بھول جائے گا اور سعود کو مجھ سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ میرے ذریعے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ ی سگی ماں جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا اتنے آرام سے میرے ارمانوں کا خون کر گئی۔ ان کے ، واقعی محبت اور جنگ میں سب جائز تھا کیا فرق پڑ گیا اگر اس جنگ میں انہوں نے اپنی بیٹی کو ہار دیا۔

سعود اور ممی دونوں ہی کا خیال تھا کہ ڈیڈی بلاوجہ کے لیے اس بات کو ایشو بنا رہے ہیں۔ میرے ، رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں کوئی مڈل کلاس کی لڑکی نہیں ہوں۔ منگنی ٹوٹ جانے پر یا طلاق ہانے پر جس کے لیے زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کل تک جو خود اپنے آپ کو طلاق سے نے کے لیے ہر قیمت پر ایک بیٹا چاہتی تھیں آج اپنی بیٹی کی طلاق پر ایک آنسو بہائے بغیر بڑے آرام ، بیٹھی ڈیڈی پر تنقید کر رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ خالد کی غلطی کی سزا ان کی پوری فیملی کو دینا ناانصافی ، اور پھر اس سے ماریہ کی بھی انسلٹ ہو رہی تھی۔

اس روز میں اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ خالہ، خالد، نزہت، ماریہ، سعود اور سب نے اپنے اپنے مفادات کے لیے مجھے استعمال کیا تھا۔ میں انہیں ان کے مقصد تک پہنچانے کا تھی۔ میں ایک استعمال ہونے والی شے تھی جس کے نہ کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات۔ میں سب کے لیے ایک Cat's paw تھی۔ میری اچھائی میری نیکی اور خدمت کچھ بھی میرے کام نہ تھی۔ مجھ سے اپنا مطلب نکال کر مجھے کسی فالتو چیز کی طرح ڈال دیا گیا تھا۔ ماریہ کا رویہ بالخصوص ے ساتھ نہایت ہتک آمیز تھا اسے شاید یہ دھڑکا تھا کہ کہیں کسی روز میرے بھائی کی غیرت یا میری کی ممتا نہ جاگ جائے اور اسے اس گھر سے نکال دیا جائے اس لیے وہ میری دشمن ہو گئی تھی۔ میرے ، دنیا ختم ہو گئی تھی۔

وہ گھر جس میں میں رہتی تھی میرے لیے ایک جہنم کدہ بن گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سب سے کٹتی ئی۔ کسی نے میری تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش نہ کی سب اپنے حال میں مگن خوش تھے۔ انہیں دنوں ، پارک میں آپ ملے۔ مجھے نہیں پتا کہ میری کس بات سے متاثر ہو کر آپ میری طرف بڑھے تھے جن سے اس کے خونی رشتے کوئی لگاؤ نہ رکھتے تھے اس سے ایک بالکل غیر آدمی بے حد پیار کر رہا ۔ پتا نہیں آپ کی چاہت میں کیا جادو تھا کہ میں آپ کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ اپنوں کے دیئے غم بھی مجھے نے لگے۔ میں نے سوچا کہ ہاں کم سے کم آپ تو مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ بالکل بے غرض اور رکی۔ میں آپ کی سنگت میں خوش رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھ میں تبدیلی آ رہی تھی۔ میں خوش رہنے لگی

تھی۔

تین روز پہلے ماریہ نے اپنے پہلے بچے کو جنم دیا۔ اس کا بیٹا جو بہت صحت مند تندرست پیدا ہوا پیدائش کے دو گھنٹے بعد ہی مر گیا۔ کل وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی تو آتے ہی میرے کمرے میں آ کر چلانے لگی کہ میں اس کے بچے کو کھا گئی ہوں۔ میں اس کے بچے کی پھوپھی نہیں ایک ڈائن ہوں جس نے اپنے بھتیجے کو کھا لیا۔ میں اس کی خوشیوں سے جلتی ہوں۔ اسے بددعائیں دیتی ہوں۔ میں کسی آسیب کی طرح اس کی جان کو چمٹ گئی ہوں۔ میری وجہ سے اسے اس گھر میں اس کا جائز مقام نہیں مل رہا اور نہیں میری جیسی منحوس بلا سے اس کا پیچھا کب چھٹے گا۔

وہ مجھے اپنے بچے کا قاتل قرار دے رہی تھی اور میرا بھائی میرا ماں جایا خاموش کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دعا اپنے کمرے میں بند میوزک سن رہی تھی اور ممی ڈیڈی کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ وہ ہوتے بھی تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پیدا ہی لوگوں کی نفرتیں سہنے کے لیے کی گئی تھی۔ میں ماریہ کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اس کی حیثیت یاد دلانا چاہتی تھی لیکن خاموش کھڑی اس کی ساری بکواس سنتی رہی تھی میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکل سکا تھا۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو میں گاڑی کی چابی لے کر گھر سے نکل آئی اور پتا نہیں کیسے آپ کے پاس پہنچ گئی۔"

وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے آنسو بہاتے ہوئے اپنا دل ان کے سامنے کھول رہی تھی۔ وہ وقت بغیر اسے ٹوکے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی ساری بات سنتے رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر اسے بلا لیا تھا اور وہ بنا چوں چرا کیے چلی آئی تھی۔ وہی کل کے سلوٹ زدہ کپڑے اور بکھرے بالوں میں وہ ان کے بیڈ روم میں بیٹھی انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہی تھی۔ اویس آفس جا چکا تھا۔ کافی دیر بعد جب اس کے آنسو تھم گئے اور دل قدرے ٹھہر گیا تو اس نے انکل کی آواز سنی وہ کہہ رہے تھے۔

"تمہارا مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ تم بہت حساس ہو۔ ہر بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑھتی ہو۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے ڈیڈی صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں اپنے کسی بھی بچے سے ویسی محبت نہیں کرتے جیسی ایک باپ کو کرنی چاہیے۔ تمہاری ممی صرف تمہیں نہیں تمہاری کسی بھی بہن سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں۔ تمہاری جگہ تمہاری کوئی اور بہن بھی ہوتی وہ اسے سعود کی خاطر یونہی استعمال کرتیں جیسے تمہیں کیا اور تم کیا سمجھتی ہو وہ سعود کو چاہتی ہیں۔ نہیں وہ اس سے محبت نہیں کرتیں۔ وہ دراصل ایک نفسیاتی مریضہ ہیں۔ تمہارے گھر کے کسی بھی فرد کا رویہ نارمل نہیں۔ تمہارا سارا گھرانہ ایک قسم کے mental Disosdar کا شکار ہے۔ تمہارے ساتھ جس کسی نے بھی کیا سب بھول جاؤ۔ ایک بار میرے کہنے پر سب کو معاف کر دو۔ اپنے دل کی سچائیوں سے سب کو معاف کر دو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑھنا چھوڑ دو۔ میری بات کا یقین کرو کہ تم اپنے حصے کے تمام دکھ سہہ چکی ہو اور اب زندگی تم پر مہربان ہونے والی ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی بھی ان کی برداشت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالتا۔

تم خود دیکھ لینا زندگی اگلے موڑ پر تمہارے لیے کتنی ساری خوشیاں لیے کھڑی ہے۔ تم دونوں ہاتھوں سے خوشیاں، راحتیں اور محبتیں سمیٹو گی۔" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے تو وہ

بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار ہے نا۔" ان کی بات پر اس نے گردن ہلا دی۔

"تو پھر میری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لو۔ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہتی تھیں۔ اس بات کا یقین میں دلا رہا ہوں تمہیں۔" اور ان کی اس بات پر اس نے واقعی آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ ان کے آگے اپنا دل کیا کھولا تھا اس کا تمام بوجھ ہی ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا بہت مطمئن محسوس کرنے لگی تھی۔

اب وہ پارک میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے اس سے اس کی اپنی باتیں کیا کرتے۔ وہ اپنے بچپن کی بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں بتاتی۔ اب اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ انہوں نے اس کا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ اس نے اپنے سے متعلقہ تمام افراد کو کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے جو کہتے وہ کیے جاتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود میں ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ اسے اویس کا سامنا کرنے سے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی اس روز کی بے اختیارانہ کیفیت اور دیوانگی اسے اس کے سامنے شرمندہ کرتی تھی۔ انکل کی بات دوسری تھی ان کے سامنے تو وہ کھلی کتاب تھی جو کچھ اس کے دل میں ہوتا وہ فوراً ان سے کہہ دیا کرتی تھی۔ اسی لیے انکل کے کئی دفعہ بلانے پر بھی وہ ان کے گھر نہ گئی تھی۔ اس روز سنڈے تھا جب انکل نے اسے فون کر کے اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی تھی اور ان کے بے حد اصرار پر بھی وہ آنے کے لیے تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے انکار پر انکل نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

گیٹ سے اندر داخل ہوتے وقت وہ یہی دعا کر رہی تھی کہ اس سے سامنا نہ ہو اور وہ سامنے ہی لان میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اپنے حساب سے وہ اس وقت آئی تھی جب جم خانہ جایا کرتا تھا مگر وہ لان چیئر پر براجمان ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں چائے کا کپ پکڑے گیٹ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انکل آج پارک نہیں آئے تھے اور وہ کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے چلی آئی تھی۔ اب جبکہ اس نے اسے دیکھ بھی لیا تھا تو سیدھے سیدھے اندر چلے جانا بڑی بداخلاقی کی بات تھی۔ وہ خود میں اس کو فیس کرنے کی جرات پیدا کرتی لان کی طرف چلی آئی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ خیر مقدمی انداز میں مسکرایا تھا۔

"کہاں غائب ہو آج کل؟" اس کے قریب آنے پر وہ مسکرا کر بولا۔ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"بیٹھو۔"

"انکل کہاں ہیں؟" وہ بیٹھنے کی آفر نظر انداز کر کے قصداً اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"اس گھر میں انکل کے علاوہ میں غریب مسکین سا بندہ بھی رہتا ہوں۔ کم سے کم میری خیریت ہی پوچھ لو۔" وہ ناراضی سے بولا۔ وہ مجبوراً کرسی پر ٹک گئی۔ سگریٹ کے کش لیتا وہ دھواں اڑاتا بڑے غور

سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اپنے حساب سے تو میں نے آج تک ایسی کوئی بات تم سے نہیں کی جس پر تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔'' وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

''پھر بھی اگر تمہارے خیال سے میں نے کچھ غلط کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر مجھے اپنی کوتاہی محسوس ہوئی تو میں تم سے ایکسکیوز کر لوں گا۔''

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔'' وہ سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

''پھر تم مجھے نظر انداز کیوں کر رہی ہو؟'' وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہی تھی۔ اسی لیے سر جھکا کر بولی۔

''میں پاگل نہیں ہوں جو یہ بات محسوس نہ کر سکوں کہ تم میری وجہ سے یہاں آنے سے کتراتی ہو۔ اس وقت بھی تم اس خیال سے آ گئی تھیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں گا۔'' وہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی۔ اسے اس کے دل کے حال کی خبر کیسے ہو گئی۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اس بے تحاشا ذہین بندے کے سامنے جھوٹ نہیں بولا جا سکتا یہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اچانک ہی خود بخود اس کے ہونٹوں سے یہ جملہ پھسل گیا۔

''مجھے آپ کے سامنے آنے سے شرمندگی ہوتی ہے۔ میرے اس دن کے ابنارمل بی ہیور پر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔'' وہ جو بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا اچانک ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے اسے قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ لوگوں سے فاصلہ رکھ کر ملنے والا جو اپنے اور مقابل کے بیچ ایک لکیر کھینچ کر رکھتا تھا اس وقت بڑی بے فکری سے ہنس رہا تھا۔

''تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں ہر وقت تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' اس نے جیسے اس کی بات کو بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ اپنے بے اختیاری میں منہ سے نکل جانے والے جملے پر شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئی تھی۔ وہ مسکراتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی اسے شدید قسم کا غصہ آنا شروع ہو گیا۔ اسے کس نے حق دیا ہے کہ وہ اس کا مذاق اڑائے وہ کرسی پر سے اٹھ گئی اور آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس نے اپنا پیر درمیان میں حائل کر کے گو اسے جانے سے روکا۔

''میں نے ابھی تمہیں جانے کے لیے نہیں کہا۔'' وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

''مجھے کہیں جانے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ خفا خفا سی اس پر نظر ڈا۔ بغیر بولی۔

''تم شرافت سے بیٹھ رہی ہو یا ہاتھ پکڑ کر بٹھاؤں۔'' وہ غرایا۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی میں انکل سے ملنے آئی ہوں۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کر پر دھکیلا اور بولا۔

''اپنے سے پچاس سال بڑے انکل تمہیں دوستی کرنے کے لیے بڑے موزوں لگتے ہیں اور صر

نچ چھ سال بڑے بندے سے تم بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہیں۔ ایسی ان میں کیا بات ہے جو مجھ میں ہیں۔ کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے؟'' اس بات پر اجالا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اس کا بے تکلف انداز اجالا کو حیران کر رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس سے بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا تم اس وجہ سے مجھ سے کترا رہی ہو۔ ایک دم بے وقوف ہو تم۔ انسان اپنی تکلیف میں، پریشانی یا غم میں اسی کے پاس جاتا ہے جس پر اسے بھروسہ ہوتا ہے جس کو وہ اپنا سمجھتا ہے گر تم ہمیں اپنا سمجھ کر ہمارے پاس آئی تھیں تو میں کیوں تمہارے بارے میں کوئی فضول بات سوچوں گا۔ یہ احمقانہ خیال اپنے دل سے نکال دو اور ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ برداشت، تحمل، رواداری اور اخلاق وغیرہ اچھی چیزیں ہیں لیکن بعض لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں پر ان جذبوں کو لٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چپ چاپ ظلم سہتا رہے وہ خود سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ کوئی تمہیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا منہ توڑ دو۔ مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں تمہیں بالکل اپنے جیسا بنا دوں گا۔ کوئی میرے ساتھ زیادتی کرنے کی جرات تو کیا ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ ایسا کرنے والے کو اپنا انجام پتا ہوتا ہے۔''

وہ بڑی سنجیدگی اور بردباری سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔ شاید انکل اسے اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اس کے بات کرنے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ وہ اپنا آپ اس کے سامنے ظاہر ہونے پر کوئی پریشانی محسوس کیے بغیر بولی۔

''لیکن انکل تو کہتے ہیں سب کو معاف کر دو۔''

''ہر جگہ معافی تلافی سے کام نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے ابھی تم نے معاف کر دیا لیکن پھر سے کوئی تمہیں دکھ دے تو زیادہ نیک پروین بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا حق چھین لو۔ کسی کو اپنا استحصال نہ کرنے دو۔ خاموشی سے بیٹھ کر آنسو بہانے اور سپر سینسیٹو ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ اسے ایک بہت ہی مختلف سبق پڑھا رہا تھا۔

''کچھ آیا سمجھ میں یا سر کے اوپر سے گزر گیا۔'' وہ اسے بغور اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکراتا ہوا بولا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر اس پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور سامنے کیاری میں بہار دکھاتے للی اور پائنا روز پر نظریں مرکوز کر دیں۔

''ویسے آپ کے انکل اپنے جگری دوست فاروقی صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں اور وہاں یقیناً شطرنج کی بساط بچھی ہو گی۔ رات سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' وہ اس کے جواب نہ دینے کا برا مانے بغیر انکل کے بارے میں بتانے لگا تو اسے اپنی یہاں موجودگی بڑی فضول لگی۔

''اچھا پھر میں چلتی ہوں۔''

''بیٹھی رہو ابھی سکون سے۔ جانے کی جلدی تو ایسے مچاتی ہو جیسے مسئلہ کشمیر و چیچنیا تمہارے ہی ہاتھوں آج ہی حل ہونا ہے۔'' اس نے جھڑکنے والے انداز میں کہا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''کل پاپا جانی کا برتھ ڈے ہے اور میں اس میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔'' اس کی بات پر وہ

خوش ہو کر بولی تھی۔

"آپ لوگ کیا کوئی فنکشن وغیرہ کرتے ہیں۔"

"نہیں خالی میں اور پاپا جانی ہم دونوں ہمیشہ ہی ایک دوسرے کی سالگرہ سیلیبریٹ کرتے ہیں ہم دونوں کے علاوہ اس میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ اس موقع پہ میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ ویسے سالگرہ میری ہو یا پاپا جانی کی ڈنر ہوتا انہیں کی طرف سے ہے۔ انہیں اپنے سے چھوٹوں سے تحفہ لینا پسند نہیں۔ اس لیے گفٹ لانے کی زحمت مت کرنا۔ میں بھی تمہاری طرح خالی ہاتھ شرکت کروں گا۔ پھر تم آر ہو۔" اس کی بات پر اس نے پرزور انداز میں گردن ہلا کر حامی بھری تھی۔

"کیک میں بیک کر کے لاؤں گی اس پر تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔" اس کی بات پر وہ [illegible] ہوئے بولا۔

"ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ کیک بنا ہوا کیسا ہے۔ اگر اچھا ہوا تو یقیناً ناراض نہیں ہوں گے۔" بات پر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اب آپ جا سکتی ہیں میری بات ختم ہو گئی ہے۔" وہ فوراً ایسے کھڑی ہوئی جیسے اس پہلے کسی نے باندھ کر بٹھایا ہوا تھا اور خدا حافظ کہتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ بڑے غور سے اسے ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رات اس نے دو گھنٹے صرف کر کے بڑی محنت اور لگن سے ایک خوب صورت سا برتھ ڈے کارڈ پھر اگلے روز صبح ہی بڑے اہتمام سے کچن میں گھس گئی۔ ان کا من پسند کیک بیک کیا اسے بڑی خو صورتی سے سجایا درمیان میں Many Happy returns of the day لکھا۔ اس کام فارغ ہو کر اس نے اپنے آج کے پہننے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ آج ایک طویل عرصے بعد بہت اچھی طرح سے ڈریس اپ ہونے کا دل چاہ رہا تھا۔ آخر یہ سالگرہ اس ہستی کی تھی جسے وہ پیار کرتی تھی تو کیوں نہ اہتمام کرتی۔ آف وائٹ کاٹن کی قمیص شلوار جس کی شرٹ پر ہم رنگ کڑھائی شیشے کا بڑا نفیس اور نازک سا کام بنا ہوا تھا ساتھ خوب لمبا سا آف وائٹ دوپٹہ پہن کر اس نے [illegible] سے مناسبت رکھتی ہلکی سی جیولری پہنی۔ بہت عرصے بعد میک اپ کیا اور شانوں تک آتے بالوں کو [illegible] وہ زیادہ تر کلپ یا بینڈ میں جکڑ کر رکھتی تھی برش کر کے یونہی کھلا چھوڑ دیا۔

ان کے گھر جانے کے لیے نکلی تو پہلے ایک فلاور شاپ سے پھولوں کا ایک حسین سا گلدستہ خریدا اس کے بعد ان کے گھر چلی آئی۔

انکل لاؤنج میں بیٹھے کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے اتنی سج دھج کے ساتھ ایک ہاتھ میں بکے اور دوسرے میں کیک اٹھا کر لاتے دیکھ کر وہ اپنی اگلی بات بھول گئے۔ ایک آدھ سیکنڈ کے سکتے کے بعد انہوں نے جلدی سے فون خدا حافظ کہہ کر بند کیا اور اس کی سمت توجہ کی۔ وہ ان کی حیرت پر [illegible] ہوئی ان کے قریب چلی آئی اور کیک ٹیبل پر رکھ کر ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر گنگنائی۔

"Happy birth day to you" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے ہنس کر بولے۔

"لیکن خاتون آپ ہیں کون اور اتنی بے تکلفی سے ہمارے گھر میں کہاں پھر رہی ہیں۔" وہ ان کی شرارت پر ہنس پڑی اور بولی۔

"میں اچھی لگ رہی ہوں نا۔"

"مجھے تم ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہو۔ ہاں البتہ آج پہچانی نہیں جا رہیں۔ ویسے تمہیں آج کے دن کا پتا کیسے چلا۔" وہ اس کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے۔

"مجھے اویس نے بتایا تھا بلکہ انہوں نے ہی مجھے انوائیٹ کیا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ میں بکے اور کارڈ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"بہت ہی خوب صورت پھول ہیں۔" انہوں نے پھولوں کی خوشبو محسوس کی پھر اس کے بعد اس کے بنائے ہوئے کارڈ کو خوب غور و فکر سے دیکھ کر اسے آرٹ کا نادر نمونہ قرار دیا اور کارڈ اور کارڈ بنانے والی دونوں کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔

"تمہیں بلا کر وہ حضرت خود تو ابھی تک گھر سے غائب ہیں۔" انکل نے ان کی غیر موجودگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے کیک کھول کر نکال کر رکھا۔ پھر کچن سے جا کر پلیٹیں، چمچے اور بٹر نائف لا کر ٹیبل کے اوپر رکھ دی وہ خاموشی سے بیٹھے اس کی تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ کیک کے اوپر کینڈلز لگا رہی تھی جب اویس نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ بلیک سوٹ پہنے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں موبائل تھامے وہ پاپا جانی کو سلام کرتے کرتے ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ بھی کینڈل سے توجہ ہٹا کر اسی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اپنے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پھیلنے والے ستائشی تاثرات کو فوراً چھپاتے ہوئے وہ بڑے نارمل طریقے سے پاپا جانی اور اس سے سلام دعا کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ کپڑے چینج کر کے آ گیا تو انکل نے کیک کاٹا۔ اپنے ہاتھ سے پہلے اسے اور پھر اویس کو کیک کھلایا۔

"چلو اجالا اب تم کیک سرو کرو۔" انکل نے اسے ہدایت دی تو وہ سلیقے سے پلیٹس میں کیک نکال کر انکل اور اسے پلیٹ دینے کے بعد اپنی پلیٹ لیے انکل کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اویس ٹیبل پر رکھے ہوئے کارڈ کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ تم نے بنایا ہے؟" اس نے گردن ہلا دی۔

"کتنا خوب صورت کارڈ بنایا ہے اجالا نے دیکھو میں ایسے ہی اس کی تعریف نہیں کرتا۔" انکل نے اویس کو مخاطب کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے کیک کھانے میں مصروف تھی۔

"ابھی اجالا مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ کیسی لگ رہی ہے۔" وہ پھر اویس سے مخاطب ہوئے تھے۔

"اف یہ انکل بھی کبھی کبھی کتنی بری طرح شرمندہ کروا دیتے ہیں۔ اس کے سامنے یہ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ سر جھکائے کچھ بوکھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اویس نے ایک تفصیلی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" وہ اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے یہ کوئی بہت ہی اہم اور سنجیدہ سا مسئلہ

ہے جس کا حل کیا جانا بے حد ضروری ہے۔

''میں نے کیا کہنا تھا ظاہر ہے وہ ہے ہی اچھی بہت اچھی خوب صورت، ذہین، گریس فل ا مزید کسی تعریف کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ وقت لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی۔ اویس نے ریسیور اٹھایا تو انکل کے کسی جاننے والے کی کال وہ اٹھ کر فون پر بات کرنے لگے تو اویس اس سے بولا۔

''میں بھی سوچ رہا ہوں کہ گندا میلا رہنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر جب اچانک کسی دن نہا صاف ستھرے حلیے میں نظر آؤں گا تو میرے اوپر بھی تعریفوں کے پھول نچھاور کیے جائیں گے۔' نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ویسے یہ کس بے چارے بیکر کی کاوشوں کو اپنے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔'' اس کی بات بری طرح چڑ گئی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں کیا یہ کیک کسی بیکری سے لائی ہوں۔''

''میں نے یہ کب کہا۔'' وہ معصومیت سے بولا۔ اس کی ناراضگی سے بھرپور شکل دیکھ کر وہ کھلکھ ہنس پڑا۔

''کیا میری سالگرہ پر تم میرے لیے بھی اپنے ہاتھ سے بنا کر کارڈ اور کیک لاؤ گی؟'' وہ ا آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں اور پھر یہ سنوں گی کہ یہ کیک کس بیکری سے اور کارڈ کسی آرٹسٹ سے بنوا کر اپنے نام دے رہی ہوں۔'' وہ اس کی الزام تراشی پر ناراض ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ مستقل مسکرائے جا رہا تھا۔ فون کر کے فارغ ہو گئے تو بولے۔

''چلو ڈنر کے لیے چلیں۔ آج اجالا کی پسند کی جگہ ہم لوگ ڈنر کریں گے۔'' کچھ دیر بعد و گاڑی میں بیٹھے میریٹ جا رہے تھے۔ راستے میں وہ انکل سے اپنے بزنس سے متعلق امور ڈ کرنے لگا تو وہ خاموشی سے بیٹھی اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ ہوٹل پہنچ کر وہ تینوں ایک ساتھ چلتے اندر داخل ہوئے۔ انکل نے ان دونوں کو آرڈر کرنے کے لیے کہا اس نے اپنی پسند کی دو تین بتا دیں اور اویس نے اپنی پسندیدہ ڈشز یعنی مختلف سلاد اور جھینگے وغیرہ کا آرڈر کر دیا۔

''یہ تم اتنے تکلف سے کیوں کھا رہی ہو۔'' انکل اسے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے ٹوکنے لگے۔

''آپ بے فکر رہیں انکل میں تکلف نہیں کر رہی۔'' وہ انہیں اطمینان دلانے لگی۔

''میرا خیال ہے اجالا تکلف نہیں بلکہ ڈائٹنگ کر رہی ہے۔'' اویس نے کولڈ ڈرنک کا سپ ہوئے کہا۔

''میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ اتنی سوکھی تنکا سی کیوں ہے اب پتا چلا یہ سب ڈائٹنگ کا کرشمہ ہے۔ کی بات پر اجالا نے سر اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔

''آپ ہر وقت میرے بارے میں کیوں سوچتے رہتے ہیں۔ دنیا میں میرے علاوہ اور بھی سے غور طلب مسائل ہیں۔'' انکل نے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹا کر ایک نظر اجالا کو اور ایک نظر ا

دیکھا۔ ایک طرف کسی پرانی بات کا بدلہ چکا لینے کی خوشی تھی تو دوسری طرف ایک محظوظ سی مسکراہٹ۔ وہاں اس وقت کسی گزری ہوئی بات کے حوالے سے جملہ اچھالا گیا تھا جس سے وہ قطعاً لاعلم تھے۔ کمال ہے بچوں نے اتنی ترقی کر لی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا انہوں نے خود کو ڈپٹا۔ جو بھی تھا ان دونوں کی ایک دوسرے سے بے تکلف بات چیت انہیں خوش کر رہی تھی۔ جن دو لوگوں کو وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے حوالے سے انہوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے ان کی یہ نوک جھونک انہیں مسرت بخش رہی تھی۔

وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت اور لبوں کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بات کو بہت انجوائے کر رہا ہے۔ اپنے خیال سے اس نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی مسلسل شوخ سی مسکراہٹ اسے کوفت میں مبتلا کرنے لگی۔ وہ تو چڑنے کے بجائے بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ واپسی میں وہ گاڑی چلاتا بیک ویو مرر کے ذریعے ایک آدھ نظر اس کے پھولے ہوئے منہ پر بھی ڈال لیتا اور خوامخواہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رکی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسی وقت سامنے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی تھیں۔ اجالا نے سامنے دیکھا تو سعود اور ماریہ بیٹھے نظر آئے۔ چوکیدار نے گاڑی کا ہارن سن کر گیٹ کھول دیا تھا لیکن وہ گاڑی اندر لے جانے کے بجائے وہیں روک کر گاڑی سے اتر کر ان لوگوں کی طرف چلا آیا۔ اس کی چال میں بہت تیزی اور عجلت نظر آ رہی تھی۔ وہ سیدھا ڈرائیونگ سیٹ کے نزدیک پہنچ گیا اور بڑی گرم جوشی اور سرخوشی کے عالم میں اویس سے مخاطب ہوا۔

''آہا اویس لودھی اور ہمارے گھر۔'' اویس گاڑی سے اتر کر اس سے ہاتھ ملانے لگا۔ شوہر کو کسی کے ساتھ اتنی خوش گواری سے ملتے دیکھ کر ماریہ بھی ادھر ہی چلی گئی۔

''یہ اتنے ہینڈسم بندے کے ساتھ اجالا کا کیا کام۔'' اس کے چہرے کی حیرت اور ناگواری چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ اویس کا سعود کی گرم جوشی کے جواب میں وہی لیا دیا اور فارمل سا انداز تھا۔ اس کا وہی مخصوص انداز جس کی بدولت سامنے والا اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہ بندہ اتنی بے تکلفی سے جملے کستا مسکرا رہا تھا۔

''یہ اجالا تو بڑی ہی بد اخلاق ہے۔ آپ لوگوں کو اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہا۔'' اویس کے آگے تقریباً بچھتا ہوا سعود اسے اس وقت ہمیشہ سے بھی زیادہ برا لگا۔ ''کاش سعود تم اتنے کمینے نہ ہوتے اور اگر ایسے ہی تھے تو کم از کم میرے بھائی نہ ہوتے۔'' اس کا خوشامدانہ اور چاپلوس انداز اجالا کا حلق کڑوا کر رہا تھا۔ اسی وقت سعود کی نظر برابر کی سیٹ پر بیٹھے انکل پر پڑی تو اویس نے بڑے عام سے انداز میں تعارف کروا دیا۔

''میرے گرینڈ فادر سید مبشر لودھی۔'' سعود اب ان سے بچھ بچھ کر سلام دعا کر رہا تھا۔ ان کی قیمتی گاڑی اور شاندار پرسنیلٹی سے ماریہ اندازہ تو لگا چکی تھی کہ شوہر کسی غلط آدمی پر فدا نہیں ہو رہا اس لیے خود بھی اپنی ساڑی کا پلو سنبھالتی مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔ سعود کے بے حد اصرار سے اندر بلانے پر ان لوگوں نے معذرت کرتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

اویس نے ایک گہری نظر اس کے ناراض اور کوفت زدہ چہرے پر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی

تھی۔ اندر آتے ہی سعود نے اس سے پوچھا تھا۔
"تم اویس کو کیسے جانتی ہو؟"
"میرے ان سے فیملی ٹرمز ہیں۔" وہ مختصر جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انکل کی ہدایت کی بدولت اس نے سب کے ساتھ نارمل طریقے سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر بھی گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے لگی تھی۔
"تم مبشر لودھی کی فیملی کو کب سے جانتی ہو۔" صبح ناشتے کی میز پر ڈیڈی نے پتا نہیں کتنے عرصے بعد اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔
"بہت عرصے سے۔" وہ سعود کی اتنی جلدی خبر پہنچانے پہ حیران تھی۔ یہ سعود تو B.B.C اور وائس آف امریکہ سے بھی کہیں آگے ہے۔ وہ دل ہی دل میں اسے سراہنے لگی۔ ڈیڈی اب ممی سے مخاطب تھے۔
"بہت بڑے گروپ آف انڈسٹریز کا تنہا وارث ہے یہ اویس لودھی۔ آج کل بزنس سرکل میں سب سے ہارٹ ایشو اس کی شادی بنی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے تو خالی دوستی ہونا بھی کسی فائدے سے خالی نہیں۔ کتنے ہی بڑے بڑے خاندان اپنی بیٹیوں کا رشتہ اس سے طے کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا خود کا انٹرسٹ کس طرف ہے یہ واضح نہیں ہو پا رہا۔"
ماریہ نے بڑی جیلس نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کا خوامخواہ قہقہہ لگا کر ہنسنے کو دل چاہنے لگا۔
"یہیں فیز فائیو میں گھر ہے اس کا۔ ایسا کرو اجالا ان لوگوں کو اس سنڈے کو ڈنر پر انوائیٹ کر لو۔" ڈیڈی نے پہلے ممی اور بعد میں اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک دم میز پر بیٹھے تمام لوگوں کو اپنے سے اونچی کوئی خاص چیز لگنے لگی تھی۔ وہ مرکز نگاہ بنی تھی تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف تھا۔ سوائے دعا کے اس وقت ٹیبل پر گھر کے تمام افراد موجود تھے۔
"آپ لوگ نفع نقصان سے قطع نظر بھی انسان کو انسان سمجھ کر کیوں نہیں ملتے۔ اس سے ملو یہاں سے فائدہ ہوگا۔ اس سے نہ ملو کوئی فائدہ نہیں۔ اسے کچلتے ہوئے گزر جاؤ۔ اسے دھکیل کر اپنے لیے راستہ بناؤ۔ اس کے سر پر سوار ہو کر اونچے ہو جاؤ آپ لوگ اتنے گھٹیا کیوں ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سب سے مخاطب تھی۔ ڈیڈی کو اس نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔
"میں اس جہنم میں انہیں کبھی بھی نہ بلاؤں۔ یہ رشتے اور محبتیں میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیے ہیں میں آپ لوگوں کی خودغرض کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی انہیں۔" وہ عزم مصمم کر چکی تھی۔ سعود ڈیڈی سے کہہ رہا تھا۔
"اپنے آپ پر بڑا غرور ہے اسے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔"
سعود کی بات پر وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھی۔ "کل اسی مغرور ہستی کے سامنے تم بچھ بچھ جا رہے تھے۔ تمہارا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے آگے لیٹ جاؤ اور کہو کہ سر آئیے میرے اوپر سے گزر کر جائیے۔" وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہی تھی۔
"وہ جیسا بھی ہے تم لوگوں کی طرح منافق اور دغاباز نہیں ہے۔" وہ ناشتے کی ٹیبل پر سے اٹھ گئی

ی۔ وہ اب انکل سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی انہوں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ چھوٹی ر بڑی سے بڑی ہر بات انہیں بتائے گی۔ کبھی بھی ان سے کچھ سیکریٹ رکھنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ی لیے وہ انہیں اپنے گھر والوں کے تازہ ترین رویے کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھی۔ اسی پر وہ اگلے روز شام کے وقت ان کے گھر چلی آئی تھی۔ گو آج چھٹی کا دن تھا لیکن اب اسے اویس کا امنا ہونے پر کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پہنچی تو پتا چلا کہ انکل کے کچھ مہمان آئے ے ہیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ان کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں۔ وہ ان کے فارغ نے کا انتظار کرنے لگی۔ اکیلے لاؤنج میں بیٹھے بوریت ہونے لگی تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ ادہ تو یہ تھا کہ اسٹڈی میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ ہی کر لیا جائے لیکن کوریڈور سے گزرتے سامنے لے کمرے سے آتی بڑی خوب صورت سی موسیقی کی آواز نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گٹار پر بڑی ب صورت سی دھن بجائی جا رہی تھی۔ بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے ور کشن پر بیٹھے اویس کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں اپنے اردگرد سے غافل گٹار بار رہا تھا۔ وہ فوراً ہی دروازے سے پلٹ جانا چاہتی تھی کہ اویس کی نظر اس پر پڑی۔
"اجالا۔" وہ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوا تھا۔
"آئم سوری مجھے پتا نہیں تھا یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔" وہ اپنی بدتہذیبی پر شرمندہ ہوتی فوراً وہاں ے چلی جانا چاہتی تھی۔ کسی کے کمرے میں بغیر ناک کیے جانا یقیناً کوئی قابل تعریف فعل نہیں تھا۔ لیکن کمرے کا مالک اس کے اس طرح آنے کا برا مانے بغیر بولا۔
"کم آن اجالا یہ تم اتنی فارمل کب سے ہو گئی ہو اور اب اگر آ ہی گئی ہو تو اندر تو آ جاؤ۔" وہ اندر آنے یں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔
"اب آ بھی چکو۔" وہ دوبارہ اصرار کرنے لگا تو وہ کچھ شرمندگی کے عالم میں اندر آ گئی اور اس کے سامنے رکھے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔
"تم کب آئیں۔ مجھے پتا نہیں چلا۔" وہ پوچھنے لگا تو وہ جواب میں بولی۔
"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ انکل کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اسٹڈی میں کوئی کتاب پڑھ لوں گی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے گٹار کی اتنی اچھی اور خوب صورت دھن کی آواز آئی تو یں ادھر آ گئی۔" اس کی بات پر وہ ہنس پڑا۔
"تمہیں میوزک میں انٹرسٹ ہے۔" وہ گٹار سائڈ میں رکھتا ہوا اس سے بولا تو اس نے گردن ہلا دی۔
"آپ نے کیا کہیں سے سیکھا ہے گٹار بجانا۔"
"ارے نہیں بھئی یہ تو بس یونہی شوقیہ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ میرا بچپن کا شوق ہے کالج اور پھر یونیورسٹی کے زمانے میں دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر انہیں گٹار پر اپنی پسندیدہ دھنیں سنایا کرتا تھا۔ آج تو کئی سالوں کے بعد اچانک ہی میرا دل چاہا تو گٹار نکال کر خود کو چیک کر رہا تھا کہ مجھے بجانا یاد بھی ہے یا بھول گیا۔"

''لیکن آپ کا اسٹائل تو بڑا پرفیکٹ بلکہ پروفیشنل قسم کا ہے۔'' اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''بس میری اور تعریف مت کرنا ورنہ میں واقعی آسمان پر چڑھ جاؤں گا۔'' جواب میں وہ بھی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ہنستے ہنستے اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

''تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔'' فوراً ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے تھے۔ وہ اس کی کنفیوژن دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر یہاں تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنی تعریف پر خوش ہوتی اور مجھے تھینکس تو ضرور کہتی۔'' وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا جلدی سے اٹھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ ''میں اتنے سال پڑھائی کی وجہ سے یہاں سے دور رہا لیکن ہمیشہ ہی سنتا تھا کہ ہمارے ہاں کی لڑکیاں بڑی شرمیلی اور مشرقی قسم کی ہوتی ہیں۔ جب واپس آیا تو پتا چلا کے دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی لڑکیوں نے تو یورپ اور امریکہ کی خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایسے میں تم جیسی چیزیں شاید اللہ تعالیٰ نے مثال دینے کے لیے چھوڑ دی ہیں۔'' وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے بول رہا تھا۔

''ویسے تم ہو کیا چیز۔ مجھے تو تم چودھویں یا پندرہویں صدی کی کوئی بھٹکی ہوئی روح معلوم ہوتی ہو۔ اس زمانے میں تمہارا کیا کام؟'' اس کی بات پر وہ کچھ ناراض لہجے میں بولی۔

''میں نے آپ سے اپنے بارے میں کوئی رائے تو نہیں مانگی۔ میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔'' وہ اس کی ناراضگی کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگا۔

''پاپا جانی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں جان کر اجالا کے ساتھ الٹی سیدھی بکواس کرتا ہوں۔ صرف اس کا شرم سے لال گلابی ہوتا چہرہ دیکھنے کے لیے۔''

وہ اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے قصداً کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہ کچھ دیر بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے تمہاری کوئی خاطر مدارات تو کی نہیں۔ آخر تم پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی ہو۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اٹھا اور بیڈ روم ریفریجریٹر سے پیپسی کے دو کین نکال لایا۔ ایک اس کے ہاتھ میں پکڑا کر دوسرا خود لے کر بیٹھ گیا۔ اپنے سامنے رکھی ڈرائی فروٹس کی پلیٹ بھی اس کی طرف کھسکا دی۔ ''لو۔ آؤ میں تمہیں اپنی پسندیدہ دھن سناؤں؟'' وہ صرف اپنے گلے پڑے شرمیلے پن کا لبادہ اتارنے کے لیے گردن ہلا گئی۔ وہ دو تین گھونٹ میں پیپسی ختم کرتا گٹار اٹھا کر بجانے لگا اور جس دھن کی وجہ سے وہ کھنچتی ہوئی اس کمرے تک چلی آئی تھی وہ کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا اچھا گٹار بجا رہا تھا، وہ بڑی دلچسپی اور شوق سے گٹار بجاتا سنتی رہی اس نے اپنی پسندیدہ دھن مکمل بجائی تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

''بہت خوب۔''

''تمہیں اچھا لگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بہت اچھا۔'' وہ کھلے دل سے تعریف کر گئی۔ وہ کچھ کہے بغیر ایک اور دھن بجانے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی گٹار کے تاروں کو چھوتے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پوری طرح کھوئی ہوئی اسے سن رہی تھی۔

''تمہیں کس قسم کا میوزک پسند ہے؟'' وہ دوسری دھن بجا چکا تو اس سے پوچھنے لگا۔

''مجھے آپ کی طرح میوزک کی زیادہ سمجھ تو نہیں ہے لیکن بس جو بھی کانوں کو اچھا لگے۔ تیز تیز اچھلتے کودتے گانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ سلو اور لائٹ میوزک اچھا لگتا ہے۔'' وہ اپنی پسند بتانے لگی۔

''اچھا تمہارے فیورٹ گلوکار کون کون ہیں؟'' اس کی بات پر وہ فوراً بولی۔

''مجھے نیرہ نور اور جنید جمشید بہت پسند ہیں۔''

''چلو تو پھر تمہیں تمہارے فیورٹ سنگرز کا کچھ سناتے ہیں۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے وہ بطورِ خاص صرف اس کا گٹار سننے یہاں آئی تھی اور وہ خود بھی بڑی فرصت کے ساتھ سنانے کے لیے کب سے تیار بیٹھا تھا۔ پھر وہ جنید جمشید کا ''اعتبار بھی آ ہی جائے گا۔ چلو تو سہی'' بجانے لگا۔ اس کے بعد ''تیرے لیے ہے میرا دل میری جان۔'' بجانے لگا۔ وہ بری محویت کے ساتھ اس کے ردھم میں کھوئی ہوئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اویس نے گٹار روک کر ''پلیز کم ان'' کہا تو اخلاق اندر آ گیا۔ اس پر نظر پڑی تو کہنے لگا۔

''صاحب اور میں دونوں مل کر آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ اب میں اویس بھائی سے آپ کا پوچھنے آیا تھا۔'' اس کی بات سن کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

''انکل کے مہمان چلے گئے۔''

''جی کب کے اب تو وہ ہم لوگوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔'' وہ دانت نکال کر بولا۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ انکل سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے تو ان کی طرف چلی آئی۔

''کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ اجالا آخر مجھ سے ملے بغیر اور کچھ کہے بغیر کیسے چلی گئی۔'' وہ اپنے اتنی دیر تک وہاں بیٹھنے پر کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں یہیں تھی۔''

''یہیں کہاں تھیں یہ بھی تو بتاؤ۔''

''آپ تو اپنے مہمانوں میں مصروف تھے اور میں آپ کی لاڈلی کو کمپنی دے رہا تھا۔'' اس نے پیچھے اویس کی آواز سنی۔ انکل اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''کمپنی کس طرح دے رہے تھے لطیفے تو تمہیں آتے نہیں اور باتیں تم اتنی بور کرتے ہو کہ وہ میں ہی بمشکل برداشت کرتا ہوں۔''

''پوچھ لیں اس سے۔ بتاؤ اجالا میری کمپنی بور ہے۔'' وہ اسے درمیان میں گھسیٹنے لگا تو وہ انکل سے کہنے لگی ''نہیں انہوں نے مجھے بالکل بھی بور نہیں ہونے دیا۔'' آخر اس نے اتنی دیر تک کسی پروفیشنل گٹار بجانے والے کی طرح اسے لائیو اپنے شو سے محظوظ کیا تھا وہ اس کی برائی کیسے کر سکتی تھی۔

''تم اس کی کچھ زیادہ ہی فیور نہیں کرنے لگیں۔'' انکل نے اسے بغور دیکھتے کہا تو وہ کچھ دیر پہلے سنے گئے کمنٹس کو بھلائے دوبارہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ سچ کہتی ہے دعا میں کسی مڈل کلاس بلکہ لوئر مڈل کلاس

گھرانے کے لیے بڑی سوٹ ایبل تھی۔ وہ خود کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

”حق بات آپ کو فیور لگ رہی ہے۔ وہ بچی ہے اس لیے سچائی کا ساتھ دے رہی ہے۔“ ا
مشکل میں پڑتا محسوس کر کے وہ فوراً میدان میں اتر آیا۔

”اوہو تو آپ بھی۔۔۔“ انکل کی بات پر اویس تو بڑی بے فکری سے ہنس پڑا تھا جبکہ وہ ان دا
کے بیچ سینڈوچ بنی اپنے آج کے آنے کو کوس رہی تھی۔ انکل نے اس کے چہرے پر ایک تفصیلی نظر
اور بولے۔

”چلو نیچے لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔“ وہ اب مزید اسی طر
باتیں سننا نہیں چاہتی تھی لیکن اس طرح اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے نیچے ان لوگوں کے ساتھ
بیٹھ گئی۔ اویس کو اپنے کسی دوست سے ملنے جانا تھا سو وہ پانچ دس منٹ بعد ہی ایکسکیوز کرتا چلا گیا۔
کے جانے کے بعد انکل بھی اپنی معنی خیز گفتگو سے باز آ گئے تو اس نے سکون کا سانس لیا اور انہیں اپ
کی وجہ بتانے لگی۔

☆☆☆

وہ تھکی ہاری ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔ ان دنوں فائنل ایئر کے تھیسس ڈسپلے کی وجہ سے وہ
مصروف تھی۔ اس وقت بھی شام کے چھ بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کم
میں جا رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے دعا کی آواز سنی۔

”اجالا تمہارا فون ہے۔“ وہ لاؤنج میں کھڑی ریسیور ہاتھ میں لیے اس سے بولی تو وہ د
سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آ گئی۔ دعا ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر میگ
دیکھنے لگی۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آتی اویس کی آواز کو سن کر وہ حیران رہ گ

”آپ تو نیویارک گئے ہوئے تھے۔“

”ساری زندگی کے لیے نہیں گیا تھا۔ آخر کار مجھے واپس بھی آنا تھا۔“ وہ بڑا چڑ کر بولا تھا وہ اس
فون کرنے کی وجہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

”سب خیریت تو ہے نا انکل کیسے ہیں؟“

”آپ کے انکل آپ کی جدائی میں آہیں بھر رہے ہیں کہ میں نے اپنی لاڈلی کی شکل تین دن
نہیں دیکھی۔ تم آج کل ہو کہاں؟“ وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

”فائنل والوں کے تھیسس ڈسپلے کی وجہ سے مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن میری کل تو انکل
بات ہوئی تھی۔“ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ بتانے لگی۔

پانچ دن ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے تمہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ آ کر خیریت ہی پوچھ لو۔
ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ کون سا دو سال بعد آئے ہیں۔ صرف دس دن میں تو آ گئے ہیں اور اس طرح کے
ٹورز تو آپ کے مہینے میں پتا نہیں کتنی بار ہوتے ہیں۔ اس میں خیریت پوچھنے والی کون سی بات ہے۔

”تم بس میرا دل جلایا کرو۔ کل پوری شام یہ سوچ کر میں نہیں گیا کہ شاید محترمہ آ جائیں۔ اچھا
کچھ تمہارے لیے دو چار چیزیں لایا تھا۔ تم نے تو نہ آنے کی قسم کھائی ہے شاید اسی لیے میں ڈرائیور کے
تھ وہ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔“ وہ خفگی بھرے انداز میں بولا تو وہ اس کے اپنائیت بھرے شکوہ شکایت پر کچھ
یرت زدہ ہوتی ہوئی بولی۔

”آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔“ وہ اس کی بات پر غرایا۔

”میں نے، اس کی کیا ضرورت تھی اور آپ کو تکلیف ہوئی جیسی باتیں سننے کے لیے فون نہیں کیا
تھا۔ صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے وہ چیزیں قبول کر کے میرے اوپر احسان عظیم کر دو۔ خدا حافظ۔“
وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی فون رکھ چکا تھا وہ بھی جواب میں ایک گہری سانس لیتی ہوئی فون رکھ کر پلٹنے
لگی تو دعا میگزین سے نظریں ہٹا کر بولی۔

”یہ اویس وہی لودھی گروپ آف انڈسٹری والا ہی ہے نا۔“ وہ اس کی بات پر ہنستے ہوئے بولی۔

”کمال ہے یہ اویس اتنی مشہور و معروف شخصیت کب سے ہو گیا کہ لوگ اسے نام سے پہچاننے
لگے۔“

دعا اس کی بات نظر انداز کر کے کہنے لگی۔

”کیا اسی کو ڈنر پر انوائیٹ کرنے کی بات ڈیڈی کل تمہیں یاد نہیں کروا رہے تھے۔“ ڈیڈی نے اس
روز کے بعد دو تین مرتبہ اسے یاد دہانی کروائی تھی کہ وہ ان لوگوں کو کھانے پر بلائے۔ اس نے دعا کی بات
پر سر ہلا دیا ”وہ تو بڑا مغرور سا بندہ ہے۔ تمہارے ساتھ اس کے کس قسم کے تعلقات ہیں۔“ وہ اس کی
طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ہم اچھے دوست ہیں۔“ اس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ اسی وقت ملازم ایک شوپر ہاتھ میں
لیے اس کی طرف آتا نظر آیا تو چپ ہو گئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بیگ لیتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی
بھیجی ہوئی تمام چیزیں بستر پر پھیلائے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا میں اتنی اہم ہوں کہ کوئی مجھے یاد رکھے۔ اپنی
مصروفیت میں بھی اسے میرا دھیان رہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ”اہم ہونا خوب صورت ہے، خوب
صورت ہونا اہم نہیں۔“ اور آج اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں مکمل طور پر آ گیا تھا۔ کیا میں بھی کسی کے
لیے اسپیشل ہو سکتی ہوں۔ وہ شخص جو اپنے آگے اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتا اسے میری پروا ہے۔
انکل آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ زندگی اگلے موڑ پر میرے لیے بہت سی خوشیاں لیے کھڑی ہے۔ اس
وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری خوشیوں کا ہر در آپ ہی کے گھر میں کھلتا ہے۔ مجھے شاید اب
زندگی میں وہ سب کچھ ملنے والا ہے جو میں چاہتی تھی سچی محبت، خلوص اور اپنائیت۔

اس نے اپنی زندگی کی چھبیس سال محبتوں کی تلاش میں گزارے تھے اور اب اچانک ہی اس پر
چاروں طرف سے محبتوں اور چاہتوں کے پھول برسنے لگے۔ انکل کی شفقت اور محبت کے ساتھ ساتھ
ایک بالکل ہی مختلف قسم کی محبت سے وہ پہلی بار روشناس ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز وہ اپنی تمام تر تھکن اور مصروفیت کے باوجود ان کے گھر چلی آئی تھی۔ وہ کسی ڈز میں
ہوا تھا۔ کچھ دیر انکل سے گپ شپ لگا کر وہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا تھینک یو کا کارڈ
کے کمرے میں جا کر میز پر رکھ آئی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ تمام گھر والوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب حمیدہ نے اسے بتایا کہ اس کا فو
ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی کرسی پر سے کھڑی ہوگئی۔ فون اٹینڈ کیے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف کو
ہے۔ اس کے ہیلو کے جواب میں وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تمہارے تھینک کا تھینک۔'' اس کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھی ''رات کو میں دیر سے آیا تھا او
اسی وقت تمہیں فون کرتا۔ ابھی بھی آفس جانے کی تیاری کرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں فون کر رہا ہوں۔
تم یقین کرو گی کہ میں اس وقت ٹائی باندھتا ہوا تم سے بات کر رہا ہوں۔'' اس بات پر وہ حیرت
بولی۔

''ایک ہاتھ سے ٹائی باندھ رہے ہیں؟''

''نہیں باندھ تو دونوں ہاتھوں سے رہا ہوں۔ موبائل میں نے کندھے کے سہارے کان سے ا
ہوا ہے۔'' وہ اپنی کیفیت کا خود ہی مزہ لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''چیک کر لیجیے گا کہ کہیں بات کرنے میں ناٹ صحیح نہ بنی ہو اور آفس پہنچنے پر آپ کی خوب صور
سی سیکریٹری صحیح ٹائی نہ باندھنے پر آپ کے اوپر ہنسنے لگے۔'' وہ شرارتی انداز میں بولی تو وہ کہنے لگا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میری سیکریٹری بہت خوب صورت ہے۔'' بڑا سنجیدہ سا لہجہ تھا۔

''میں نے صرف خوب صورت کہا تھا۔ بہت کا اضافہ آپ نے خود کیا ہے۔'' وہ اس کی بات
قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''اچھا میں اپنے جملے میں سے لفظ بہت کو ہٹا رہا ہوں۔ وہ صرف خوب صورت ہے۔'' اسی وق
اس نے دوسری جانب اخلاق کی آواز سنی تھی وہ اسے ناشتے کے لیے بلانے آیا تھا۔

''پاپا جانی ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں اس لیے خدا حافظ۔'' وہ عجلت بھرے انداز میں بولا تو
بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کرنے لگی کہ اچانک وہ بول پڑا تھا۔

''کل سنڈے ہے اور تم نے کل ہر قیمت پر گھر آنا ہے اور اگر تم نہیں آئیں تو میں تم سے اچھی طر
سمجھ لوں گا۔'' اس کی دھمکی پر وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''دیکھوں گی اگر ٹائم ملا تو آؤں گی۔'' پھر اس کا جواب سنے بغیر اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ واپس ٹیبل پر آئی تو دعا اس سے پوچھنے لگی۔ باقی تمام لوگ ناشتا کر کے ا
چکے تھے۔ اسے یہ بلاوجہ کی پوچھ گچھ پسند نہ آئی۔ جب میں ان لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہ
کرتی تو انہیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے ذاتی معاملے میں انوالو ہوں۔

''اویس کا تھا۔'' اس نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی اسی لیے لہجہ بڑا روڈ ا
بدتمیز تھا۔

''تم اسے پسند کرتی ہو؟'' دعا نے آملیٹ کھاتے ہوئے پوچھا تو وہ بڑے غصے سے بولی۔

''میرا اس سے جو بھی تعلق ہے۔ تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز مائنڈ یور او

نس۔''

''تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ میں اسے پہلے سے جانتی ہوں اس لیے اتنا انٹرسٹ شو کر رہی
ی۔ وہ ہمارے انسٹیٹیوٹ میں ایکسٹینشن لیکچر دینے آیا تھا ایک مرتبہ میں تب سے اسے جانتی ہوں۔
ی کزن فائزہ میری کلاس فیلو ہے۔ پھر ایک مرتبہ سر علوی کی دی ہوئی اسائنمنٹ کے سلسلے میں کچھ
یڈلس لینے کے لیے بھی میں اور فائزہ اس کے آفس گئے تھے۔ فائزہ بتا رہی تھی کہ اوپر اوپر سے بڑا لیا
ا اور سوبر نظر آتا ہے اندر سے ایک نمبر کا فلرٹ ہے یہ، اوپر سے دولت اور شکل صورت بھی خدا نے کچھ
یادہ ہی اچھی دے دی ہے اس لیے اسے خوب اچھی طرح کیش کراتا ہے۔'' وہ اس کی بات کا بھی کوئی
ں لیے بغیر ناشتا کرتی رہی تو وہ بھی چپ ہوگئی۔

''ان فائزہ صاحبہ کو اس نے منہ نہیں لگایا ہوگا اس لیے اس کے بارے میں الٹا سیدھا پروپیگنڈا
رتی پھر رہی ہیں۔'' اسکول جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے اس نے سوچا تھا۔ وہ اتنا ڈیسنٹ ہے اتنا
ہرڈ اور وہ کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس نے حتمی طور پر یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ ان کے گھر پہنچی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ انکل اور اویس دونوں ہی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی
یھ رہے تھے۔ اویس اسے دیکھ کر بڑے بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

''یہ سورج آج کدھر سے نکلا ہے۔ اتنی مصروف شخصیت ہمارے گھر آئی ہے۔'' انکل نے اسے
رکرتے ہوئے کہا۔

''پرسوں شام میں تو آئی تھی انکل آپ کی یادداشت کو کیا ہوگیا ہے۔''

''کل کیوں نہیں آئیں۔ میں پارک میں بھی انتظار کرتا رہا۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''کل میں اتنے دنوں کی تھکن اتار رہی تھی۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ٹی وی پر آتے
رکٹ میچ کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔

''یہ کیا بور چیز دیکھ رہے ہیں آپ؟''

''ارے بڑا زبردست میچ آ رہا ہے۔ پاکستان اور ساؤتھ افریقہ کا فائنل ہے۔ پاکستان نے بڑا
ھا ٹارگٹ دیا ہے۔ دو سو نوے کا ٹارگٹ وہ مشکل ہی کر پائیں گے۔ اوپر سے پاکستان کا مضبوط بولنگ
یک۔'' انکل نے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''یہ مصیبت سارا سال ہی پیچھے پڑی رہتی ہے اور ہماری قوم کو تو کہیں کا نہیں چھوڑا اس کرکٹ فوبیا
نے۔'' اس نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح اظہار کیا۔

''تم لڑکیوں کے تو بڑے فیورٹ ہوتے ہیں یہ کرکٹرز بلکہ تم ہی لوگ انہیں آسمان پر چڑھا کر کوئی
ائی مخلوق بنانے میں پیش پیش ہوتی ہو۔ میں نے کل ہی پڑھا تھا کہ ایک بے چارے کرکٹر نے لڑکیوں
ا فون کالوں سے تنگ آ کر پندرہویں دفعہ اپنا موبائل نمبر اور بیسویں دفعہ گھر کا فون نمبر تبدیل کروایا
ہے۔'' اویس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”صرف چند بے وقوف اور نیم پڑھی لکھی لڑکیوں کی حرکتوں کی وجہ سے آپ تمام لڑکیوں نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ تر لڑکیاں پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں کو اپنا آئیڈیل بناتی ہیں۔“ وہ خاصا برا مان کر بولی تھی۔

”یعنی میرے جیسوں کو۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ انکل ان دونوں کی بات سے محظوظ ہوتے مسکرا رہے تھے۔

”بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”پھر تمہاری ڈکشنری میں پڑھا لکھا اور ذہین کیسا شخص ہے؟“

وہ غصے سے بولا تو وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگی۔

”انکل جیسا، اس لیے کہ وہ خود کو ذہین پوز نہیں کرتے بلکہ وہ ہیں ہی ذہین۔“ اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ ”بھئی میری بیٹی نے صبح صبح دل خوش کر دیا۔“ وہ اس کی بات کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ اسی وقت ساؤتھ افریقہ کا اوپنر آؤٹ ہو گیا تو انکل اور اویس دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ کچھ بور ہو کر پاس رکھا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ دونوں بڑے انہماک سے میچ دیکھ رہے تھے۔ انکل سائڈ میں رکھے سنگل صوفے پر بیٹھے تھے جبکہ وہ اور اویس برابر والے صوفے پر تھے۔ اس کے اور اویس کے درمیان ڈھیر سارے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ شاید اسے چھٹی والے دن بہت سے اخبارات کا مطالعہ کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اخبار میں اپنے پسندیدہ صفحے پر موجود مختلف پزل حل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ لفظ Preconceive کے Alphabet سے بننے والے الفاظ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی کوششوں کے بعد بھی صرف پندرہ لفظ ہی بن پائے تو وہ اویس سے بولی۔

”Preconceive میں اسے بننے والے کوئی الفاظ بتائیں۔“

”اپنے جینئس انکل سے پوچھو۔“ وہ اس کی طرف نظر ڈالے بغیر بولا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی

”آپ انکل سے جیلس ہو رہے ہیں؟“ وہ اس کی بات کے جواب میں دانت پیستا ہوا دھیمی آواز میں بولا۔

”تمہیں تو میں بعد میں بتاؤں گا۔“ انکل ان دونوں کی سرگوشیانہ گفتگو سے لاتعلق میچ دیکھنے میں مگن تھے۔ ان دونوں کی میچ میں اتنی دلچسپی دیکھ کر وہ وہاں سے کھڑی ہو گئی اور یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے کچن تک آ گئی۔ یہاں آ کر خیال آیا بور ہونے سے بہتر ہے کچھ پکا لیا جائے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتا شاہد جلدی جلدی کام نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کا انٹرسٹ بھی میچ ہی میں تھا۔ اس نے شاہد کو کچن سے فارغ کیا اور خود کچھ پکانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ چکن کڑھائی کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے وہ زور و شور سے آنسو بہا رہی تھی۔ جب اویس کچن میں داخل ہوا۔

”کیا ہوا؟“ وہ ایک دم تشویش میں مبتلا ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا، پیاز کاٹ رہی ہوں۔“ وہ شرٹ کی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی

”اتنے اسٹوپڈ کام کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ چھوڑو اسے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے پیاز رکھنے لگا۔

”کیا ہے، خود تو میچ دیکھ رہے ہیں۔ میں اکیلی بور ہو رہی ہوں۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

”اچھا تم آؤ تو سہی۔ اب بور نہیں ہونے دوں گا۔ آؤ تمہیں preconceive سے بہت سے لفظ بنواؤں۔“ وہ اسے اصرار سے چلنے کے لیے کہنے لگا۔

”اب میرا موڈ کھانا پکانے کا بن چکا ہے اور اب میں یہاں سے چکن کڑھائی پکا کر ہی نکلوں گی آپ جائیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ کندھے اچکا کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر واپس لاؤنج میں چلا گیا۔ چکن چڑھ گئی تو وہ کل ہی ایک اٹالین شیف کی ٹی وی پر سکھائی گئی اٹالین اسٹائل کی سلاد بنانے لگی۔ لاؤنج سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد انکل اور اویس کی آوازیں بھی آ رہی تھیں وہ میچ پر رواں تبصرہ کر رہے تھے۔

وہ تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو دو بج رہے تھے۔ ان لوگوں کو تو شاید کرکٹ کی دھن میں کھانا، کھانا بھول گیا تھا۔ لیکن خود اسے بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے جلدی جلدی کھانا، لگانا شروع کر دیا۔ کھانا لگ گیا تو انہیں بلانے کے لیے آ گئی ”کیا پک رہا ہے۔ بھئی بڑی زبردست خوشبو آ رہی ہے۔“ انکل نے اسے دیکھ کر کہا۔

”آپ کھا کر بتایئے گا۔“ وہ باہر ہوتی ہوئی بارش دیکھ کر دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو تین منٹ تک باہر کا نظارہ کرنے کے بعد ان سے بولی۔

”انکل مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اسے چمکارتے ہوئے کہنے لگے۔

”شاہد سے کہو کھانا لگانے کے لیے۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے جواب دیا تو وہ بری طرح چڑ کر آگے بڑھی اور ٹی وی آف کر دیا۔ اس کی اس حرکت پر انکل ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اویس تو پہلے ہی اٹھ کر شاید ہاتھ دھونے جا چکا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کرسیاں سنبھال کر انکل نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اتنی جلدی تم نے اتنی چیزیں بنا لیں یہ کڑھائی سلاد اور ویجیٹیبل رائس۔“

”جی ہاں دیکھ لیں میں کتنی سگھڑ اور سلیقہ مند ہوں۔“ وہ اپنی تعریف کرنے لگی۔ اویس اس ستائش نامے سے بے نیاز اپنی پلیٹ میں سلاد ڈال کر کھانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اور انکل نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ اویس پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا تو انکل اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔

”سلاد اور لو بے چاری نے اتنی محنت سے تمہاری وجہ سے بنائی ہے۔“ ان کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت اسے حسب معمول نروس کرنے کے لیے کافی تھی۔ اویس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور ان سے بولا۔

”شکر ہے کچھ تو میرے لیے بھی ہے۔ ورنہ یہاں تو ہر بات انکل سے شروع ہو کر انکل ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔“ اس کی بات کے جواب میں ان کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

”اجالا کچھ جلنے کی بو نہیں آ رہی آس پاس سے؟“ انہوں نے اس گفتگو میں اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان دونوں کی نظریں اپنے چہرے پر مرکوز محسوس کر کے کچھ جھنجھلا گئی۔ ایک تو یہ ان دادا پوتے کی بہت بری عادت ہے کہ دونوں ہی بلا کے منہ پھٹ ہیں۔

”جلنے کی نہیں بیک ہونے کی آ رہی ہے۔ میں اوون میں brownies بیک ہونے کے لیے

رکھ کر آئی ہوں۔" اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو سنجیدہ بناتے ہوئے کچھ دیر پہلے کی معنی خیز تاثر ختم کرنے کی کوشش کی۔ انکل بے اختیار ہنس پڑے تھے جبکہ اویس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انکل نے اس سے کافی کی فرمائش کی۔ کافی اور براؤنیز ٹرے میں رکھ کر لا... وہ دونوں آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے۔

براؤنیز چکھنے کے بعد انکل اس سے کہنے لگے "تم اچھی طرح ہماری عادتیں خراب کروا دو... ہی شاہد کے پکائے ہوئے کھانے کچھ اتنے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن اب تو برداشت سے باہر ہو... ہیں۔"

"اگر آپ معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کریں تو میں شاہد کو کھانا پکانا سکھا کر آپ کا یہ مسئلہ حل کر... ہوں۔" اس نے جواب میں آفر کی۔

"اس مسئلے کا میں نے ایک اور حل سوچ رکھا ہے۔ جس میں یہ معاوضے وغیرہ جیسی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے گی۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ سکون سے بیٹھی بغیر ان کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر... کافی پیتی رہی۔ انکل اس کے سنجیدہ چہرے پہ نظر ڈال کر مسکرا دیئے۔ اویس بڑی خاموشی سے کافی... سپ لے رہا تھا۔ اپنا کپ خالی کر کے وہ اٹھتے ہوئے بولی "اچھا میں چلتی ہوں انکل۔"

"اتنی جلدی ابھی کچھ دیر تو اور رکو۔" وہ اصرار کرنے لگے۔

"جلدی کہاں تین بج گئے ہیں۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"گاڑی لائی ہو؟" انکل نے اس خیال سے پوچھ لیا کہ وہ اکثر پیدل بھی آ جایا کرتی تھی۔

"نہیں! اتنا اچھا موسم ہو رہا تھا میں واک کرتے ہوئے آئی تھی۔" اویس اس کی طرف دیکھتے... کھڑا ہو کر بولا۔

"بارش ہو رہی ہے میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر شاید گاڑی کی چابی لینے ا... کمرے میں گیا تھا۔ وہ اس کی آفر کے جواب میں دوبارہ انکل کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کوئی بھی بات مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔" انکل نے اسے مخاطب... وہ فوراً بول پڑی۔

"میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔"

"اچھا کھاؤ قسم کہ تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔" اس کا دل بہت تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ا... کے سامنے ایسی کسی بات کا اقرار کرنا اس کے لیے جان جوکھوں کا کام تھا۔ وہ اس کے چہرے کو... دیکھتے ہوئے کچھ روٹھے لہجے میں بولے۔

"اگرچہ کہ یہ میرے دل کی دیرینہ خواہش تھی۔ مگر تم نے اسے مجھ سے سیکرٹ رکھ کر میرا دل ت... ہے۔"

"انکل پلیز ناراض مت ہوں۔" وہ انہیں ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس پریشان حال چہرے پر نظر پڑی تو کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔

"اویس اچھا ہے نا، سب سے اچھا۔" اور جواب میں اس نے گردن ہلا دی تھی۔ اسی وقت... واپس آ گیا تھا۔ انکل کو اللہ حافظ کہہ کر وہ اس کے ساتھ باہر نکلی تو بارش کچھ ہلکی ہو چکی تھی۔ وہ مو...

...ب صورتی اور رعنائی محسوس کرتے ہوئے اس سے بولی۔

"اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ آپ رہنے دیں میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔" وہ گاڑی کا لاک کھولتا ...ا اس کی طرف گھوما۔

"محترمہ یہ دسمبر کی بارش ہے۔ بیمار پڑنے کا زیادہ ہی شوق ہو رہا ہے۔"

"کوئی نہیں میں بیمار ہوتی۔ اس موسم کو انجوائے نہ کرنا اعلیٰ درجے کی بدذوقی ہے۔" وہ اس کی ...دید کرتی پرزور انداز میں بولی تھی۔ "آپ بڑے نازک مزاج ہیں۔ میں تو کبھی بارش میں بھیگ کر بیمار ...ہیں ہوئی۔" اپنے لیے نازک مزاجی کے طعنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔

"میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔" وہ گاڑی کا دروازہ واپس بند کرتا ہوا ...یٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی گیٹ سے نکل آیا اور اس کی حیرت کے جواب میں بولا۔

"آخر مجھے ظاہر بھی تو کرنا ہے کہ میں نازک مزاج نہیں ہوں۔" اس کی بات پر وہ ہنس پڑی تھی۔ ...رش میں بھیگتے ہوئے قدم سے قدم ملائے وہ دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ پاس سے گزرتے walls والے کو دیکھ کر وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"اتنی سردی میں آئس کریم کون کھائے؟"

"اسی موسم میں تو آئس کریم کھانے کا مزہ ہے۔" اس نے فوراً تردید کی تھی۔ پھر اس کی طرف ...یکھتے ہوئے بولا۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے walls والے کو روک کر ایک cornetto خرید لی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"گھر سے چلتے ہوئے والٹ لینا یاد ہی نہیں رہا۔ افسوس میری جیب میں صرف اتنے روپے ہی تھے کہ ایک ہی آئس کریم خریدی جا سکے۔" وہ اس کے غربت بھرے بیان سے متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس ہیں پیسے۔ ایک اور لے لیں۔"

"اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ تمہیں پچیس تیس روپے کی آئس کریم بھی تمہارے ہی پیسوں سے کھلواؤں۔" وہ کچھ برا مان کر بولا۔ پھر کون اس کے ہاتھ میں پکڑاتا ہوا بولا۔

"لو کھاؤ۔" اس کے ہاتھ سے کون لے کر وہ ایسے ہی چلتی رہی تو وہ ٹوک کر بولا۔

"تم کھا کیوں نہیں رہیں۔ پگھل جائے گی۔" اس نے ریپر اتار کر کون کھانی شروع کی۔ وہ اپنے چہرے پر سے بارش کا پانی صاف کرتا ہوا بولا۔

"یہ صرف آپ کے لیے نہیں خریدی ہے۔ اسے ہم دونوں نے شیئر کرنا ہے۔ اتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں کہ اب مجھے دو گی اب دو گی۔" اس کی بات پر وہ ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگی جبکہ وہ اس کے ہاتھ سے کون لے کر آرام سے کھانے لگا۔ دو تین بائٹس لے کر کون واپس اس کے ہاتھ میں پکڑانے لگا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

"آپ کھا لیں میرا تو ویسے بھی زیادہ دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس کی اس حرکت پر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر کون اس کی طرف بڑھائے چلتے چلتے رک گیا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ بھی رک گئی۔ اس کے مسلسل بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے کون پکڑ لی تو وہ دوبارہ

چلنے لگا۔

''مجھے کوئی چھوت کی بیماری نہیں ہے جو میرا جھوٹا کھانے سے آپ کو بھی لگ جائے۔'' اس کے نہ کھانے پر وہ چڑ کر بولا۔

اس کی ناراضگی سے ڈر کر اس نے ایک بائٹ لے لی۔ تھوڑی دیر بعد اویس نے خود ہی اس کے ہاتھ سے کون لے لی اور تھوڑی سی کھا کر واپس اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو سر جھکا کر بنا کچھ کہے اس نے کون لے لی۔ سارے راستے یہی تماشا ہوتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے کون لے کر تھوڑی سی کھاتا اور پھر اسے پکڑا دیتا۔ وہ مجبوراً سر جھکا کر ایک آدھ بائٹ لے لیتی۔ آج کا موسم انجوائے کرنا اسے خاصا مہنگا پڑ تھا۔ اس کے گھر کی سڑک پر مڑے تو اللہ اللہ کر کے کون ختم ہوئی اور اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے چل رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے رکے تو وہ اس سے بولا۔

''چیونگ گم کھاؤ گی؟'' وہ فوراً انکار میں گردن ہلا گئی۔ کیا پتا اسے بھی شیئر کرنا پڑے۔ وہ اس کے فوراً انکار کرنے پر ہنس پڑا تھا۔ ''نہیں اسے شیئر نہیں کرتا۔ وہ پوری کی پوری تمہاری ہے۔'' پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا والٹ نکالا تو وہ ساری شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر چلائی۔

''آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

وہ مسکراتے ہوئے سر ہلا گیا۔ ''آئندہ میں آپ کی کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی چیونگ گم کو نظر انداز کرتی گیٹ میں گھسنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''تمہاری خاطر اتنی دور تک پیدل چل کر بھیگتا ہوا آیا ہوں اور تم۔۔۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر ناراض لہجے میں بولی۔

''میں انکل سے آپ کی شکایت کروں گی۔'' اس کے بے ساختہ قہقہے نے اپنی حماقت کا احساس دلایا تو وہ بغیر کچھ کہے گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆
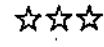
رات وہ سونے کے لیے لیٹنے لگی جب دستک دے کر دعا اندر چلی آئی۔ دعا کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ دعا کے اور اس کے کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے تھے۔ گو وہ کبھی آپس میں لڑی بھی نہیں تھیں مگر ان کے بیچ صرف اجنبیت اور غیریت کا رشتہ تھا۔

''تم سو تو نہیں رہی تھیں؟'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں! اب سوچ ہی رہی تھی کہ سو جاؤں لیکن خیر تم بتاؤ کوئی کام ہے مجھ سے؟'' وہ اپنی حیرت چھپانے کی کوئی کوشش کیے بغیر بولی۔ دعا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دعا کے اس طرح دیکھنے کے انداز پر کچھ کوفت محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی آنکھیں اس پر جمائے پتا نہیں اس کے چہرے پر موجود کیا چیز پڑھ لینا چاہتی تھی۔

''تمہاری نالج میں تو یقیناً یہ بات ہوگی کہ اویس کا پرپوزل آیا ہے تمہارے لیے۔'' دعا کے اس

جملے پر اس کا دل بڑی بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار اس کا سر جھک گیا تھا۔ اسے دعا کے سامنے کسی سولہ سترہ سال کی کم عمر دوشیزہ کی طرح شرمانا لجانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ خبر اتنی اچانک تھی کہ وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پا رہی تھی۔ دعا بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے تاثرات سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں اس بات کا پہلے سے پتا نہیں تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں! انکل نے مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ کب آئے تھے انکل۔'' وہ اپنی عادت کے برخلاف اپنے گھر کے کسی فرد کے ساتھ تفصیلی گفتگو کرنے کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔

''آج آئے تھے شام میں۔ تم اس وقت گھر پر نہیں تھیں۔ ممی ڈیڈی تو اس پرپوزل پر بہت خوش ہیں۔ جسے صرف ڈنر پر انوائٹ کرنے کے لیے ڈیڈی اتنے بے تاب تھے اس سے رشتے داری پر تو وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔'' وہ اپنی خوشی میں مگن دعا کے استہزائیہ انداز پر کچھ خاص توجہ نہ دے سکی۔

''بڑے بے ایمان ہیں انکل، کل مجھے ملے تھے اور بتایا بھی نہیں کہ آج آنے والے ہیں اگر بتا دیتے تو میں گھر پر رک جاتی'' وہ چہرے پر حیا آلود تبسم لیے سوچ رہی تھی۔ دعا کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''پتا نہیں مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہیے یا نہیں لیکن میں تمہیں اس طرح بے وقوف بنتا ہوا مزید نہیں دیکھ سکتی۔ تم مانو یا نہ مانو آفٹر آل تم میری بہن ہو اور کوئی تمہاری انسلٹ کرے یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' دعا کے سنجیدہ لہجے پر وہ پہلی بار چونکی تھی۔ اس کے استفہامیہ انداز پر وہ کچھ افسوس بھرے انداز میں بولی۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتانا چاہا تھا لیکن تم نے میری بات سننا گوارا ہی نہیں کی تھی۔ اب بھی تمہاری مرضی ہے چاہو تو میری بات پر یقین کر دو چاہو تو مت کرو۔ میرے اندر کی بے چینی تو ختم ہو جائے گی کہ میں نے تمہیں اصل حالات سے آگاہ نہیں کیا۔'' وہ اس کے انداز پر اندر ہی اندر کچھ خائف ہوتی ہوئی بولی۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہو۔ پہیلیاں بجھوانے کی کوشش مت کرو۔'' وہ اپنے اندر کا خوف اس پر ظاہر کیے بغیر مضبوط لہجے میں بولی۔

''اویس تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی بھی سیریس نہیں تھا۔'' دعا کی اس بات پر اس کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

''جو بیوقوف بناتے ہیں غالباً وہ گھر پر رشتہ نہیں بجھواتے۔'' وہ بڑے طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

''اگر تمہیں اسی قسم کی بکواس کر کے مجھے اویس سے بدظن کرنے کی کوئی بے ہودہ کوشش کرنی ہے تو پلیز اپنا وقت برباد مت کرو۔'' اس کی بات پر دعا کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

''یہ رشتہ اس کی مرضی سے نہیں آیا تمہاری طرح اس کے گرینڈ فادر کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ آج ان کے بعد میں اویس سے ملی اور اس سے بہت لڑی بھی کہ تمہیں ساری دنیا میں فلرٹ کرنے کے لیے میری ہی بہن ملی تھی تو وہ کہنے لگا کہ اسے اس پرپوزل کا کچھ نہیں پتا تھا اور وہ تو صرف مجھے جلانے کے لیے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں اسے پہلے

سے جانتی ہوں۔ جب ہی ہماری اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔ پھر مجھے اس کے بارے میں فائزہ سے اور کچھ دوسرے لوگوں سے اس قسم کی معلومات ملیں کہ وہ فلرٹ ہے تو میں اس سے دور ہوگئی اس نے مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ انہیں دنوں میں تمہیں اس کے ساتھ فون پر بات کرتے دیکھا تو میں حیران رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ تمہیں گفٹ بھجوائے جارہے ہیں، تمہیں بارش میں بھیگتے ہوئے یہاں چھوڑ کر جایا جارہا ہے لیکن میں چپ رہی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ ایسا مجھے جیلس کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ آج پرپوزل والی بات پر میں بہت ہی غصے میں اس سے ملی تو وہ پرپوزل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر کے کہنے لگا کہ اسے ایک طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کی کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنے گرینڈ فادر کو فورس کرے گا کہ وہ اس پرپوزل کو واپس لیں اور میرے لیے بات کریں۔ دونوں دادا پوتے میں اچھا خاصا جھگڑا ہوا ہے۔ دونوں میں خاصی بحث ہوئی ہے اس بات پر۔ پتا نہیں اب یہ کیا صورت اختیار کرے۔" دعا بڑے پرسکون انداز میں اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف ایک سرسری سی نگاہ ڈالتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ کچھ گم صم سی سکتے کی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ "وہ کبھی بھی میرے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو۔" دعا کے منہ سے سنے گئے الفاظ تکلیف دہ الفاظ کے بارے میں وہ کبھی بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھی کہ ایسی بات وہ کہہ سکتا ہے۔ اس کی آنکھیں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ میں نے ان میں ہمیشہ اپنے لیے عزت اور محبت دیکھی ہے۔ کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کسی اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی جو بنا کہے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھ سے براہ راست محبت کا اظہار نہیں کیا تو کیا میں بغیر کہے اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس کے لیے بہت اہم ہوں۔ دعا کی کسی بھی بکواس پر میں ہرگز بھی یقین نہیں کروں گی بلکہ مجھے اس کی اتنی فضول باتوں پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے اس کا دماغ ٹھیک کر دینا چاہیے تھا۔ آخر کیا سمجھ کر وہ مجھے اویس کے بارے میں بدگمان کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سونے سے پہلے تک وہ اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆
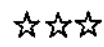
دعا کی کسی بھی بات پر یقین نہ کرنے کے عزم کے باوجود اسے ایک عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔ سارا دن ایک اضطراب اور مسلسل پریشانی کے عالم میں گزار کر وہ بلاآخر شام میں ان کے گھر چلی آئی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کا اظہار اویس یا انکل کے سامنے کس طرح کرے گی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسی گھر کے مکینوں نے اب تک اس کی ہر پریشانی اور دکھ میں اس کا ساتھ دیا ہے اور ان کے سوا دنیا میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتی۔ گاڑی گیٹ سے باہر ہی چھوڑ کر وہ اندر چلی آئی۔ لان میں بیٹھے اویس اور دعا کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ لان چیئرز پر بیٹھے وہ دونوں آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ اویس کی اس طرف پشت تھی جبکہ دعا کا منہ اسی طرف تھا لیکن باتوں میں مگن اس نے

اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جیسے کسی طاقت کے زیر اثر چلتی ہوئی اسی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی تھی۔ دعا بڑے جذبے سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے آپ اسی دن سے اچھے لگتے ہیں جب آپ آئی بی اے میں ہم لوگوں کو لیکچر دینے آئے تھے۔ حالانکہ کتنے ہی لوگ مجھ سے دوستی کرنے اور بات کرنے کے لیے ترستے رہتے ہیں مگر ان میں سے کسی کو بھی لفٹ نہیں کراتی۔ آپ تو سب سے مختلف ہیں لیکن پتا نہیں یہ اجالا ہمارے درمیان کہاں سے آگئی تھی۔" اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولتے ہوئے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو فوراً سر گھما کر پیچھے کی طرف نظر ڈالی۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی اجالا کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"اجالا! تم۔ آؤ بیٹھو، کھڑی کیوں ہو؟" کسی قسم کے احساس ندامت یا شرمندگی کے بغیر وہ اس سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو بوکھلاہٹ نظر آرہی تھی نہ اپنا آپ ظاہر ہو جانے پر وہ نروس ہوتا ہوا گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے یہاں زندہ سلامت کھڑے رہنے پر خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر الٹے قدموں پیچھے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے جیسے اپنی چیخ کی آواز کو دبا لینا چاہتی ہو۔ وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ خائف ہوتا ہوا تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف جانے لگی۔

"اجالا رکو میری بات سنو۔" وہ بے اختیار اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے تعاقب میں آتی اس آواز کو اب زندگی میں دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے اور وہ اپنی سسکیوں کو دباتی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ دو چار لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہ اس تک پہنچ گیا تھا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کر کے بولا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"Don't touch me" اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹکتے ہوئے وہ غصے سے پھنکاری تھی۔ دعا بھی اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے چلی آئی تھی اور بڑی خاموشی سے الگ تھلگ کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

"میں تم سے دوستی کر لوں تم مجھے اپنا جیسا بنا دو گے۔ یہی کہا تھا تم نے۔ افسوس میں کبھی بھی تم لوگوں جیسی نہیں بن سکی۔ یہ دنیا میرے جیسے لوگوں کے لیے نہیں بنی۔ یہ تو تمہارے، خالد، سعود اور دعا جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ میں تو یہاں مس فٹ ہوں۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے چیخی تھی۔

"اجالا تمہیں پتا نہیں کیا غلط فہمی ہو رہی ہے۔ پلیز آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔" وہ اس کے ہاتھ تھامتا ہوا بڑی بے بسی سے بولا تھا۔

"کیا سنوں یہی کہ مجھے ایک مرتبہ پھر استعمال کیا گیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ وہی سب کیا جو فہد نے کیا تھا۔ تم نے بھی مجھے ایک catspaw ہی سمجھا۔ کیوں آخر کیوں میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیا برا کیا تھا میں نے جس کی مجھے یہ سزا ملی۔" وہ اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہسٹریک ہو کر چلائی تھی۔

"اجالا تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم میرے جذبوں کا یوں مذاق اڑاؤ۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، تمہاری عزت کی ہے۔" وہ ناراضگی بھرے انداز میں اسے دیکھتا ہوا بولا

تھا۔اس کی آنکھوں سے جھلکتی خفگی اور ناراضگی کو کوئی اہمیت دیے بغیر وہ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے ہنسی تھی۔

''محبت اور وہ بھی ایک طلاق یافتہ لڑکی سے۔جسے اس کے کزن نے ٹھکرا دیا ہو۔جھوٹ ایسا تو بولو جو نبھ جائے۔یہ کہو کہ تم نے میرے ساتھ فلرٹ کیا تھا۔مجھے استعمال کیا تھا۔''

''تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر تم میرے اوپر اتنے واہیات الزام لگا رہی ہو۔اپنے کردار پر کوئی بات چاہے وہ تم ہی کیوں نہ کر رہی ہو میں کبھی بھی برداشت نہیں کروں گا۔''اب کے وہ بھی چلایا تھا۔

''کردار؟تمہارا کوئی کردار ہے بھی۔''وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔اور بے اختیار اسے تھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے اس نے خود کو بمشکل روکا تھا۔وہ اس کے غیض وغضب سے معمور چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

''مجھے نہیں پتا تم نے اور دعا نے میرے ساتھ کیا گیم کھیلا ہے لیکن بس اتنا ہوا کہ آج کے بعد میں کبھی بھی کسی پر اعتبار نہیں کروں گی۔بہت مان تھا مجھے خود پر کہ میں انسانوں کو پرکھ سکتی ہوں۔مجھے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنی آتی ہے لیکن تم نے اویس لودھی آج مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔تم تو میری محبت کیا نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔''وہ لب بھینچے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس کی تمام بات کے جواب میں وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے کہ غضب ناک تاثرات کی جگہ دکھ اور صدمے نے لے لی تھی۔وہ بڑی مایوسی اور افسردگی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔وہ ایک نظر اس پر اور ایک دعا پر ڈال کر گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔اویس نے اسے روکنے یا اس کے پیچھے جانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔وہ ویسے ہی چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ پتا نہیں کس طرح گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچی تھی۔اسے اپنے اعصاب کی اس مضبوطی پر حیرت ہو رہی تھی۔اپنا آپ بڑا ہلکا اور بے وقعت محسوس ہو رہا تھا۔اپنے کمرے میں بند وہ بلک بلک کر اپنی ذلت پر آنسو بہا رہی تھی۔کیا وہ اتنی ارزاں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہی وہ اس کے ساتھ کھیلتا رہا اور وہ اپنے تئیں خود کو بہت سمجھ دار اور دانا سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھوں اپنی انسلٹ کرواتی رہی۔اور اس وقت وہ میری خوش فہمیوں پر دل ہی دل میں کتنا محظوظ ہوتا ہوگا۔میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی بھی نہیں سنبھلتے ہیں۔ہر بار ٹھوکر کھا کر زخمی ہوتے ہیں چیختے چلاتے ہیں اور پھر دوبارہ ٹھوکر کھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔کیوں آنکھیں بند کر کے میں اس کا یقین کرتی رہی۔کیوں میں نے خود کو یوں گرایا۔آخر کیوں کیوں میں یہ بات بھول گئی کہ میں اور میری تقدیر کبھی نہیں بدل سکتی۔زندگی تو پہلے بھی سہل نہیں تھی لیکن اب جیسی مشکل کبھی نہیں تھی۔اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں اتنا مشکل اور ناقابل قبول کیوں بنا لیا۔''وہ بستر پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی۔

''تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔''اسے اپنے پاس ایک سرگوشی سنائی دی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اوپر سے بڑا سوبر اور لیا دیا نظر آتا ہے۔اندر سے ایک نمبر کا فلرٹ ہے۔''ایک اور آواز سنائی دی تھی۔

''تم اپنے حصے کے تمام دکھ سہہ چکی ہو اور اب زندگی تم پر مہربان ہونے والی ہے۔''ایک مہربان آواز نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔پھر اچانک ایک اور بازگشت سنائی دی تھی۔

''کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے۔کوئی تمہیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا منہ توڑ دو۔مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں تمہیں بالکل اپنے جیسا بنا دوں گا۔''

''تمہاری طرح اس کے گرینڈ فادر کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔وہ تو صرف مجھے جلانے کے لیے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔''وہ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھے ان آوازوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی لیکن یہ آوازیں کسی آسیب کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''شکر ہے کچھ تو میرے لیے بھی ہو ورنہ یہاں تو ہر بات انکل سے شروع ہو کر انکل ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔''

''اویس اچھا ہے نا سب سے اچھا۔''

''اسے ایک طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔''وہ چلائی تھی اور پھر دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ پوری رات اور اگلا پورا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ملازمہ آ کر ناک کر کے کھانے کے لیے بلا کر گئی تھی مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر ویسے ہی پڑی رہی تھی۔شام میں ممی اس کے بیڈ روم میں آئی تھیں۔ان کے آواز دینے پر اس نے اٹھ کر کمرے کا لاک کھولا تھا۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔اسکول بھی نہیں گئیں اور کھانے کے لیے بھی نہیں آئیں۔''وہ اس کے ستے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

''جی کچھ بخار تھا اس لیے۔''وہ سر جھکا کر جواب دیتی دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کوئی دوا لی۔''وہ اپنے لیے ان کی تشویش پر تعجب سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''میں ٹھیک ہوں آپ فکر مت کریں۔''

''کیسے فکر نہ کروں تم اتنی چپ چپ اور سب سے الگ تھلگ جو رہتی ہو۔بیٹا گھر والوں کے ساتھ گھل مل کر اور ایک ساتھ رہا کرو۔''وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی تھیں۔اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے نظریں چراتے ہوئے وہ کچھ شرمندگی سے بولیں۔

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو۔تم سمجھتی ہو میں نے جان بوجھ کر تمہارا خالد سے نکاح کروایا تھا۔بلیو می سویٹ ہارٹ میں تمہاری ماں ہوں میں نے کبھی بھی تمہارا برا نہیں چاہا۔جو کچھ ہوا میں نے ایسا کبھی بھی نہیں چاہا تھا۔کیا میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا۔مجھے تم بھی اتنی ہی عزیز ہو جتنے

تمہارے باقی بہن بھائی۔ ہاں! میں تمہیں کبھی زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ یہ بات میں مانتی ہوں لیکن مجھے سب سے بہت پیار ہے۔ تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔'' وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بو تھیں۔

بعض محبتیں ہمیں زندگی میں اس وقت ملتی ہیں جب ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ممی کا بھی چاہت ظاہر کریں کیا ان کی چاہت اس آٹھ سال کی معصوم بچی کو واپس لا سکتی ہے جو ان کی ایک ذ التفات کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہا کرتی تھی۔ کچھ خوشیاں جب اپنے وقت پر نہیں ملتیں تو بعد میں وہ ملیں نہ ملیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کا والہانہ انداز دیکھ رہی تھی جبکہ وہ بڑی خوشگوار مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''تمہارے لیے اویس لودھی کا پرپوزل آیا ہے۔ مبشر صاحب خود بنفس نفیس یہاں آئے اور بڑ چاہت سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ وہ خالد کم ظرف ہرگز بھی تمہارے لائق نہ تھا۔ میری بیٹی کا جوڑ تو اویس جیسے ہینڈسم اور کوالیفائیڈ شخص کے ساتھ جچتا ہے۔ تمہارے ڈیڈی چاہے کسی بھی وجہ سے اس رشتے کے حامی ہوں لیکن میں صرف تمہاری ماں ہونے کے ناتے اس رشتے پر خوش ہوں۔ میری بیٹی سکھی ر اسے قدر دان لوگ ملیں بس میری خوشی صرف یہی ہے۔ مجھے پتا ہے تم بہت حساس ہو اور مبشر لودھی کا گھرانہ تمہارے شایان شان ہے۔ وہ لوگ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔'' وہ ان کے کندھے پر سے سر اٹھاتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ممی اس رشتے سے انکار کر دیں۔ میں اویس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اس کی بات پر حیرت سے گنگ رہ گئی تھیں۔

''انکار کر دوں۔'' انہوں نے اس طرح تصدیق کی جیسے جو کچھ سنا وہ غلط تھا اور وہ اب اپنے ج میں ترمیم کر دے گی۔

''پلیز ممی ابھی ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ میری ماں ہونے کے ناتے اس رشتے پر خوش ہیں ا اگر میں اس رشتے سے انکار کر رہی ہوں وہاں میری مرضی اور خوشی نہیں ہے۔ تو ایک ماں ہونے کے ناتے آپ کو میری بات ماننی چاہیے۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔

''لیکن اجالا اویس بہت اچھا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بھی وہاں انٹرسٹڈ ہو۔'' ممی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ان کی بات کاٹ کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''میں آپ سے زندگی میں پہلی بار کچھ مانگ رہی ہوں۔ پلیز مجھے مجبور مت کریں۔'' وہ اس کے انداز پر چپ ہو گئی تھیں۔ پھر کتنی ہی دیر انہوں نے اسے اس رشتے کی اچھائیاں گنوائی تھیں لیکن وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھی۔ آخر کار ممی ہار مانتے ہوئے بولی تھیں۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے تمہاری خوشی ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ تم خوش رہو بیٹا بس صرف یہی چاہتی ہوں۔'' وہ اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

اس نے اس بات کو جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہاں انکار کہلوا دیا گیا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے آپ میں الجھی ہوئی سارا سارا دن کمرے میں گزار دیتی تھی۔ ممی کے بلانے پر گھر والوں کے ساتھ کھانا کھانے کے علاوہ اس کا تمام وقت کمرے میں گزرتا تھا۔ اسکول سے لونگ لیو لے کر وہ ان دنوں ساری دنیا سے کٹی ہوئی تھی۔ دعا نے اس سے اس دن کے حوالے سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ خود بھی اب زندگی بھر دعا سے کبھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ممی کو انکار کیے چوتھا دن تھا۔ جب حمیدہ نے کارڈلیس اس کے ہاتھ میں پکڑا کر کہا تھا ''آپ کا فون ہے۔'' اور وہ ان دنوں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے بغیر بات کیے لائن ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ پھر اس دن دو مرتبہ اور اگلے تین چار مرتبہ اسے پیغام ملا کہ انکل کا فون ہے لیکن اس نے بے مروتی اور بدتمیزی کی حد کرتے ہوئے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں انکل لیکن میں اب آپ سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔'' وہ بعد میں روتے ہوئے اپنے آپ سے بولی تھی۔ اگلے روز دوپہر میں ممی نے اسے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ انکل اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں ان سے ملنے سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی، اس لیے فوراً اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے انکل کو دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ ان کے گلے لگ جائے اور خوب سارا رونے کے بعد ان سے اویس کی، دعا کی اور پتا نہیں کس کس کی شکایتیں کرے۔ لیکن اپنے دل کی اس خواہش کو نظر انداز کرتی وہ انہیں سلام کرتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟'' وہ خود ہی اٹھ کر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئے اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں انکل؟'' وہ آنسوؤں پر بند باندھتی مضبوط لہجے میں بولی۔

''اپنی بیٹی کے بغیر میں ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔ تم تو میرے لیے آکسیجن کی طرح اہم ہو اتنے دن سے تمہیں دیکھا نہیں تو دل بری طرح اداس ہے۔ میری جان انکل سے کس بات کی ناراضگی ہے۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے محبتوں سے چور لہجے میں بولے تھے۔ وہ اس لمحے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ان کی محبت اسے پھر سے کمزور کر رہی تھی اور وہ ان کی طرف کھنچنے لگی تھی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ سر جھکا کر بولی۔

''میری آپ سے کوئی ناراضگی نہیں ہے انکل۔''

''پھر کیا بات ہے بیٹا! دیکھو جو بھی بات ہے کہہ دو۔ بات کرنے سے اپنے دل کا حال کہہ دینے سے انسان بہت سے مصائب سے بچ جاتا ہے۔ تمہارے اور اویس کے درمیان جو بھی مس انڈرسٹینڈنگ ہوئی ہے مجھے بتاؤ۔ اگر اس کی غلطی ہوئی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں لیکن مجھے بتاؤ تو سہی۔'' وہ بڑی بے چارگی سے بولے تھے۔

''کوئی مس انڈراسٹینڈنگ نہیں ہے انکل۔ آپ پلیز اس ٹاپک کو مت چھیڑیں۔ مجھے آپ کی

محبت پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں آپ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن پلیز اس بات کو دیں۔" وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرے لیے پوتے کا رشتہ لائے۔ لیکن اسے میری جیسی لڑکی سوٹ نہیں کرتی۔ آپ اس کے لیے دعا کا یا اس جلتی کسی لڑکی کا انتخاب کریں۔" وہ بڑے سکون سے اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"اس وقت تم ڈیپریسڈ لگ رہی ہو۔ میں بعد میں آؤں گا۔ پھر تم سے بہت ساری باتیں کروں گا۔" وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلتی گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

"اجالا میں اور اویس تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس بات پر ہمیشہ یقین رکھنا۔" وہ گیٹ سے نکلتے ہوئے اس سے بولے تھے اور وہ خاموش کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑے نڈھال اور تھکے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو لاؤنج میں بیٹھے اویس کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"خیریت آج جلدی آ گئے؟"

"جی کام تھا اس لیے جلدی آ گیا۔" وہ ان کی طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے تمہیں اس سوال کا جواب معلوم ہے اسی لیے یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر رہے ہو۔ یقیناً اخلاق نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں اجالا سے ملنے گیا تھا۔" وہ بڑے سکون سے جواب دیتے ہوئے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"آپ وہاں کیوں گئے تھے؟" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔

"کیا مجھے نہیں جانا چاہیے تھا؟" وہ اس کے سوال کے جواب میں سوال کرنے لگے تھے۔

نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے کہ آپ اس کی منتیں کرنے اس کے گھر پہنچ رہے ہیں۔" غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تھا۔

"اویس وہ نادان ہے تو کیا ہم بھی جذباتی ہو کر بیوقوفانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ تمہیں اس سے محبت کا دعویٰ ہے تو اس کی فیلنگس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرو۔ وہ جس طرح کے حالات کا شکار رہی ایسے میں اسے اسی طرح ری ایکٹ کرنا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ لوگوں کی دھوکا دہی، جھوٹ اور منافقت دیکھی ہے اسی لئے اس کا رشتوں پر سے محبتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ہمیں اس کا اعتبار بحال کرنا ہے۔ مجھ سے بہتر تو یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اس سے ملو اسے یقین دلاؤ کہ تم اس کے مخلص ہو اس کا کھویا ہوا اعتماد اور اعتبار اسے واپس دلاؤ۔" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے تو وہ اپنی ناراضگی چھپائے بغیر بولا تھا۔

"سوری پاپا جانی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے ساری زندگی کبھی کسی کے سامنے وضاحتیں دی

نہ اب دوں گا۔ اگر میں درست ہوں تو ہوں مجھے کسی کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دل میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تو میں اس کے پیچھے کیوں جاؤں۔ اس نے مجھے گھٹیا ترین افراد کی فہرست میں بڑے آرام سے شامل کر دیا بغیر مجھ سے وضاحت چاہے۔ اب چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے میں اس سے نہیں ملوں گا۔ مجھے محبت سے زیادہ اپنی عزت اور انا عزیز ہے۔ اور آج کے بعد اگر آپ بھی اس سے ایسے کسی سلسلے میں ملے تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ وہ ایک suspicious لڑکی ہے اور اس کی اس بیماری کا علاج دنیا کے کسی حکیم کے پاس نہیں ہے۔ اس نے انسلٹ کی ہے اور میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ I will never forgive her" وہ اپنی بات ختم کر کے لاؤنج سے چلا گیا تھا اور وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑی بے بسی سے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔

ان کے اجالا سے ملنے جانے پر اس کا موڈ اتنی بری طرح آف ہوا تھا کہ وہ دوبارہ آفس جانے کا ارادہ ترک کر کے جوتوں سمیت ہی بستر پر لیٹ گیا تھا۔

"تم کوئی دنیا کی آخری اچھی لڑکی تو نہیں ہو جو میں تمہارے لیے جوگ لوں گا۔ اس دنیا میں تم سے کہیں بہتر اور اچھی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔" وہ بڑے غصے سے سوچ رہا تھا۔ "مگر وہ اجالا شہریار تو نہیں ہوں گی۔" کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔ "کتنی بری طرح تم نے مجھے letdown کیا ہے۔" وہ اپنے اندر سے ابھرتی اس آواز کو نظر انداز کر کے وہ خود سے بولا تھا۔ "میں تمہارے لیے کیا کیا سوچتا تھا اور تم! تم نے مجھ سے محبت تو کر لی مگر میرا اعتبار نہیں کیا۔ اور ایسی محبت جس میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور یقین نہ ہو میرے نزدیک بے کار ترین شے ہے۔ تمہارے خلاف اگر ساری دنیا بھی اکٹھی ہو کر میرے سامنے کھڑی ہوتی اور تمہارے خلاف گواہی دیتی۔ میں تب بھی کسی بات کا یقین نہ کرتا کیوں کہ مجھے تم پر اعتبار تھا۔ کتنے آرام سے تم نے وہ بدترین الفاظ اپنی زبان سے استعمال کیے تھے بغیر یہ سوچے کہ یہ الفاظ مجھے کتنا دکھ دے رہے ہیں۔ کیا جو زبان سے بڑے بڑے دعوے کرے صرف وہی سچا ہوتا ہے جو اپنے منہ سے کہے کہ میں تمہارے لیے جان دے سکتا ہوں آسمان کے چاند تارے لا سکتا ہوں تمہارے نزدیک صرف وہی سچا ہے۔ تم نے کبھی میری آنکھوں میں اپنے لیے چاہتوں کا آباد جہان دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تمہیں خوش دیکھنے کے لیے تمہارے آرام و سکون کی خاطر اپنی جان کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن تم نے مجھ پر بھروسہ نہ کیا۔ تمہارے نزدیک وہ تمہارے ستائے ہوئے بدترین رشتے دار مجھ سے زیادہ معتبر ٹھہرے اور میں معتوب قرار پایا۔

اور وہ پاپا جانی کہتے ہیں کہ میں تمہارے پاس جا کر اپنی صفائیاں پیش کروں۔ نیور ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے خلاف ماریہ فون پر مجھ سے الٹی سیدھی بکواس کرتی ہے کہ میرے بھائی نے اسے اس کی بعض بری عادتوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تو میں اسے جھڑک کر اور آئندہ فون نہ کرنے کا کہہ کر ریسیور پٹخ دیتا ہوں۔ اور تمہارے اوپر افسوس کرتا ہوں کہ تم اتنے گھٹیا لوگوں کے بیچ رہتی ہو۔ جس روز یہاں سے ڈنر پر گیا تھا اسی رات ماریہ نے فون کیا تھا اور میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا اتنے برے لوگوں کے درمیان سے تمہیں جلد سے جلد نکال لاؤں۔ وہ جہنم تمہارے رہنے کی جگہ تو نہیں تھا۔ پھر دعا سامنے آتی ہے۔ دعا شہریار جسے میں ایک ڈیڑھ سال سے جانتا ہوں۔ MBA کے

اسٹوڈنٹس کو لیکچر دینے گیا تو وہیں وہ کسی بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی۔ ایک دو مرتبہ چھوٹے ماموں فائزہ کے ساتھ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں مدد لینے میرے آفس آئی تو میں نے فائزہ کی وجہ سے خوش اخلاقی سے بات کر لی۔ مگر وہ محترمہ کسی طرح پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہی نہ ہوئیں۔ اس کے بعد فائزہ کے بغیر ہی اپنی پڑھائی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے آفس آنے لگی تو میں نے اسے اگنور کرنا شروع کر دیا۔ ساری کرٹسی ایک طرف رکھ کر میں نے بداخلاقی ظاہر کی تو اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

پھر اس روز پاپا جانی کی برتھ ڈے پر تمہیں چھوڑنے گیا تو ٹیرس پر کھڑی دعا کو دیکھ کر مجھے پتا چلا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ اور میں کتنا حیران بھی ہوا تھا کہ کہاں تم مشرقی روایات کی آئینہ دار شرمائی ہوئی لڑکی اور کہاں وہ بے تحاشا بولڈ اور آؤٹ اسپوکن دعا۔ اس سے اگلے ہی دن وہ میرے آفس چلی آئی تمہارے خلاف وہی خالد کا قصہ سنانے کے لیے بیٹھ گئی تو میں نے اس کی بہت انسلٹ کی اور اسے اپنے آفس سے بہت بری طرح ڈانٹ کر نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس نہیں آئی۔ میں نے تم سے بھی ایسی کسی بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس روز جب تم مجھ سے لڑ جھگڑ کر گئی تھیں دعا تمہارے آنے سے چند لمحے پہلے ہی آئی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں لان میں بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میرا منہ بن گیا تھا لیکن وہ میرے منہ بنانے کی پروا کیے بغیر میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو میں نے بھی سوچا کہ آج اس کا دماغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درست کر دینا چاہیے تاکہ یہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اس نے بات کرنی شروع ہی کی تھی کہ تم وہاں آ گئیں اور تم نے اس سچویشن کے بہت ہی غلط معنی نکالے۔ میں نے تمہارے خلاف کسی بات کا کوئی یقین نہیں کیا۔ تو جو عزت میں مجھے اپنے لیے بھی ایسی ہی عزت چاہیے تھی۔

تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے اجالا بہت برا۔ میں تمہارے راستوں کے پتھر ہٹا رہا تھا۔ تمہاری راہوں کے خار سمیٹ رہا تھا۔ تم تک پہنچنے کے لیے میں نے درست راستے کا انتخاب کیا تھا جس کی میں نے ہمیشہ عزت کی۔ اپنے گھر میں آنے والے ایک مہمان اور پاپا جانی کو عزیز ہونے کے ناتے۔ مگر اس روز جب تم میرے سینے پر سر رکھ کر روئی تھیں پتا نہیں مجھے ایک دم کیا ہوا تھا۔ میں اس لمحہ میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ ان لوگوں کو سرعام پھانسی دلواؤں جنہوں نے تمہیں دکھ دیے۔ میں نے اس وقت یہی سوچا تھا کہ میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم گزشتہ تمام غموں اور بدصورت یادوں کو بھول جاؤ گی۔ کوئی خالد تمہارا نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہیں تو خدا نے میرے لیے بنایا تھا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ تمہیں بتاؤں کہ تم کتنی خوب صورت ہو سب سے منفرد تمہارا احتیاط اور شرمایا ہوا انداز تمہیں سب سے الگ کرتا ہے۔ تم لوگوں کے رویوں سے مایوس ہو کر اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ تمہیں کسی نے ریجیکٹ نہیں کیا بلکہ تمہیں میرے لیے مجھ سے ملنے کے لیے شاید ان تمام حالات سے گزرنا پڑا۔ شاید ہمیں کچھ دیر سے ملنا تھا۔ مگر افسوس میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ یہ بھی نہیں کہ تم اس روز پاپا جانی کی برتھ ڈے پر بہت حسین لگ رہی تھیں اتنی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس تمہیں ہی دیکھتا رہوں اور یہ بھی نہیں بتا سکا تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔ تمہاری لمبی مخروطی انگلیاں کتنی حسین ہیں۔ تمہاری مسکراہٹ کتنی دل فریب ہے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ وہ تمام باتیں جو میں نے سوچی ہوئی تھیں کہ ہماری شادی کے دن تم سے کروں گا شاید اب کبھی نہ کہہ سکوں اس لیے کہ ایسا کوئی دن ہماری زندگی میں آنے والا ہی نہیں ہے۔ تمہاری بے اعتباری مجھے بہت دکھ دے رہی ہے۔ تم ایک بار مجھے موقع تو دیتیں۔ رک کر میری بات سن تو لیتیں۔ کیوں اجالا تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں تمہارے لیے firststring بنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ سازشی مجھ سے زیادہ قابل اعتبار قرار پائے۔" وہ اپنا بستر پر لیٹا بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تھی جب حمیدہ نے اسے اخلاق کے فون کی بابت بتایا۔ بات کرنے سے انکار کرتے کرتے وہ اچانک ہی رک گئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ اخلاق نے فون کیا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے کارڈلیس اس کے ہاتھ سے لے کر بات کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ دوسری طرف اخلاق کی روتی ہوئی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ روتے ہوئے انکل کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دے رہا تھا۔

"میں کمرے میں کھانا لے کر گیا تو وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ طبیعت تو ان کی دو تین روز سے ہی خراب چل رہی تھی۔ میری تو فوراً کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پھر اویس بھائی کو فون کیا اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صاحب کو ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔" وہ ان کی طبیعت کا سن کر خود اتنی بری طرح پریشان ہوئی تھی کہ ڈھنگ سے اسے تسلی بھی نہیں دے سکی۔ اس سے ہاسپٹل کا نام پوچھ کر وہ جس لمحے میں تھی اسی میں گاڑی کی چابی اٹھا کر پورچ کی طرف آئی تھی۔ گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے وہ ان کی صحت اور طویل عمری کے لیے دعائیں کرتی ہوئی ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوئی تھی۔ ایک ایک قدم کئی من وزنی معلوم ہو رہا تھا۔

"انکل آپ کو زندہ رہنا ہے میرے لیے پلیز مجھے اکیلا مت کیجیے گا۔" وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب حواس باختہ ریسیپشن تک پہنچی تھی۔ اسی ہاسپٹل میں وہ ایک مرتبہ پہلے بھی ان سے ملنے آئی تھی۔ مگر تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک کمرے کے باہر کھڑی خود کو اندر جانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔

دروازے پر ہلکے سے دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو ڈاکٹر ثروت حسین بخاری سے باتیں کرتے ہوئے اویس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنا رخ دوبارہ ڈاکٹر بخاری کی طرف کر لیا تھا۔ اس کی سرد سپاٹ نگاہوں سے اندر ہی اندر خائف ہوتی وہ انکل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں موندے کمبل اوڑھ کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بخاری نے نوارد کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ اویس سے مخاطب ہو گئے تھے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ بس یہ ہے کہ ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ڈاؤن ہو گیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات ایج فیکٹر بھی ہے۔ اس ایج میں انسان کے نروس بہت کمزور

ہو جاتے ہیں مجھے ایسا لگتا ہے ان دنوں وہ کسی پریشانی میں مبتلا تھے۔
تمہیں ان کے خلاف مزاج کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہارٹ پیشنٹ کے نروس کے لیے کسی بھی Stress کا نقصان دہ ہوتا ہے۔ کوشش کرو کہ وہ خوش رہیں۔ ان کی مرضی اور خواہشات کے مطابق چیز ہو۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت مخلصانہ انداز میں اس سے بات کر رہے تھے۔ وہ بھی چ قدموں کے فاصلے پر کھڑی ان کی بات بڑے غور سے سن رہی تھی۔

وہ خود ان کی پریشانی کا سب سے بڑا سبب ہے یہ بات اسے بری طرح نادم کر رہی تھی۔ انہو نے ہمیشہ مجھ سے پیار کیا میرا خیال رکھا اور میں نے جواب میں انہیں ذہنی الجھن اور بیماری دی۔ سر جھکائے سوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر بخاری اویس کو تسلی دے کر باہر جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر انکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر ان کا چہرہ دیکھنے تھا۔ اجالا نے ایک چور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ بہت پریشان اور الجھا ہوا نظر آیا۔ کچھ دیر کھڑ رہنے کے بعد وہ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے نہ اس کے کھڑے رہنے کا کوئی نوٹس لیا تھا اور ہی بیٹھنے کا۔

اس کا اسٹائل ایسا تھا جیسے اس وقت یہاں صرف وہ اور پاپا جانی ہی موجود ہیں۔ کسی تیسرے فرد موجودگی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تھا۔ وہ دونوں ہی سارا وقت انکل نظریں جمائے بیٹھے رہے تھے۔ ان کے جسم میں ذرا سی حرکت محسوس ہوئی اور آنکھوں کے پپوٹے ہوئے لگے تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی اویس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھ کر انہیں آواز دی تھی۔

''پاپا جانی آپ کیسے ہیں؟'' انہوں نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بڑی پست آ میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ بولنے کے لیے انہیں خاصی محنت اور طاقت صرف کرنی پڑ ہے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر وہ بے اختیار سسک اٹھی تھی۔ وہ جو اسے جواب دے کر دوبارہ آنکھ بند کر چکے تھے ایک دم آنکھیں کھول کر اپنے بائیں طرف سر گھما کر دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر بدقّ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

''چلو میرے بیمار ہونے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔ میری اجالا انکل سے ناراضگی ختم کر کے آ گئی۔ مجھے پتا ہوتا تو پہلے ہی بیمار ہو جاتا۔'' ان کی بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ انہوں نے ا ہاتھ تھاما تو وہ روتے ہوئے ان کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔

''آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ نے پرامس کیا تھا کہ میری برتھ ڈے پر مجھے م پسند کا گفٹ دیں گے۔ میری برتھ ڈے سے پہلے آپ کو ٹھیک ہونا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی اور ا کی اس بات پر وہ مسکرا نہیں رہے تھے۔ اویس بڑی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو انکل اس کا بازو تھام لیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
''کہیں نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کچھ بے زار سے ا

یں بولا تو اجالا نے پہلی بار چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ ہر قیمت پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

''یہ کیا تم بچوں جیسی حرکتیں کر رہے ہو۔ کچھ تو میچورٹی کا ثبوت دو۔'' وہ اپنی آواز کی کمزوری پر قابو پاتے ہوئے بمشکل بولے تھے۔ ''تم دونوں ہی کا رویہ امیچیور ہے۔ غلط فہمیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ لیکن ے انا اور عزت کا مسئلہ بنا کر ہر کوئی تم لوگوں کی طرح نہیں بیٹھ جاتا۔ اگر آپس میں کوئی بدگمانی آ گئی ہے و بیٹھ کر بات کر کے اپنے مسئلے کا حل نکالو۔ ایک دوسرے کے ساتھ Communicate کرو۔ پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ Communication gap کبھی بھی نہیں آنا چاہیے۔ ہر مسئلے کا حل گفتگو میں پوشیدہ ہوتا ہے۔'' وہ دونوں کی طرف باری باری نگاہ ڈالتے ہوئے بولے تھے۔

وہ کچھ دیر کھڑا جیسے اپنے آپ پر قابو پاتا رہا تھا۔ پھر بڑی دقتوں سے خود کو آمادہ کرتا ہوا کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ ان کی بیماری کا لحاظ کرتے ہوئے بیٹھ تو گیا تھا لیکن چہرے پر موجود ناگواری اور خفگی کے تاثرات کو وہ چھپا نہیں پا رہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی تو اویس بڑی بے مروتی سے نہیں ٹوکتا ہوا بولا۔

''پلیز پاپا جانی I beg you آپ کسی ناپسندیدہ موضوع کو یہاں زیر بحث مت لائیں۔ میں آپ کی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہوں آپ مجھے کچھ بولنے پر مت اکسائیں۔'' اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر بڑے غور سے اویس لودھی کی طرف دیکھا تھا۔ کیا جو جھوٹے ہوتے ہیں ان کا لہجہ اتنا مضبوط ہوتا ہے۔ کیا ظالموں کے چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں۔ کیا ریاکاروں اور منافقوں کی آنکھوں میں اتنی چمک اور سچائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر مرکوز اس کی نگاہوں سے بے نیاز ان سے مخاطب تھا۔

''مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ نہ آج نہ کبھی۔ میں جو ہوں جیسا ہوں مجھے معلوم ہے۔'' وہ اپنے مخصوص مضبوط اور دوٹوک انداز میں بولا تو وہ بڑی بے بسی محسوس کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے۔ وہ س وقت سے مسلسل اسی کی طرف دیکھ رہی تھی جو سارے زمانے سے خفا نظر آ رہا تھا۔ اس کا اپنا دل اور دماغ اس کے حق میں گواہی دینے لگے تھے وہ سچا ہے اسی لیے اسے کسی کا ڈر نہیں۔ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کوئی اس کے اندر سے بول رہا تھا اور وہ اپنی اب تک کی بدگمانیوں پر شرمسار بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا س کا پچھلا رویہ میرے سامنے نہیں تھا۔ کیا وہ کبھی بھی ایسا کر سکتا تھا جیسا میں نے اسے سمجھا۔ اگر وہ مجھے دھوکا دے رہا ہوتا تو اس دن رنگے ہاتھوں دعا کے ساتھ پکڑے جانے پر بوکھلا جاتا۔ وہ اپنی اور اس کی س روز کی گفتگو یاد کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ سر جھکائے اپنے آپ سے الجھتی رہی تھی۔ کیا میری اس دن کی تمام بکواس پر مجھے کبھی معاف کرے گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ اس نے کبھی میرا دل نہیں دکھایا کبھی مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور میں نے اسے کتنی بری طرح ہرٹ کیا۔ کیا ایک سوری میری تمام بدتمیزیوں کا مداوا ہو سکتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ میں نے دشمنوں کی سازشوں کو سمجھے بغیر اندھا دھند ان پر اعتبار کر لیا اور اپنی جلد بازی اور حماقت کے ہاتھوں اسے خود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناراض کر دیا۔ وہ اب شاید مجھے کبھی بھی معاف نہ کرے اور شاید مجھ جیسے لوگوں کے ساتھ ہونا بھی ایسا ہی

چاہیے۔ میری Start sightedness نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ اپنی سوچوں سے گھبرا
ان کے پاس سے کھڑی ہوگئی۔
کمرے سے نکل کر بڑے لٹے لٹے اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتی وہ اپنے آپ سے کہہ رہی
اپنی زندگی میں کھلنے والے خوشیوں کے اس در کو میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا۔ کیا کوئی اور بھی
سا احمق اور جلد باز ہوگا۔

ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں؟
کہ سر فصیل سکوت جاں
کف روز و شب پہ شرر نما
وہ جو حرف حرف چراغ تھا
اسے کس ہوا نے بجھا دیا
کبھی لب ملیں گے تو پوچھنا
سر شہر عہد وصال دل
وہ نکہتوں کا ہجوم
اسے دست موج فراق نے
تہہ خاک کب سے ملا دیا
کبھی گل کھلیں تو پوچھنا
ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں
یونہی خواہشوں کے فشار میں
کبھی بے سبب کبھی بے خلل
کہاں کون کس سے بچھڑ گیا؟
کسے کس نے کیسے گنوا دیا؟
کبھی پھر ملیں گے تو پوچھنا

وہ پارکنگ میں آکر اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے خود کو ہمیشہ سے زیادہ تنہا اور دکھی محسوس کر رہی تھی۔ اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو پلٹے بغیر ہی اس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو سے ا پہچان گئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
''تم نے کبھی مجھے نہیں سمجھا۔ لیکن میں تمہارے چہرے پر موجود تاثرات سے تمہارے دل کی بات جان لیتا ہوں۔ مجھے تمہیں جھکانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن کم از کم اتنا تو کہہ دو کہ تم میرا اور اعتبار کرتی ہو ساری دنیا میں سب سے زیادہ۔ صرف اتنا ہی کہہ دو کہ تمہارے دل سے تمام شکوک ہوگئے ہیں تمہیں مجھ پر یقین آگیا ہے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مضبوط میں کہہ رہا تھا۔
''کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟'' وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی

اس لیے سر جھکا کر بولی تھی۔
''ہاں اس شرط پر کہ آئندہ کبھی مجھ سے بدگمان نہیں ہوگی۔ ہر شخص منافق اور دھوکے باز بھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں ابھی سچی محبت اور خلوص اتنا نایاب بھی نہیں ہوا کہ ہر آدمی کو شکوک کی عینک لگا کر دیکھا جائے۔'' اتنی دیر میں وہ پہلی مرتبہ مسکرایا تھا اور اس کی اس بات پر اپنے چہرے کی سرخ پڑتی رنگت سمت اقرار میں گردن ہلا گئی تھی۔
آج اجالا نے سچ مچ میرے گھر میں اجالا کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں اسے رخصت کر کے اپنے گھر لایا ہوں۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے آج کے دن وہ مجھے پہلی مرتبہ پارک میں ملی تھی اور تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنی پیاری اور منفرد سی لڑکی میرے گھر میں اتنی ساری خوشیاں اور بہاریں لے کر آئے گی۔ میں خوش ہوں بے تحاشا اور بے حساب خوش ہوں۔ میرے بچوں کو ان کی خوشی مل گئی۔ مطمئن اور آسودہ ہوگئے اور اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر میں کیوں نہ خوش ہوں۔ اجالا دلہن بن کر اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ کاش آج ہم دونوں کے درمیان صبیحہ، دانیال اور سبین بھی ہوتے تو ہماری خوشیاں دوبالا ہو جاتیں۔ خیر میں اپنے رب کی رضا میں راضی ہوں۔ اس نے مجھے بے حد نوازا ہے۔ میرا اویس اور میری اجالا میرے پاس ہیں۔ میرا گھر مکمل ہوگیا ہے۔ اب اس گھر میں قہقہے گونجا کریں گے۔ میرے بچے اپنی زندگی کو خوشگوار انداز میں بسر کریں گے اور میں انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر رب کائنات کا شکر ادا کیا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک مجھے یہ سب کچھ ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔
اجالا اور اویس کے بیچ اتنی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی اور میرے سمجھانے بجھانے کا دونوں ہی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر بچوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اجالا اور اویس دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ اجالا جس نے اپنے خونی رشتوں کی بے اعتباری اور ناقدری کا دکھ اٹھایا ہوا تھا کیسے کسی اور پر بھروسہ کر لیتی اور اویس اپنے جذبوں میں سچا تھا اس لیے وہ کیوں جھک جاتا۔ ان دونوں کے رویے اپنی جگہ درست تھے لیکن میں اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے ناراض انا کا پرچم بلند کیے کیسے دیکھتا رہتا۔ خاموش تماشائی بنا اپنے بچوں کی بربادی دیکھتا رہتا۔ وہ ناخوش تھے ایک دوسرے سے خفا تھے اور میں دونوں میں سے کسی کو بھی سمجھا نہیں پا رہا تھا۔
پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ جوان گھر سے بھاگنے سے ڈرتا ہے اور بوڑھا مرنے سے۔ سو اسی مثل پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں نے ایک ڈرامہ تیار کر لیا۔ اس ڈرامے میں میرے ساتھ اخلاق اور بخاری نے بھی اپنا اپنا کردار نہایت عمدگی سے نبھایا۔ اجالا تو خیر ہے ہی سیدھی سادی اور معصوم اصل خطرہ تو اویس سے تھا۔ وہ آخر میرا پوتا ہے اس کی زیرک اور تیز فہم نظروں سے مجھے خوف تھا۔ لیکن آخر میں اسی کا دادا ہوں ایسی کامیاب اداکاری کی کہ اس کے فرشتے بھی اصل حقیقت نہیں جان سکے ہوں گے۔ اخلاق کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ پہلے اویس کو روتے ہوئے فون کرے پھر جب وہ مجھے ہاسپٹل لے جائے تو اجالا کو۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملوانے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا میرے پاس۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ترکیب کامیاب رہی۔ ان دونوں کے بیچ موجود تمام شکوک اور ناراضگیوں کی دھند چھٹ گئی۔ اپنی اس چالاکی کا تو میں انہیں کبھی بھی پتا نہیں چلنے

دوں گا۔ ورنہ وہ آئندہ بھی میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔

اپنے آشیانے کی حفاظت میں نے بخیر وخوبی کر لی اور میں خدائے بزرگ و برتر کا احسان مند ہوا جس نے میرے بچوں کو ان کی روٹھی ہوئی خوشیاں لوٹا دیں۔ میری دعا ہے کہ ادیس اور اجالا کے بیچ اب کبھی کوئی دعا کوئی ماریہ نہ آئے اور اگر آئے بھی تو وہ ہر سازش دشمنی کو ناکام بنا دیں۔ یارب العالمین میرے بچوں کو، سدا خوش اور آباد رکھنا۔ انہیں کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔ انہیں حاسدوں کے حسد اور شرپسندوں کے شر سے بچانا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر اعتبار کریں ایک دوسرے سے پیار کریں۔ انہیں کبھی کوئی دکھ چھو کر بھی نہ گزرے آمین ثم آمین۔

☆☆☆☆☆

پل بھر رستہ طے کرنے میں

''بیٹا! علی تو دیر سے آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ تم خوامخواہ جاگ کر کیوں تھک رہی ہو۔'' پاپا کی آواز پر اس نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور ایک دھیمی سی مسکان چہرے پر سجا کر بولی۔

''جی پاپا میں بس سونے جا رہی ہوں۔'' اس کے جواب پر وہ بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ جانتے تھے علی کی واپسی سے پہلے اس نے سونا نہیں ہے۔

''بس تو پھر کمرے میں جا کر لیٹو۔ اتنی ٹھنڈ میں ٹیرس پر کھڑے ہونے سے سوائے بیماری کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور علی اب کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں ہے۔

وہ اب ایک آرکیٹیکٹ ہے اور صاحب اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ہلے گلے میں مصروف ہوں گے۔ لہٰذا تم بھی اس کی فکر چھوڑو اور آرام سے سو جاؤ۔''

پاپا کی بات کے جواب میں اسے ناچار اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھانے پڑے ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہیں ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر اس کا انتظار کرتی رہے۔ اسے اس کے کمرے کے دروازے تک چھوڑ کر پاپا اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ اندر آ گئی۔

بیڈ پر بیٹھی وہ گھڑی کی ٹک ٹک سنتی علی کی راہ تک رہی تھی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب گیٹ کھلنے اور پھر گاڑی اندر آنے کی آواز سنائی دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ سیڑھیوں پر علی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ اس کی ناراضگی کے خوف سے جلدی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسی وقت وہ اس کے کمرے کا

دروازہ کھول کر اندر آگیا اور اسے جاگتا دیکھ کر خفگی بھرے انداز میں بولا۔
''پتا تھا مجھے آپ جاگ رہی ہوں گی۔ سارا وقت اسی ٹینشن میں گزر گیا کہ آپ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ حالانکہ آپ نے مجھ سے پرومس کیا تھا کہ سو جائیں گی۔''
وہ اس کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔
''لو تمہارے انتظار میں کون جاگ رہا ہے۔ وہ تو میں فلم دیکھ رہی تھی جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔''
''اب آپ مجھ سے جھوٹ بھی بولا کریں گی۔'' علی نے بڑے افسوس سے کہا۔
''بری آپ میرے لیے خود کو اتنی اذیت دیتی ہیں۔ سچ مجھے اس وقت بڑی سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔'' وہ اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے بال اپنے ہاتھوں سے بکھیرتے ہوئے شرارتی انداز سے بولی۔
''میرا خیال ہے کہ شرمندہ صاحب اب آپ خود بھی سو جائیں اور مجھے بھی سونے دیں۔ باقی افسوس وغیرہ کل کے لیے اٹھا رکھیں۔'' وہ اس کی بات کا کوئی جواب دیے بنا کمرے سے چلا گیا تو وہ بھی دوبارہ سے لیٹ گئی۔

☆☆☆

''ممی یہ بلینکٹ کتنا خوب صورت ہے۔'' تانیہ کی آواز پر حمیرا نے بیگ میں سامان رکھتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔ وہ بیڈ پر بکھرے تمام سامان کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے، سوئیٹر، موزے، ٹوپے، پیمپرز کے ڈبے، مدر کیئر کی تمام پروڈکٹس اور بہت سی دیگر چیزیں جو حمیرا بیگ میں رکھ رہی تھیں وہ ان تمام چیزوں کو بڑی محبت سے تکتی ممی کا خوشی سے جھلملاتا چہرہ دیکھنے لگی تو اس کی خود پر مرکوز نگاہیں محسوس کر کے حمیرا نے بیگز ایک طرف رکھ دیے اور اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔
''ہنی! تمہیں بھائی کا شوق ہے۔ تمہارا دل چاہتا ہے کہ تمہارا ایک بھائی ہو جس کے ساتھ تم کھیلو، شرارتیں کرو اور شور ہنگامہ مچا کر سارا گھر سر پر اٹھائے رکھو۔'' ان کی بات پر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور بولی۔
''ممی میرا دل چاہتا ہے کہ میرا بھی کوئی بہن یا بھائی ہو۔ مجھے تو گھر میں اتنی خاموشی لگتی ہے بالکل بھی مزا نہیں آتا۔ اب آپ اور پاپا تو ایک دم بس۔۔۔۔ میرا بھائی آئے گا نا پھر تو مجھے کسی فرینڈ کے گھر جا کر کھیلنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہم لوگ ایک ساتھ سائیکلنگ کیا کریں گے ساتھ بیٹھ کر ہوم ورک کریں گے اور سوئمنگ کرنے جایا کریں گے اور اسکول بھی ایک ساتھ جایا کریں گے۔'' وہ انہیں اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کرنے لگی تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔
''تمہارا ارادہ تو اسے پیدا ہوتے کے ساتھ ہی اسکول لے جانے کا لگ رہا ہے۔ بھئی یہ تو فاؤل ہے۔'' ممی کی بات پر وہ جھینپ سی گئی جبکہ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے پرسوچ انداز میں بولیں۔

''ہنی! تمہیں جیلسی تو نہیں ہوگی اس سے؟''
''جیلسی کس بات کی ممی؟'' وہ حیران ہوئی۔
''جیلسی اس بات کی کہ وہ تمہاری محبت شیئر کرنے آرہا ہے۔ آخر تمہارے ساڑھے سات سالہ حکومت کا خاتمہ کردے گا وہ۔'' ممی کی بات پر وہ قدرے برا مان کر بولی۔
''جی نہیں اس سے بالکل بھی جیلس نہیں ہوں گی بلکہ میں تو اس سے بہت پیار کروں گی۔ آپ سے اور پاپا سے بھی زیادہ میں اس سے پیار کروں گی۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔''
''پتا نہیں میں دیکھ پاؤں گی یا نہیں۔'' ممی کی بات اس کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آئی تھی اسی لیے وہ حیران ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگی تھی جبکہ وہ کچھ چپ چپ اور بجھی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔
''ہنی! تم مجھ سے ایک پرامس کرو گی؟'' ممی نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا تو وہ اپنے چہرے پر بچپنے کی سچی اور سادی سی معصومیت لیے انہیں دیکھنے لگی تھی۔
''تم بھائی کا ہمیشہ بہت خیال رکھو گی۔ اگر میں کہیں چلی گئی تو تم اسے کبھی بھی میری کمی محسوس نہیں ہونے دو گی۔ اس سے بہت پیار کرو گی۔ بولو ہنی کیا تم ایسا کرو گی؟ "Will you take care of him" وہ ان کی بات کا مفہوم ہی نہیں سمجھ پائی تھی تو کہتی کیا۔
''ممی آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' کچھ دیر بعد اس نے اپنی سمجھ کے حساب سے بڑا معقول سوال کیا تو حمیرا نے ایک طویل سانس لے کر اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور خود کو نارمل کرتے ہوئے بولیں۔
''کہیں نہیں جانوں۔ میں تو بس ایسے ہی تم سے پوچھ رہی تھی کہ تم بھائی سے کتنا پیار کرو گی۔ اب ایسا کرو تم جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔ میں بھی سامان کی پیکنگ سے کچھ تھک سی گئی ہوں اس لیے تھوڑا سا ریسٹ کروں گی۔'' ممی نے حسب عادت اس کے گال پر پیار کیا اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔
اس کے جانے کے بعد حمیرا بھی بیڈ پر لیٹ گئیں اور خود کو سرزنش کرنے لگیں کہ تانیہ سے اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ ابھی اتنی چھوٹی اور معصوم ہے کہ ان کی بات تو کیا سمجھے گی بلکہ الٹا کچھ ڈر جائے گی۔ مگر خود ان کا دل عجیب سے وہموں میں مبتلا تھا۔ انہیں لگتا کہ وہ ننھا فرشتہ جس کی آمد کی وہ خود سب سے زیادہ منتظر ہیں جب اس دنیا میں آئے گا تو شاید وہ خود یہاں نہیں رہیں گی۔ وہ اپنی یہ تمام فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتی تھیں کہ شعیب نے ان کی ایک آدھ مرتبہ کی اس قسم کی باتوں پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ اور انہیں وہمی اور پاگل قرار دے دیا تھا۔ بظاہر ان کے اس طرح سوچنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کا کیس بالکل نارمل تھا۔ تمام میڈیکل رپورٹس اور ڈاکٹرز کی آراء پوزیٹو تھیں مگر وہ اپنے اس دل کا کیا کرتیں جو ہر لمحے یہی کہتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں ایک سانحہ رونما ہونے والا ہے۔ وہ ابھی بہت سا جینا چاہتی تھیں اپنے عزیز از جان شوہر کے لیے، اپنے محبتوں بھرے اس آشیانے کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے بچوں کے لیے۔ مگر ان کا وجدان انہیں کسی انہونی کے ہو جانے کی پیشگی اطلاع دے رہا تھا۔
شعیب مراد جوان کے فرسٹ کزن تھے، ان سے حمیرا کی شادی خالصتاً شعیب کی پسند سے ہوئی تھی۔ وہ ان کے سگے پھوپھی زاد تھے اور نند بھاوج کی روایتی چپقلش کی وجہ سے دونوں ہی طرف سے اس شادی کی بہت مخالفت کی گئی تھی مگر شعیب کو پتا نہیں ان میں ایسا کیا نظر آیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر

اپنی اس خواہش سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ ان کی ضد کے آگے آخر کار گھر والوں کو ہار ماننی ہی پڑی تھی اور یوں حمیرا بیاہ کر ان کے گھر آ گئی تھیں۔ شادی کے بعد شعیب کی اپنے لیے دیوانگی دیکھ کر حمیرا حیران رہ گئی تھیں وہ ان سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور وہ اس چاہتوں کی پھوار میں بھیگتی اپنی خوش نصیبی پر خود ہی رشک کیا کرتیں۔ شعیب ایک اچھے اور محبت کرنے والے شوہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی کامیاب اور مستند سرجن بھی تھے۔

Transplantation میں ان کی مہارت اور ہنر مندی کے بڑے بڑے سرجنز معترف تھے۔ ان کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب آپریشنز تھے۔

شادی کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی ہاسپٹل تعمیر کروایا پھر کچھ ہی عرصے میں ان کے ہاسپٹل نے اپنی ایک شناخت اور نام پیدا کر لیا۔ شادی کے ایک سال بعد تابہ پیدا ہوئی تو وہ دونوں ہی بیٹی کی پیدائش پر بہت خوش ہوئے۔ پھر آگے پیچھے پہلے پھوپھی جان اور پھر پھوپھا جان کا انتقال ہوا تو گھر میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے۔ شعیب اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے باقی ان کی دو بہنیں تھیں جو شادی کے بعد کینیڈا اور امریکہ میں مقیم تھیں۔

حمیرا کو بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ خدا انہیں ایک بیٹے سے نواز دے بس پھر ان کی فیملی مکمل ہو جائے گی۔ بیٹے کے لیے ان کا اتنا شوق دیکھ کر شعیب مسکرا دیا کرتے تھے مگر ان کی اس خواہش کی تکمیل فوراً نہ ہو سکی تھی اور اب جبکہ تابہ ساڑھے سات سال کی ہو گئی تھی وہ دوسری مرتبہ پریگنینٹ ہو گئی تھیں۔ آج کل میں کسی بھی روز انہیں ہاسپٹل چلے جانا تھا اور اسی لیے اکیلے ہونے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی تمام تیاریاں مکمل کی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ممی رات سے ہاسپٹل گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر میں ملازمین کے ساتھ تنہا تھی۔ پاپا ممی کو ہاسپٹل لے جانے کے بعد نہ تو گھر آئے تھے اور نہ ہی کوئی فون کیا تھا۔ وہ صبح سو کر اٹھی تو دل اتنا اداس سا ہو رہا تھا کہ اس نے اسکول جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے پاپا پر شدید غصہ آ رہا تھا جو ابھی تک آئے بھی نہیں۔ کیا وہ اپنے ننھے سے بھائی کو دیکھنے ہاسپٹل نہیں جائے گی؟ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ وہ یونہی بوکھلائی ہوئی ادھر سے اُدھر پھرتی رہی۔ فون کی بیل بجی تو اس نے دوڑ کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف پاپا کی آواز سن کر وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔

''پاپا! میرا بھائی آ گیا؟ کیسا ہے وہ؟ ممی کیسی ہیں؟'' وہ ایک سانس میں کئی سوال پوچھ گئی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں پاپا نے اسے کریم بابا کو فون دینے کے لیے کہا تو وہ پاپا سے ناراض ہو گئی۔

''میری بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ کریم بابا کیا مجھ سے زیادہ اہم ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتی کریم بابا کو بلا لائی۔

دوسری طرف پاپا نے پتا نہیں کیا خبر سنائی تھی کہ کریم بابا کے منہ سے بے اختیار چیخ کی صورت ''نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' نکلا تھا۔

دو چار سیکنڈ وہ پاپا کی بات خاموشی سے سنتے رہے تھے اور پھر انہوں نے تھکے ہوئے انداز سے یسیور واپس رکھ دیا تھا۔ فون رکھ کر انہوں نے ایک نظر اس کے حیران و پریشان چہرے پر ڈالی اور پتا ہیں کیوں ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ انہیں روتا دیکھ کر اس کا دل زور زور سے ھڑکنے لگا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ ناسمجھ اور کم عمر مگر کریم بابا کے اس طرح رونے نے اسے بری طرح ہا دیا تھا۔ جو بات اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا وہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

کریم بابا نے اسے بھینچ کر اپنے گلے سے لگایا تو وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گئی اور الٹے ؛موں چلتی ہوئی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے ایک ترحم بھری نگاہ اس پر ڈالی اور فون یسی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ ان کی آواز سن رہی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد نتا کے گھر فون کیا تھا اور جو خبر وہ وہاں ان لوگوں کو سنا رہے تھے وہ اس کے کان سن تو رہے تھے مگر دل اور دماغ ان تمام باتوں کو ماننے سے انکاری تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا گھر لوگوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب لوگوں سے چھپ کر لان میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اندر سے لوگوں کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس کا ل چاہ رہا تھا کہ چیخ کر سب کو چپ کرا دے اور اپنے گھر سے ہاتھ پکڑ کر ان تمام لوگوں کو نکال دے۔ رشام سے کچھ پہلے پاپا، ممی کو لے آئے تھے۔ ممی کو آتا دیکھ کر وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی پاپا کے پاس گئی تھی۔ سوئی ہوئی ممی کو اس نے چیخ چیخ اور جھنجھوڑ کر کتنی ہی آوازیں دی تھیں مگر انہوں نے اس کی کسی ی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنی گود میں ایک ننھی سی جان کو اٹھائے ہوئے پاپا نے آگے بڑھ کر ھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔

''پاپا! ممی میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ وہ تو میرے لیے بھائی لینے گئی تھیں۔ پ کہیے نا ان سے وہ آپ کی بات مان لیں گی۔ پاپا ممی سے کہیں اٹھ کر بیٹھیں۔'' وہ بلک بلک کر رو ہی تھی اور اسے دلاسا دینے کی کوشش میں شعیب خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔ پھر وہ سب لوگ ں کی ممی کو پتا نہیں کہاں لے گئے تھے۔ وہ چیختی رہ گئی تھی کہ میری ممی کو کہیں مت لے جاؤ مگر اس کی التجا کی نے بھی نہ سنی تھی۔

جس بھائی کی آمد کی وہ بھی ممی کی طرح منتظر تھی وہ آ گیا تھا مگر اس نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف یکھا بھی نہیں تھا۔ روتی سسکتی نتا ہی اس ننھے سے بچے کا دھیان رکھ رہی تھیں۔ پاپا خود سارا وقت کمرے میں بند رہتے تھے۔ اس کی طرح انہوں نے بھی اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ ممی کے انتقال کا تیسرا دن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں نتا کے ساتھ سو رہی تھی۔ علی بھی وہیں نتا کے ابر میں لیٹا پر سکون نیند سو رہا تھا۔ وہ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب کمرے کا دروازہ کھول کر ممی ر آئی تھیں اور دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

''منی!'' ممی کی پکار پر وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے سامنے انہیں موجود دیکھ کر رونے لگی تھی۔

''ممی! آپ ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہیں۔ پلیز واپس آ جائیں۔'' اس کی بات پر ممی نے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور بڑے پیار سے بولی تھیں۔

''میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں سوئٹ ہارٹ۔ اور دیکھو تم تو میری بہت ہی بہادر بیٹی ہو اور

بہادر بچے اس طرح تو نہیں روتے۔ اگر تم اپنے آپ کو نہیں سنبھالو گی تو میرے علی کا دھیان کون رکھے گا۔ جانو! تمہیں بھائی کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔ اتنا کہ اسے کبھی میری کمی محسوس نہ ہو۔ تم ایسا کرو گی نا؟'' ممی نے بڑی آس و امید سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ ممی اس کے جواب پر مطمئن ہوتی مسکراتی کھڑی ہونے لگیں تو اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

''ممی! مت جائیں پلیز! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''ہنی! تم اکیلی تو نہیں ہو۔ پاپا ہیں تمہارے پاس اور علی بھی تو ہے۔ ان دونوں کے ہوتے تم تنہا تو نہیں ہو۔'' ممی نے اس کا ماتھا چوما اور پھر اس کی پکار اور روکنے کے باوجود وہ چلی گئی تھیں۔

وہ چیخ چیخ کر ممی کو آوازیں دے رہی تھی۔ جب اس نے نتا کی آواز سنی تھی وہ اس کے برابر میں بیٹھی سخت خوف زدہ اسے اٹھا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نتا اس پر جھکی اپنے اشک چھپاتی بغور اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''بیٹا! خواب میں ڈر گئی ہو۔'' نتا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تو وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نتا ابھی امی آئی تھیں آپ نے انہیں دیکھا تھا؟'' اس کی بات کے جواب میں نتا نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور اس کا سر اپنے ہاتھ پر رکھ کر اپنے برابر میں لٹا کر اس کے اوپر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی تھیں۔ نتا کہہ رہی تھیں کہ اس نے خواب دیکھا ہے مگر وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ممی اصل میں میرے پاس آئی تھیں۔ وہ خاموشی سے نتا کے پاس لیٹی ممی کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔

اسی وقت شاید بھوک کی وجہ سے علی نے رونا شروع کیا تو وہ پہلی مرتبہ اس ننھے سے وجود کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ نتا نے فیڈر میں اس کے لیے دودھ ڈالا اور بوتل اس کے منہ سے لگا دی جبکہ وہ چپ چاپ اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دودھ پلا کر نتا سو گئیں تو وہ ان کے برابر سے اٹھ کر دوسری طرف آ کر علی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں علی کا چہرہ تھام کر اس کے بوسے لیے تھے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا اسے، وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی مگر ایک عجیب سی قوت اور کشش تھی جو اسے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا سے چھپا کر اسے کہیں بہت احتیاط اور محبت سے رکھے جہاں کوئی دکھ اور کوئی غم اسے چھو بھی نہ سکے۔

اب تک وہ ممی کے جانے کا ماتم کر رہی تھی مگر اب اچانک ہی اس کی سوچ اور خیالات بدل رہے تھے۔ اسے علی کا دکھ اپنے دکھ سے کہیں بڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تو اتنے سال تک ممی کی محبت اور چاہت سمیٹی تھی اور وہ کتنا بد نصیب تھا جسے ماں کی آغوش لمحے بھر کے لیے بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے دنیا میں آ کر ابھی پہلی سانس ہی لی تھی کہ اس کی ماں نے دنیا سے ناتا ہی توڑ لیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اپنا دکھ بھلائے علی کے دکھ پر بے آواز روئی تھی اور پھر وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی تھی۔

ممی کے چالیسویں تک نتا وہیں رہی تھیں۔ اس دوران انہوں نے پاپا کا، تانیہ کا اور سب سے بڑھ کر علی کا بے حد خیال رکھا تھا۔ خود وہ سارا سارا دن علی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ جاتے وقت جب نتا علی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگیں تو وہ پاپا کے پاس آ گئی تھی۔

''پاپا! نتا علی کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں۔'' اس کی اطلاع پر پاپا نے بڑے سکون سے گردن ہلا دی تو وہ چیخ اٹھی۔

''آپ اسے جانے دے رہے ہیں۔''

''بیٹا! یہاں اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اتنے چھوٹے بچے کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہے۔'' انہوں نے اس کا اضطراب محسوس کرتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا تو وہ فوراً بولی۔

''میں رکھوں گی اس کا خیال۔'' اس کی بات پر پاپا نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''پاپا! آپ علی کو روک لیں۔ میں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ میں علی کا خیال رکھوں گی۔ اب اگر علی چلا گیا تو ممی مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی تو ان کا دل اپنی اس بے حد حساس بیٹی کے لیے کڑھ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ماں کی موت نے اس معصوم کے دل و دماغ پر کیسے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر انہوں نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا اور کتنی ہی دیر وہ اسے سمجھاتے رہے کہ نتا کے ساتھ چلے جانا ہی علی کے حق میں زیادہ بہتر ہے اور جب وہ چاہے گی پاپا اسے اسلام آباد لے جائیں گے پھر جب علی دو چار سال کا ہو جائے گا تو وہ اسے واپس اپنے پاس لے آئیں گے۔ پاپا کے تمام سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا اور بدستور وہ اپنی ضد پر قائم رہی تھی۔

ناچار پاپا کو اپنے رویے میں سختی پیدا کرنی پڑی تھی۔ ان کی ڈانٹ پر وہ چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ اس کے یک دم خاموش ہو جانے پر ان کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ تو بلا کی ضدی اور شرارتی تھی۔ یوں چپ چاپ ماننا تو اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ مگر وہ اس وقت اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اس کی طفلانہ ضد آخر وہ کیونکر مان سکتے تھے جو محبت اور توجہ نتا علی کو دے سکتی تھیں وہ کوئی گورنس کبھی بھی نہیں دے سکتی تھی اس لیے انہوں نے نتا کی تجویز سے اتفاق کیا تھا اور علی کو ان کے ساتھ بھیج رہے تھے۔ حمیرا کے بغیر تو ابھی خود وہ ڈھنگ سے جی نہیں پا رہے تھے کہ کہاں گھر اور بچوں کی ذمہ داری درست طریقے سے اٹھا پاتے۔ علی نتا کے ساتھ چلا گیا تو اس کا سکھ چین بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے کھانا پینا سب چھوڑ دیا تھا۔ بخار ایسا چڑھا تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی بیماری نے پاپا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے ہر جتن کر لیا مگر اس کا بخار اتر کر نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اسے ہاسپٹلائز کرنا پڑا۔

اس کی پندرہ دنوں کی بیماری نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر ہاسپٹل کے بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کی بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار پاپا نے علی کو واپس بلوانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس چھوٹی سی بچی سے شکست کھا گئے تھے۔ علی کے واپس آنے کی دیر تھی کہ وہ ایک دم ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کی صحت یابی پر پاپا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ علی کو اس کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر بلوا لیا تو تھا مگر اب اس کی دیکھ بھال کا مسئلہ تھا۔ نتا کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آ جاتیں۔ آخر وہاں بھی ان کے بچے تھے، گھر تھا اس لیے اپنی تمام تر تشویش کے باوجود وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے سے قاصر تھیں۔

پاپا نے اپنے جاننے والوں سے کسی گورنس کی دستیابی کے بارے میں بات کی تو آخر کار جلد ہی انہیں ایک خاتون میسر آ گئیں۔ چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ان کی عمر ہوگی۔ ان کے شوہر نے انہیں اولاد نہ ہونے کے جرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کچھ پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی محسوس ہوئیں تو پاپا نے انہیں رکھ لیا۔ شاہدہ آنٹی کے آنے کے باوجود علی زیادہ وقت اسی کے پاس رہا کرتا۔ وہ اسکول سے آ کر سارا سارا دن اسے گود میں اٹھائے یہاں سے وہاں پھرا کرتی۔ وہ علی کا کوئی بھی کام کرنے سے نہیں گھبراتی تھی۔ اس کی فیڈر بنانی ہو، اس کے کپڑے بدلنے ہوں یا اس کا Pamper ہی کیوں نہ چینج کرنا ہو۔ وہ تمام کام اتنی عمدگی اور چابک دستی سے کرتی کہ شاہدہ آنٹی حیران رہ جاتیں۔ علی سے اس کا والہانہ لگاؤ دیکھ کر شعیب کو اکثر ہی حمیرا یاد آ جاتی۔ کتنی خواہش تھی انہیں ایک بیٹے کی۔ آج وہ بیٹا موجود تھا مگر اس کے لیے ممتا کے خزانے لٹانے والی وہ ہستی نہیں تھی۔

علی چار ماہ کا ہوا تو اس نے شاہدہ آنٹی سے کہہ کر اس کے لیے سیریلیک منگوا کر انہیں مزید حیران کر دیا۔ کبھی کبھی تو انہیں ایسا لگتا جیسے وہ مفت کی تنخواہ وصول کر رہی ہیں۔ اس کے تمام کام تو وہ خود ہی کر لیا کرتی تھی۔ رات میں وہ، علی اور شاہدہ آنٹی ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ علی بستر گیلا ہونے سے یا بھوک سے رونے لگتا اور شاہدہ آنٹی سوتی رہ جاتیں جبکہ وہ اس کی ہلکی سی آواز پر اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی۔ پھر خود ہی اسے چینج کر دیتی یا فیڈر بنا کر منہ سے لگا دیتی۔ جتنی دیر وہ اسکول میں ہوتی اس کا سارا دھیان علی کی طرف رہتا۔ گھر واپس آتے ہی وہ بیگ رکھے بغیر علی کے پاس آ جاتی۔

وہ خود اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں چلتا وہ ہمکتا ہوا اپنے بازو اس کی طرف بڑھا دیتا اور وہ اسے اپنی آغوش میں چھپا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتی۔ دوستوں میں، کھیلوں میں، کھلونوں میں اور ٹی وی میں اس کی کسی بھی چیز میں دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی بے زارگی سے تنگ آ کر اس کی فرینڈز بھی اس سے بہت دور ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے شرارتیں کرتیں، کھیلتیں کودتیں اور وہ ایک طرف بیٹھی علی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ صرف آٹھ سال کی عمر میں اس کا بچپن رخصت ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف ایک ماں تھی علی کی ماں۔ اس کا دھیان رکھنا، اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، اسے علی کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں کرتا تھا۔

شروع شروع میں علی کے بارے میں اس کا اتنا پوزیسو ہونا پاپا نے ممی سے جدائی کا صدمہ سمجھ کر برداشت کر لیا مگر اب تو انہیں رخصت ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور اس کی دیوانگی بجائے کم ہونے کے بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل انہوں نے اسے پیار محبت سے سمجھایا کہ اسے اپنی فرینڈز کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے اسے دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں دلچسپی لینی چاہیے مگر جب اس نے ان کی کسی نصیحت پر کان نہیں دھرے تو انہوں نے اپنے رویے میں سختی پیدا کر لی۔ وہ ان کے کہنے پر کھیلنے کے لیے چلی جاتی مگر وہ دیکھتے تھے کہ اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا تھا۔ وہ کھیل کر واپس آتی تو پاگلوں کی طرح علی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی۔

وہ اس کی حالت دیکھ کر ڈر سے گئے کیا ان کی بیٹی نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔ اس کے ساتھ کافی ساری سیٹنگز کرنے کے بعد سائیکاٹرسٹ نے پاپا سے کہا کہ انہیں تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ صرف یہ ہے کہ

ان کی بیٹی عام لوگوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا رویہ بتدریج نارمل ہوتا چلا جائے گا۔ زور زبردستی سے یا کسی بھی قسم کا پریشر ڈالنے سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ اسے موقع دینا چاہیے وہ خود ٹھیک ہو جائے گی اور یوں پاپا نے اس کی دیوانگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ پرائز ڈسٹری بیوشن سرمنی میں پاپا آئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ اپنی ٹرافی، گفٹس اور رپورٹ کارڈ اٹھائے وہ پاپا کے پاس آئی تو انہیں لگا کہ شاید وہ ابھی ہسٹریک ہو کر رونا شروع کر دے گی۔ اس کے اسکول میں پیرنٹس، ٹیچرز میٹنگ ہوتی یا سالانہ فنکشن ہمیشہ ممی ہی آیا کرتی تھیں۔ پاپا ہر بار وعدہ کرنے کے باوجود غائب ہو جاتے اور بعد میں ممی ان سے خوب لڑتی تھیں کہ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کی اسٹڈیز میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسی لیے انہیں لگا تھا کہ وہ حمیرا کی کمی محسوس کرتے ہوئے شاید رونا شروع کر دے گی مگر ان کی توقعات کے برخلاف وہ آرام سے مسکراتی ہوئی انہیں اپنی رپورٹ کارڈ اور گفٹس دکھانے لگی تو انہوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو وہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔

وہ سارا دن اس نے پاپا، علی اور شاہدہ آنٹی نے باہر گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ پاپا نے اسے بہت ساری شاپنگ کرائی، کھلونے دلائے اور اس کی پسند کا ڈنر کرایا۔ وہ خوش تھے کہ تانیہ بہل گئی ہے اور اس کی خاطر انہوں نے اپنے موڈ کے خلاف تمام دن گھر سے باہر گزارا تھا۔

رات سونے سے پہلے وہ ایک نظر علی اور تانیہ کو دیکھنے ان کے بیڈروم میں آئے تو تانیہ کو بستر سے غائب پا کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ باتھ روم کی لائٹ بھی بند تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے لاؤنج کی طرف جانے لگے تو اسٹڈی روم کی لائٹ جلتی دیکھ کر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اسٹڈی روم میں فلور کشن پر سر رکھے وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے اس کے پاس آ گئے۔ وہ گہری نیند میں سو رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی آنسوؤں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ روتے روتے سوئی ہے۔ اس کے سینے پر ایک ڈائری اوندھی رکھی ہوئی تھی شاید وہ سونے سے پہلے کچھ لکھتی رہی تھی۔ وہ اس کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئے اور بڑے آرام سے ڈائری اس کے ہاتھ میں سے نکال کر اٹھا لی۔ پوری ڈائری خالی تھی۔ صرف پہلے ایک دو صفحوں پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈائری پڑھنی شروع کی۔

''میری پیاری ممی!

آج میں نے آپ کو بہت مس کیا۔ آپ کو پتا ہے میں نے اس بار بھی اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ آڈیٹوریم میں بیٹھے پاپا کو دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔ یاد ہے لاسٹ ایئر میرے رزلٹ والے دن پاپا وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آئے تھے اور ہم دونوں ہی ان سے سخت خفا ہو گئے تھے۔ پھر رات میں پاپا نے ہم دونوں سے ایکسکیوز کیا تھا اور ہم لوگ ایک ساتھ ڈنر کرنے گئے تھے۔ آج پاپا میرے کہے بغیر خود ہی آ گئے تب بھی میرا دل بہت سارا رونے کو چاہ رہا تھا۔

مگر میں نے اپنے اوپر کنٹرول کیا اگر میں روتی تو میرے رونے سے پاپا پریشان ہوجاتے۔ میں پاپا اپنی وجہ سے دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ پہلے ہی اتنے اپ سیٹ رہتے ہیں۔ میں انہیں اپنی وجہ سے کیوں دوں۔ ممی! پاپا بالکل چینج ہوگئے ہیں وہ ہر وقت چپ چاپ رہتے ہیں اب نہ تو وہ آفاق انکل کے ساتھ گالف کھیلنے جاتے ہیں اور نہ ہی مدثر انکل کے ساتھ جیم خانہ جاتے ہیں۔ ہاسپٹل سے آکر سارا وقت میرے اور علی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ وہ میرا اور علی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ممی آپ کیوں چلی گئیں۔ آپ کے بغیر میں، پاپا اور ہمارا گھر سب ہی بہت اداس ہیں۔

پتا ہے ممی پچھلے مہینے نرگس پھوپھو پاکستان آئی تھیں۔ ہم لوگوں سے ملنے آئیں تو مجھے دیکھ کر لگیں کہ ''ارے تابیہ تو ہو بہو حمیرا کی کاپی ہے۔'' مجھے ان کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ممی آپ بتائیں کیا میں واقعی آپ کے جیسی ہوں؟ آپ تو اتنی خوب صورت تھیں، اتنی پیاری اور چارمنگ سوئٹ ممی! علی کا میں بہت خیال رکھتی ہوں وہ اب بہت شرارتی ہوگیا ہے اور مجھے تو ایک منٹ کے بھی نہیں چھوڑتا۔ شاہدہ آنٹی بتا رہی تھیں کہ جب میں اسکول میں ہوتی ہوں، علی اس وقت گھٹنوں گھٹنوں چلتا مجھے پورے گھر میں تلاش کرتا ہے۔ میرے پاس سے وہ کسی کی بھی گود میں نہیں جا یہاں تک کہ پاپا کے پاس بھی نہیں۔ اچھی ممی! پلیز آج آپ مجھے خواب میں نظر آجائیں۔ اسلامیات کی ٹیچر میڈم تحریم بتا رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کو جو لوگ بہت اچھے لگتے ہیں وہ انہیں اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ وہاں آسمان پر اللہ تعالیٰ نے ایک بہت ہی خوب صورت جنت بنائی ہے۔ ممی آپ کو وہاں میں مزا آتا ہے؟ وہ جگہ کیا بہت ہی خوب صورت ہے؟ کیا ہمارے گھر سے بھی زیادہ؟ پلیز ممی تھوڑی دیر کے لیے اپنی جنت سے مجھے ملنے آجائیں۔ میں خواب میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔''

وہ ڈائری ایک طرف رکھ کر اب بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خواب میں اپنی ماں کی آغوش میں چھپی اپنے دل کی تمام باتیں انہیں بتا رہی ہے۔ اس کے دکھ پر وہ اپنے اشک بمشکل روک پائے تھے۔ ان کی بیٹی اتنی حساس اور مختلف ہوگی اتنا زیادہ اندازہ انہیں آج سے پہلے کبھی نہ تھا۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ وہ رفتہ رفتہ بہل رہی ہے۔ مگر دھیرے دھیرے اپنے خول میں سمٹتی جا رہی تھی۔ وہ اتنی چھوٹی سی لڑکی اپنی فیلنگز ان سے چھپائے دکھوں کو خود ہی سہے جا رہی تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اپنے بیڈ روم میں لے آئے۔

پھر انہوں نے اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ساری باتیں کرتے۔ ممی کے بارے میں، علی کے بارے میں اور خود اس کے بارے میں۔ اس کی خاطر انہوں نے دوبارہ سے جیم خانہ جانا شروع کر دیا۔ علی اور وہ بھی ان کے ساتھ جاتے طرح پہلے ممی سے اس کی بہت دوستی تھی اسی طرح اب پاپا سے بھی اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ کوئی بھی بات پاپا سے نہیں چھپاتی تھی۔ ان کی بہنوں نے اور خاندان کے دوسرے افراد نے دوسری شادی کا مشورہ دیا جسے انہوں نے بغیر کوئی اہمیت دیے فوراً رد کر دیا۔ کوئی دوسری عورت جگہ لے ہی نہیں سکتی تھی۔

انہوں نے ازدواجی زندگی کے ساڑھے آٹھ سال اتنے بھرپور اور خوش گوار گزارے تھے

ن کی یاد میں ساری زندگی بتا سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا محور اب صرف اور صرف ان کے بچے تھے۔ ان پروفیشن اور ان کے بچے ہی اب ان کے جینے کا بہانہ تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ علی ڈھائی سال کا ہوا تو پاپا نے اسے مونٹیسوری میں داخل کروادیا۔ علی کے لبوں نے جو پہلا نام پکارا وہ ''بجو'' تھا۔ توتلے لب و لہجے میں اسے ''بجو'' کہتا وہ بے حد پیارا لگا تھا۔ صبح وہ اور علی دونوں ہی اسکول چلے جاتے۔ واپس آکر وہ علی کے کپڑے بدلواتی اس کا ہاتھ دھلاتی پھر اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر کھانا کھلاتی۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت زے دکھاتا تھا۔ شاہدہ آنٹی تنگ آجاتیں وہ ان کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز نہیں کھاتا تھا۔ تابیہ پورے گھر میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی۔ بڑی دقتوں سے اسے کھانا کھلانے میں کامیاب ہوتی۔ شاہدہ آنٹی کو دیکھ دیکھ کر اس نے بھی تھوڑا بہت پکانا سیکھ لیا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی وہ علی کے لیے اپنے ہاتھ سے کسٹرڈ بناتی، کبھی پتلی کھچڑی اور کبھی دلیہ۔ اس کوشش میں اکثر اوقات اس کے ہاتھ جل جاتے مگر وہ ں تکلیف کی پروا نہیں کرتی تھی۔

ایک آدھ مرتبہ پاپا کی نظر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر پڑ گئی تو انہوں نے شاہدہ آنٹی کی خوب خبر کہ وہ بچی سے اتنی غافل رہتی ہیں۔ اسے بھی پاپا نے سخت تنبیہ کی تھی کہ چولہے میں نہیں گھسنا۔ مگر وہ ں دل کا کیا کرتی جو علی کی خدمت کرنے کے لیے مچلتا رہتا تھا۔ یوں وہ پاپا اور شاہدہ آنٹی سے چوری ہے اکثر ہی علی کے لیے کچھ نہ کچھ پکا دیا کرتی۔

علی چار سال کا ہوگیا تھا۔ خود وہ 7th کلاس میں آگئی تھی۔ انہیں دنوں شاہدہ آنٹی کو ان کے بھائی نے اپنے پاس جدہ بلا لیا تو وہ اپنے بھائی کے پاس جدہ چلی گئیں۔ ان کے جانے سے پاپا ایک مرتبہ پھر یشان ہوگئے۔

بچے ان سے مانوس ہوگئے تھے۔ فوری طور پر ان کا نعم البدل ملنا انہیں مشکل نظر آرہا تھا مگر یہ کھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شاہدہ آنٹی کے چلے جانے کے باوجود گھر میں اور بچوں کی زندگی ں کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ صبح تابیہ کو اسکول کے لیے اٹھانے آتے تو وہ انہیں پہلے سے جاگی ہوئی ملتی۔ جلدی جلدی خود تیار ہو کر علی کو بھی اسکول کے لیے تیار کراتی۔ اس کے بیگ وغیرہ یک کرتی اور پھر علی کا ہاتھ پکڑ کر ناشتے کی میز پر آکر بیٹھ جاتی۔ کھانا پکانے کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کریم بابا انے ملازم تھے۔ کھانا پکانے اور گھر کے بیشتر امور انہیں کی نگرانی میں انجام پایا کرتے تھے۔ وہ اپنی یا کی سمجھ داری اور میچیور انداز کو دل ہی دل میں سراہ کر کچھ مطمئن ہوگئے اور یہی سوچا کہ جب بھی وئی اچھی خاتون ملیں انہیں رکھ لیں گے۔ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علی کو انہوں نے اپنے ں سلانا چاہا تو تابیہ نے منع کر دیا۔

''پاپا! مجھے علی کے بغیر نیند نہیں آئے گی۔'' خود علی نے بھی اسی کے پاس سونے کی خواہش کا ظہار کیا تو وہ بچوں کی بات مان گئے۔ رات میں بچوں کو دیکھنے آتے تو علی اس کے بازو پر سر رکھ کر سوتا ظر آتا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر گہری نیند سوتی ہوئی ملتی۔ وہ بہن بھائی کا ایک دوسرے سے اتنا پیار ور یگانگت دیکھ کر سرشار سے ہوجاتے۔ خدا نے انہیں کتنی اچھی اولاد سے نوازا تھا۔ وہ اپنے رب کا جتنا ی شکر ادا کرتے کم تھا۔ اس رات روزانہ کی طرح وہ علی کو کہانی سنا رہی تھی۔ روز رات کو سونے سے

پہلے وہ اس سے کہانی سنتا تھا۔ کبھی وہ اسے سنڈریلا کی کہانی سناتی، کبھی سنو وہائٹ، کبھی سلیپنگ بیوٹی اور کبھی جیک اینڈ دا بینز اسٹاک کی۔ کہانی سنتے سنتے اچانک علی نے اس سے سوال کیا تھا۔

"بجو! پری کیسی ہوتی ہے؟" وہ اس کے سوال پر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"پری بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ وہ بڑی ہمدرد اور نیک ہوتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ پر سے اپنا سر اٹھا کر بولا تھا۔

"کتنی خوب صورت ہوتی ہے؟ کیا آپ کے جتنی؟" وہ چار سال کی عمر ہی میں بلا کا ذہین اور سمجھدار تھا۔ وہ اس کے سوال جواب پر ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"علی! کیا میں خوب صورت ہوں؟"

"ہاں!" وہ سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔

"بتائیں نا بجو پری آپ کے جیسی خوب صورت ہوتی ہے؟" وہ اپنا سوال بھولا نہیں تھا۔

"پتا نہیں بھئی۔ میں نے کبھی اصل میں کوئی پری دیکھی تھوڑی ہے۔ بس سنا ہے کہ پریاں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا تو علی نے کہا۔

"بس پھر اب میں آپ کو بجو نہیں کہوں گا۔ آپ تو پری ہیں۔" وہ علی کی بات پر ہنس پڑی تھی اور اس روز کے بعد سے علی نے اسے بجو کے بجائے پری کہنا شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اس نام پر بہت چڑتی تھی۔ علی کو منع بھی کیا تھا۔ جتنا وہ چڑتی وہ اتنا ہی اسے پری کہتا۔ پاپا کی عدالت میں اس کا مقدمہ پہنچا تو وہ اس کی ناراض شکل دیکھ کر ہنس پڑے تھے اور بجائے علی کو منع کرنے کے الٹا اسے شاباش دینے لگے تھے کہ اس نے تابیہ کے لیے بڑا ہی مناسب نک نیم تجویز کیا ہے۔

پاپا کی حمایت پا کر علی اور شیر ہو گیا تھا۔ بالآخر اسے اس نک نیم سے سمجھوتا کرنا ہی پڑ گیا تھا۔ اسے لگتا کہ اگر علی نے کسی اور کے سامنے اسے اس نام سے پکارا تو ضرور اس کا مذاق بنے گا۔ مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ ہر کوئی علی کو سراہتا کہ اس نے تابیہ کے لیے بہت اچھا نام منتخب کیا ہے۔

وہ اپنے ساتھ بٹھا کر علی کو ہوم ورک کراتی۔ اس کی پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت زیادہ دلچسپی لیتی۔ شام میں پاپا گھر واپس آتے تو وہ دونوں انہیں بیگ پھیلائے پڑھتے ہوئے نظر آتے۔ تابیہ تو تھی ہی بہت سمجھدار۔ انہیں کبھی بھی اسے پڑھائی کے بارے میں کوئی تاکید کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی مگر اس معاملے میں علی بھی بہن کے ہم قدم بلکہ اس سے دس قدم آگے ہی تھا۔ وہ بے تحاشا ذہین تھا۔ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں اس کی ذہانت اور لیاقت کے سب ہی قائل تھے۔ ہوم ورک کرنے کے بعد علی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا تو وہ پاپا کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔

وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اسے اپنے پاپا سے اور بھی زیادہ محبت ہونے لگی تھی۔ وہ کتنے اچھے تھے۔ اس کی ممی کے مرنے کے بعد وہ ان لوگوں کے لیے اسٹیپ مدر لے کر نہیں آئے تھے۔ ان کے بیڈ روم میں آج بھی اس کی ممی کی انلارج تصویر لگی ہوئی تھی۔ اسے پاپا کی تنہائی پر بہت افسوس ہوتا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اتنا تو سمجھ سکتی تھی کہ پاپا خود کو کتنا اکیلا سمجھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا اتنا دھیان رکھتے ہیں مگر خود ان کا دھیان رکھنے والا کون تھا؟ اس نے دھیرے دھیرے علی کی طرح پاپا کا بھی خیال رکھنا شروع کر دیا۔

ان کے کپڑے وارڈ روب میں ہینگ کر کے صحیح سے رکھتی۔ ٹائیاں، موزے اور رومال سلیقے سے الگ جگہ رکھتی۔ ممی کے بغیر پاپا کی زندگی میں کتنی بے ترتیبی آ گئی تھی۔ اب صبح جب پاپا ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہو رہے ہوتے تو وہ ان کی تیاری میں مدد کرانے ان کے کمرے میں آ جاتی۔ ان کی ٹائی کی ناٹ بنا کر دیتی۔ ان کے شوز پالش کر کے رکھتی۔ شروع شروع میں انہوں نے اسے ایسا کرنے سے روکا مگر جب وہ برا مان کر ان سے ناراض ہونے لگی تو انہیں خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

شاہدہ آنٹی کی صحبت میں وہ کافی کچھ پکانا تو سیکھ ہی گئی تھی۔ اس لیے اب علی کے لیے لنچ باکس بھی تیار کرتی۔ خود پاپا کو اب صرف اسی کے ہاتھ کی چائے پسند آتی تھی۔ اس کی زندگی کا محور اور مقصد بس پاپا اور علی تھے۔ ان دونوں کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔ بس وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ وہ ہر لمحہ یہی دعا کرتی۔

☆☆☆

انٹر سائنس پری میڈیکل گروپ سے کر کے وہ فارغ ہوئی تو آگے وہ کون سی فیلڈ اختیار کرتی ہے یہ فیصلہ پاپا نے کلی طور پر اس پر چھوڑ دیا۔ وہ پڑھائی کے معاملے میں زور زبردستی کے قائل نہ تھے۔ اس نے انٹر میں بہت محنت کی تھی اسے یاد تھا کہ ممی اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ اس کی انٹر میں بہت اچھی پرسنٹیج آئی تھی تو وہ ممی کی خواہش کیونکر نہ پوری کرتی۔ پاپا نے اس کا فیصلہ سنا تو انہیں بھی بہت خوشی ہوئی اور یوں اس کا ایڈمیشن ڈی ایم سی میں ہو گیا۔ علی ان دنوں سکستھ اسٹینڈرڈ میں تھا۔ میڈیکل کی پڑھائی اسے بالکل بھی مشکل نہیں لگتی تھی۔ گھر میں اس کی راہنمائی کے لیے پاپا موجود تھے۔ اس کے اسائنمنٹ اور نوٹس ساری کلاس میں بہترین ہوتے تھے۔ پاپا پڑھائی میں اس کو بہت گائیڈ کر رہے تھے۔ ان دونوں ہی نے پڑھائی کے معاملے میں پاپا کو ہرگز بھی مایوس نہیں کیا تھا۔ علی نے او لیول کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کیا تھا۔ تمام مضامین میں اس کا اے گریڈ تھا۔ پھر اے لیول میں بھی اس نے تمام مضامین میں اے گریڈ حاصل کر کے پاپا کا سر فخر سے بلند کرا دیا۔ اے لیول میں تمام مضامین میں اے گریڈ حاصل کرنا کوئی مذاق نہ تھا۔ خود تابیہ کا یہ حال تھا جیسے یہ کامیابی علی کی نہیں بلکہ خود اسی کی ہے۔ وہ ان دنوں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ تابیہ کی طرح پاپا نے علی کو بھی مکمل آزادی دی تھی کہ وہ آگے جو کچھ پڑھنا چاہتا ہے پڑھے۔ اس نے اپنے لیے آرکیٹیکٹ کی فیلڈ کا انتخاب کیا تھا۔ تابیہ کی ہاؤس جاب مکمل ہوئی تو اس نے پاپا کا ہاسپٹل جوائن کر لیا تھا۔

وہ بہت خوب صورت تھی، پڑھی لکھی تھی اور پھر ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ میڈیکل کی پڑھائی کے دوران ہی کئی اچھے گھرانوں سے اس کے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے مگر ان میں سے کسی کے بارے میں بھی پاپا نے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے تابیہ اپنی پڑھائی ختم کر لے پھر شادی کریں گے۔ خاندان میں بھی کئی لوگوں نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ خود ان کی بہن نرگس اور تابیہ کی خالہ ثمرہ نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے تابیہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر سوچیں۔ ان کا زیادہ جھکاؤ خاندان میں کرنے کی طرف تھا مگر وہ بیٹی کی رائے اور اس کی پسند ناپسند کو ہر حال میں مقدم سمجھتے تھے۔

نرگس شکاگو میں رہتی تھیں اور ان کے بیٹے نے ایم بی اے کیا ہوا تھا اور وہیں ایک فرم میں ملازم

تھا جبکہ ثمرہ کے بیٹے نے کمپیوٹر انجینئرنگ کیا ہوا تھا اور ایک ملٹی نیشنل میں جاب کر رہا تھا۔ ثمرہ کی فیملی لاہور میں سیٹل تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے ہامی بھرنا چاہتے تھے۔ اگر اس کی ممی زندہ ہوتیں تو وہی اس سے اس بارے میں بات کرتیں ان کی کمی اس موقع پر شعیب کو بہت محسوس ہوئی تھی۔ آخر کار انہوں نے خود ہی اس سے بات کی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی اتنی فرماں بردار اور سعادت مند ہے کہ یہ فیصلہ ان کی مرضی پر چھوڑ دے گی اور ان کی رضا کے آگے سر جھکا دے گی مگر اس مقام پر وہ اتنی مختلف ثابت ہوئی کہ وہ حیران رہ گئے۔

اس نے دونوں پروپوزلز ریجیکٹ کر دیے تھے۔ ان کے زیادہ اصرار اور اس بات پر کہ کیا وہ کسی کو پسند کرتی ہے یا کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہے اس نے انکار میں گردن ہلا کر یہ کہا تھا کہ وہ پاپا اور علی کو چھوڑ کر کراچی سے باہر کہیں نہیں جائے گی۔ نہ شکاگو اور نہ ہی لاہور۔ پاپا نے ہر جتن کر لیا۔ کتنی ساری مثالیں دیں۔ اسے اس کی ممی کا بتایا کہ وہ اسلام آباد میں اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ کراچی آ گئی تھیں۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ شادی کے بعد ہر لڑکی کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے مگر وہ ان کی کسی بھی دلیل سے قائل نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاس آخری ہتھیار آنسو تھے سو وہ آنسو بہانے بیٹھ گئی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح پاپا اس کے آنسوؤں سے ہار گئے تھے۔ نرگس اور ثمرہ دونوں ہی کو انکار کر دیا گیا۔ ثمرہ نے تو پھر بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اور اس بات پر خفا نہیں ہوئیں مگر نرگس نے اس انکار کو اپنی توہین سمجھا اور بھائی سے خوب لڑ جھگڑ کر تمام تعلقات منقطع کر لیے۔

علی اس سارے قصے میں خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ اس طرح تو اس نے اس سے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں جیسی بہن کبھی اسے چھوڑ کر بھی چلی جائے گی۔ اپنی سگی ماں کو تو اس نے صرف تصویروں اور موویز میں ہی دیکھا تھا مگر ماں کی ممتا کیا ہوتی ہے اور ماں کی گود میں کیسی گرمی، تحفظ اور اطمینان ملتا ہے یہ سب تو اس نے تانیہ ہی سے پایا تھا۔ جتنی شدت سے تانیہ ممی کو یاد کرتی تھی علی نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں تو اس کے پاس تھی۔ وقتی طور پر اس کی شادی کا ایشو دب گیا تھا کہ خاندان میں انکار کر کے فوراً ہی خاندان سے باہر کہیں رشتہ طے کر کے وہ سب لوگوں کو مزید ناراض نہیں کر سکتے تھے۔ اس قصے سے نجات ملنے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

مگر اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ اس بار تو پاپا نے اس کی ضد مان لی ہے کیا آئندہ بھی وہ اس کی بات مان لیں گے؟ وہ پاپا کو کیسے بتائے کہ اسے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ نہ آج نہ کل۔ وہ ہمیشہ پاپا اور علی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگی میں کسی تیسرے فرد کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ کیسے پاپا اور علی کو چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر پاپا کا کیا ہوگا۔ وہ تو اپنی صحت کے معاملے میں اتنی لاپروائی برتتے ہیں۔ اپنے مریضوں کے چکر میں لگ کر انہیں اپنی صحت کا اور اپنی ڈائٹ کا بالکل بھی خیال نہیں رہتا اور علی وہ تو پڑھائی کی دھن میں کھانا پینا تک بھول جاتا ہے۔ ابھی تو اس کا آرکیٹیکچر کا پہلا سال ہے۔ ابھی تو اسے بہت آگے جانا ہے۔ میں یہ اسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اس کا بس چلتا تو اپنے گھر کسی کو رشتہ لے کر آنے ہی نہیں دیتی کہ نہ کوئی آئے اور نہ ہی اسے پاپا کے سامنے انکار کرنا پڑے۔

دن یونہی پرسکون انداز میں گزر رہے تھے کہ اس سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے عاصم شیرازی

کی والدہ ان کے گھر چلی آئیں۔ عاصم ڈی ایم سی میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے دو سال سینئر تھا۔ کالج کے دنوں میں وہ خواہ مخواہ اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ کبھی اپنے نوٹس اسے لا کر دے دیتا کبھی اپنے لیکچرز اور کبھی کوئی ریفرنس بک۔ تانیہ کی فرینڈز عاصم کے حوالے سے اکثر اسے چھیڑا کرتی تھیں مگر وہ اس چھیڑ چھاڑ کا کوئی نوٹس نہیں لیتی تھی۔ کالج کے زمانے میں تمام ہی لڑکے اس قسم کے افیئرز میں انوالو ہوتے ہی ہیں خود اس نے کبھی بھی عاصم کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر اسے اگنور کر دیا کرتی تھی۔ اب جو اس کا پروپوزل آیا تو وہ بوکھلا گئی۔ اتنے سال بعد وہ اچانک دوبارہ اس کی زندگی میں ہلچل مچانے چلا آیا تھا۔ ورنہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد تانیہ نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پاپا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ عاصم ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ خود بھی سلجھا ہوا، پڑھا لکھا شخص تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید تانیہ نے عاصم ہی کی وجہ سے اس سے پہلے نرگس اور ثمرہ کو انکار کرنے کا کہا تھا۔

پاپا نے اس سے پوچھا تو حسب سابق اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس کے انکار پر بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تو باپ ہونے کے ناطے اس پر زبردستی کر سکتے تھے۔ اپنا فیصلہ اس کے اوپر مسلط کر سکتے تھے۔ مگر ان کی بیٹی عام لوگوں سے مختلف اور بے حد حساس تھی۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ تانیہ کا مختلف ہونا اس سے پہلے ان کے لیے اتنا باعث تکلیف کبھی نہیں بنا تھا۔ ہر لڑکی کے لیے شادی کی ایک مخصوص عمر ہوتی ہے اور وہ عمر گزر جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ان کا دل چاہتا کہ تانیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس کے ساتھ کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ خود اس کی تمام فرینڈز بیاہی گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے قائل کریں۔ ان دنوں وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگے تھے۔

بیٹی کا مستقبل ان کے لیے سوالیہ نشان بنتا جا رہا تھا۔ وہ اسے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ آبگینے کی طرح نازک تھی وہ اس کے احساسات کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر خود کو فکر مند ہونے سے بھی نہیں روک سکتے تھے۔ علی نے پاپا کو اس سے پہلے اتنا فکر مند اور پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پاپا تانیہ کی شادی کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ اس سے پاپا کی پریشانی دیکھی نہ گئی تو وہ تانیہ کے پاس چلا آیا۔

”پری! آپ پاپا کی بات مان کیوں نہیں لیتیں؟ عاصم ایک اچھا انسان ہے اور اس کی فیملی بھی اچھی لگ رہی ہے۔“ علی کی بات پر اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے ایک نظر دیکھا اور لاپروائی سے بولی۔

”تم ابھی بچے ہو اور یہ معاملہ تمہارے بولنے کا ہے بھی نہیں۔ اس لیے کوئی اور بات کرو۔“ اس کی بات پر علی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"I am not a child" آرکیٹیکچر کے فورتھ ایئر میں ہوں میں اور اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہوں کہ پاپا آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“

”ہاں بھئی اب ہمارا علی بڑا ہو گیا ہے۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ ”تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ

میرے لیے تو وہی چھوٹے سے بچے ہی رہو گے۔ جسے میں اپنے ہاتھوں سے نہلاتی تھی اور جو میرے ہاتھ پر سر رکھ کر سویا کرتا تھا۔" اس نے بڑی خوب صورتی سے موضوع ہی بدل دیا تو علی بدمزہ ہو کر وہاں سے کھڑا ہو گیا۔

پھر عاصم کے گھر والوں کو انکار کر دیا گیا اور وہ ایک مرتبہ پھر پرسکون ہو گئی۔ یہ بلا ٹلی تو وہ دوبارہ پاپا اور علی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ علی رات میں ڈرائنگ بورڈ پر شیٹ لگائے ٹی اور سیٹ اسکوائر سنبھالے ڈرائنگ بنانے میں مصروف ہوتا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے چائے یا کافی بنا کر دیا کرتی۔ وہ بہت ذہین اور پڑھاکو تھا۔ آرکیٹیکچر کے پہلے سال سے ہی وہ لگاتار فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لے رہا تھا۔ کبھی اس کے دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے اس کے ساتھ آجاتے تو وہ اس سب کا بھی علی کی طرح خیال رکھتی۔ علی کے تمام دوستوں کی وہ بجو تھی۔ وہ ان سب سے ایسے ملتی جیسے ان سے بیس پچیس سال بڑی ہو۔ ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر انہیں آرٹسٹک انداز میں ڈرائنگ بناتا دیکھتی اور کبھی کبھار اپنے مشوروں سے بھی نوازا کرتی۔

علی کو مغل آرکیٹیکچر پر آٹو کیڈ پر ڈرائنگ بنانے کا پروجیکٹ ملا تو اس نے تابندہ کے مشورے پر مغل آرکیٹیکچر میں سے تاج محل کا انتخاب کیا۔ اس کے باقی کلاس فیلوز نے نسبتاً آسان عمارتوں کا انتخاب کیا تھا اور اسے بھی اس مصیبت میں پھنسنے سے روکا تھا۔ مگر اس نے دوستوں کے مشوروں کو خاطر میں لائے بغیر پاپا سے انڈیا جانے کی بات کی تھی۔ ہر سال ہی وہ، تابندہ اور پاپا کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے ضرور جایا کرتے تھے۔ اس بار علی کے پروجیکٹ کی وجہ سے وہ لوگ انڈیا آگئے۔ ظاہر ہے اس کا بنیادی انٹرسٹ تاج محل میں تھا سو وہ لوگ آگرہ چلے آئے۔ پاپا تو کسی ٹورسٹ کی طرح گھومنے پھرنے میں مصروف تھے مگر وہ علی کی بھرپور مدد کر رہی تھی۔ وہ ہر ہر زاویے سے تاج محل کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اس نے اپنے ویڈیو کیمرے سے تاج محل کی مووی بھی بنالی تاکہ کراچی جا کر اسے ڈرائنگ بناتے ہوئے کوئی دقت نہ ہو۔ تابندہ اسے مختلف مشوروں سے نوازتی رہتی کہ یہاں سے بھی تصویر لو، خالی دروازے کا کلوز اپ لو۔ وہاں دیوار کے قریب سے ایکسپوز کرو۔ وہ وہاں ایک دو آرکیٹیکچر سے بھی ملا تھا اور ان سے تاج محل کے بارے میں ضروری معلومات اکٹھی کی تھیں۔ پاپا ان دونوں کی دیوانگی پر ہنسا کرتے تھے اور اسے چھیڑتے کہ

"ڈاکٹر صاحبہ! نیم حکیم خطرہ جان ہوتا ہے۔ تم ڈاکٹر ہی ٹھیک ہو آرکیٹیکچر میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔" وہ مسکرا دیتی۔ وہاں سے واپس آکر علی نے اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کیا۔

اپنے اس پروجیکٹ کے لیے اس نے دن رات محنت کی۔ سارا سارا دن کمپیوٹر پر بیٹھا ڈرائنگ بناتا رہتا اور اس محنت کا اسے پورا پورا صلہ بھی مل گیا تھا۔ اس کے کام کو سب ہی نے بہت سراہا تھا اس کے دوست، اساتذہ ہر کوئی اسے سراہ رہا تھا۔

اس کے کام کی پورے کالج میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس کے تمام اساتذہ نے اسے مستقبل کا ایک ذہین اور قابل آرکیٹیکچر قرار دیا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی کامیابی تابندہ کو اپنی کامیابی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے علی کی سلامتی اور حفاظت کے لیے دعائیں مانگا کرتی۔ وہ اگر بیمار ہو جاتا تو اسے لگتا کہ شاید علی کو نظر لگ گئی ہے۔ وہ تھا بھی تو اتنا پیارا۔ وہ بالکل پاپا کی جوانی تھا۔ انہیں کی طرح ہینڈسم اور اسمارٹ۔ علی گھر سے کالج کے لیے یا کہیں اور جانے کے لیے نکلنے لگتا تو وہ بالکل ماؤں والے انداز میں دور سے بیٹھے بیٹھے اس پر دعائیں پڑھ کر پھونکا کرتی۔ اس کی ان باتوں پر علی اس کا خوب ریکارڈ لگاتا مگر وہ بالکل بھی پروا نہیں کرتی تھی۔

فائنل ایئر میں اپنے تھیسس کے سلسلے میں کچھ گائیڈنیس اور ریفرنس حاصل کرنے کے لیے علی کا ایک پرائیویٹ فرم میں جانا ہوا۔ وہ ایک آرکیٹیکچرل کنسلٹینسی تھی جس میں سول انجینئرز، آرکیٹیکچر اور پلانرز وغیرہ کام کرتے تھے۔ علی کا وہاں کافی زیادہ آنا جانا ہوا اور پتا نہیں وہاں کے اونر مرتضیٰ ہاشمی کو اس میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی کہ انہوں نے اسے اپنے ہاں جاب آفر کر دی۔ دوران تعلیم ہی جاب وہ بھی اتنی اچھی فرم میں۔ علی تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ پھر بھی اس نے پاپا سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے استفسار پر پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"Go ahead young man" اور یوں اس نے مرتضیٰ ہاشمی کی فرم جوائن کر لی تھی۔ وہاں جوائن کرنے سے علی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا بہترین موقع ملا تھا۔ ابھی تک تو وہ صرف طالب علم تھا اب عملی میدان میں کام کر کے وہ خود کو بہت پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ وہیں جاب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا تھیسس مکمل ہوا تھا۔ اسے مرتضیٰ ہاشمی کے ہاں کام کرتے سات آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔

پچھلے ہفتے ہی اس کا فائنل ایئر کا رزلٹ نکلا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی میدان مار لیا تھا۔ آرکیٹیکچر کی ڈگری وہ بھی فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن اور گولڈ میڈل کے ساتھ، تابندہ کے تو قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اپنی کامیابی کی خوشی میں اس نے آج اپنے دوستوں کو ٹریٹ دی تھی جس میں دیر سے واپس آنے کا وہ بتا کر گیا تھا مگر تابندہ اپنی عادت سے مجبور اس کے انتظار میں جاگتی رہی تھی۔

☆☆☆

مرتضیٰ نے علی کی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک پروجیکٹ اس کے حوالے کیا جو اسے انفرادی کرنا تھا۔ مرتضیٰ کی اس پروجیکٹ میں شرکت صرف ایک ایڈوائزر کی حد تک تھی۔ علی ان دنوں بہت خوش بلکہ پرجوش تھا۔ خود کو ان تمام صلاحیتوں کا اہل ثابت کرنے کے خیال سے جو مرتضیٰ نے اس میں دیکھیں وہ دن رات ایک کر کے محنت کر رہا تھا۔ ان دنوں علی کی زبان پر یا تو اپنے پروجیکٹ کے قصے ہوتے یا مرتضیٰ ہاشمی کے بارے میں کوئی بات۔

اس شام وہ گھر پر اکیلی تھی۔ پاپا کا فون آگیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئیں گے اور علی ابھی تک آفس سے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اکیلی سخت بور ہو رہی تھی۔ علی کے اوپر بھی بہت غصہ آرہا تھا جو ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگا تھا۔ اس وقت علی کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اس نے شکر ادا کیا۔ کم از کم اب وہ بوریت سے تو بچ جائے گی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ وہ لان سے تیز قدموں سے چلتی پورٹیکو کی طرف آگئی۔ علی کی گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی اندر داخل ہوئی۔ وہ حیران نظروں سے اس دوسری گاڑی کو دیکھنے لگی جبکہ علی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اترتا جلدی سے پیچھے والی گاڑی کی طرف

بڑھ گیا تھا جس میں سے ایک انجانی شخصیت برآمد ہوئی تھی۔ بلیک پینٹ، آف وائٹ شرٹ اور ریڈ اور بلیک ٹائی میں ملبوس اس شخص نے اپنے ایک ہاتھ میں بڑی لاپروائی سے کوٹ ڈالا ہوا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑا ہوا تھا۔

علی اس سے کچھ بات کرتا اس طرف گھوما تو نظریں سیدھی تابہ پر پڑی تھیں۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ وہ شخص بھی علی کے ساتھ چلتا ادھر ہی آ گیا تھا۔

''یہ میری بڑی بہن ہیں تابہ۔'' علی نے مرتضٰی کی طرف دیکھتے ہوئے تعارف کرایا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''پری! یہ مرتضٰی ہاشمی ہیں۔'' تابہ نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر سلام کیا تو وہ رواداری سے مسکراتا ہوا جواب دے کر رسمی انداز میں کہنے لگا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اس نے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے۔ تعارف کی رسم انجام پذیر ہوئی تو علی اس سے بولا۔

''پری! میں اور مرتضٰی اسٹڈی میں کمپیوٹر پر کام کریں گے۔ آپ وہیں ہم لوگوں کے لیے چائے بھجوا دیجیے گا۔'' پھر علی اور مرتضٰی اسٹڈی میں بند ہو گئے اور وہ کچن میں آ کر چائے کے لیے لوازمات ٹرالی پر سجانے لگی۔ وہ تو عام مہمانوں کے ساتھ بھی بڑی اچھی میزبان ثابت ہوتی تھی۔ جبکہ یہاں تو علی کے باس تشریف لائے تھے۔

اپنے کسی جونیئر کولیگ کے گھر آ جانا یقیناً کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس نے ٹرالی اچھی طرح بھر کر کریم بابا کے ہاتھ بھجوا دی۔ وہ بے چارے بہت ضعیف ہو گئے تھے اس لیے تابہ اب ان سے صرف اوپر اوپر کے کام کرایا کرتی تھی۔ کھانا وغیرہ وہ خود ہی پکاتی۔

علی کی واپسی سے اسے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ابھی بھی اکیلی بور ہی ہو رہی تھی۔ آٹھ بجے پاپا آ گئے تو اس کی بوریت کا خاتمہ ہوا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ساڑھے تین گھنٹوں سے اسٹڈی میں بند وہ دونوں پتا نہیں کون سا معمہ حل کر رہے تھے۔ پاپا نے اس سے کھانا لگانے کے لیے کہا اور خود اٹھ کر اسٹڈی میں غالباً ان لوگوں کو کھانے کے لیے بلانے چلے گئے تو وہ جلدی جلدی کھانا لگانے لگی۔ علی کھانے پینے کا بہت شوقین تھا اس لیے ان کے ہاں کھانے کی میز پر ہمیشہ ہی انواع و اقسام کی ڈشز پائی جاتی تھیں۔ اس لیے وہ ہرگز پریشان نہ تھی کہ مہمان کی خاطر کس طرح کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دونوں پاپا کے ساتھ باہر آتے نظر آئے۔ تابہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ پاپا شاید اسے زبردستی اصرار کر کے کھانے کے لیے روک رہے تھے اور وہ ان دونوں کے ساتھ چلتا ڈائننگ ٹیبل کے پاس آ گیا تھا۔

کھانے کی میز پر پاپا اور علی اسے مختلف ڈشز آفر کر رہے تھے۔ پاپا اسے شامی کباب کی ڈش پکڑا رہے تھے تو علی بریانی کی ڈش اس کے سامنے رکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''اتنی مزے دار بریانی آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھائی ہوگی۔ پری سے زیادہ اچھی بریانی کوئی اور نہیں پکا سکتا۔'' اس نے خاموشی سے بریانی کی ڈش لے لی تھی اور تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں ڈال لیے تھے۔ پاپا کے اصرار پر شامی کباب بھی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

وہ خود خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ انجان لوگوں سے ایک دم بے تکلف ہو جانا اس کی فطرت ںشامل ہی نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور تابہ سب کے لیے کافی ںنے کچن میں آ گئی۔ ٹرے اٹھائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اندر بڑے خوشگوار ماحول میں ت وشنید جاری تھی۔ وہ پاپا کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ تابہ اس کی بات کے ختم ہونے کا ظار کر رہی تھی کہ۔

بات ختم کرے تو وہ اس سے چینی کا پوچھے۔ اپنی بات ایک لمحے کے لیے روک کر وہ اس کی ف متوجہ ہوا اور بولا ''ڈیڑھ چمچہ'' اور دوبارہ سے اپنی گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے ٹوٹا ۔ کیا اس کی دو کے بجائے چار آنکھیں ہیں۔ تابہ نے سوچا تھا۔ بظاہر پاپا کی طرف متوجہ ہونے کے جود اس نے اسے کس طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ حیران ہوتی کپ میں چینی ملا کر اس کے پاس کپ لے ئی جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ پاپا اور علی کو بھی کافی دے کر وہ خود بھی اخلاق نبھانے کی طرد وہیں بیٹھ گئی۔ علی پاپا سے کہہ رہا تھا۔

''یہ تو آ بھی نہیں رہے تھے میں زبردستی لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں نے کمپیوٹر پر اپنے وجیکٹ کا کچھ کام کیا ہے جس پر میں ان کی رائے لینا چاہتا ہوں تو کہنے لگے کہ فلاپی پر کام کر کے لے ڈ میں یہاں دیکھ لوں گا مگر میں اڑ گیا کہ آپ کو ضرور میرے ساتھ چلنا ہے اور وہیں جا کر میرا کام دیکھنا ہے۔'' علی کی باتوں پر وہ خاموشی سے مسکراتا ہوا کافی کے سپ لے رہا تھا۔ اس کی اس بات پر پاپا نے رتضٰی سے کہا تھا۔

''یہ تو علی نے بہت اچھا کیا کہ آپ کو لے آیا۔ میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ علی کے منہ سے صبح شام آپ کا نام سن سن کر مجھے آپ سے ملنے کا اچھا خاصا شوق ہو گیا تھا۔'' پاپا کی بات پر وہ ایک دم بولا تھا۔

''میرے آنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ علی آپ کا ذکر اتنا کرتا ہے کہ میں سخت قسم کے شوق میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اتنے ذہین اور قابل شخص سے اب تک میں کیوں نہیں ملا۔''

''اس جوابی تعریف کا بے حد شکریہ۔'' پاپا نے زندہ دلی سے قہقہہ لگایا تو وہ بھی ہنس پڑا تھا۔ کافی کے سپ لیتی وہ خاموشی سے ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ پاپا سے کہہ رہا تھا۔

''علی میں مجھے بائیس تیس سالہ مرتضٰی کی جھلک نظر آئی تھی اسی لیے جب یہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے جاب آفر کی تھی۔ اس کی عمر میں، میں بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اتنا ہی کمپیٹینٹ اور ڈائنامک۔ اس میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ یہ زندگی میں بہت آگے جائے گا۔ اس کے اندر پوٹینشل ہے، ٹیلنٹ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بہت محنتی ہے۔ ایسے لوگوں کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ میں نے اپنی فرم میں سب ینگ اور فریش لوگ رکھے ہیں۔ اگر ہر کوئی تجربہ کار کی ڈیمانڈ کرے گا تو فریش لوگ کیا کریں گے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جتنے قابل اور محنتی فریش گریجویٹس ہوتے ہیں اتنا کوئی تجربہ کار آدمی نہیں ہو سکتا۔ نئے نئے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ نئے آئیڈیاز ذہن میں ہوتے ہیں۔ نئی سوچ اور زیادہ ازجیک۔ میرا یہ تجربہ تو کم از کم بہت کامیاب رہا ہے۔'' وہ اس کے علی کی تعریفیں کر رہا تھا۔

تابہ کو اچانک ہی اس بندے میں بہت زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ جو اتنی دیر سے بیٹھی لاپروائی

سے یہاں وہاں نظریں دوڑا رہی تھی اب اس پر نظریں جمائے بغور اسے بولتا سن رہی تھی۔ اسے وہ بندہ ایک دم بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ پاپا نے اس کے خیالات کو سراہا تھا۔ انہیں بھی وہ یقیناً بہت اچھا لگا تھا ورنہ وہ ہر کسی سے اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کیا کرتے تھے۔ علی اور مرتضٰی اپنے پروفیشن کے حوالے سے پاپا سے باتیں کر رہے تھے۔

''پری! آپ بھی تو کچھ بولیں۔'' علی اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ علی کی بات پر مرتضٰی نے بھی ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں آپ لوگوں کو سن رہی ہوں۔'' وہ علی سے بولی تو اس پر سے نظریں ہٹا کر مرتضٰی سے کہنے لگا۔

''پتا ہے مرتضٰی! پری نے بھی پاپا کی طرح میڈیسن پڑھی ہے۔'' مرتضٰی نے ایک نظر علی کو دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''پھر تو آپ انکل ہی کے ہاسپٹل میں جاب کر رہی ہوں گی۔'' جواب میں اس نے گردن ہلا دی تھی۔ مزید پانچ دس منٹ بیٹھ کر مرتضٰی ان لوگوں سے اجازت طلب کرتا جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پاپا اور علی اسے باہر تک چھوڑنے گئے۔

کافی کے کپ کچن میں رکھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے وہ نماز کے لیے دوپٹہ اوڑھ رہی تھی کہ علی اندر آ گیا اور اس سے بولا۔

''پری آپ کو مرتضٰی کیسے لگے؟''

''بہت اچھے لگے۔ جیسی تم ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں اور یقیناً وہ بہت Perspicacious بھی ہیں تبھی تو انہوں نے تمہارے اندر چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو کھوج نکالا۔'' ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس بندے کے بارے میں اچھی رائے قائم کی تھی اس لیے بڑی سچائی سے اس کی تعریف کر رہی تھی۔ اس کے جواب نے علی کو بہت خوش کر دیا تھا وہ مسکراتا ہوا صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''میں تو مرتضٰی کو آئیڈیلائز کرتا ہوں۔ وہ اپنے پروفیشن سے عشق کرتے ہیں میں بالکل ان جیسا بننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بھی ہمارے کالج ہی سے گریجویشن کی تھی پھر وہیں سے ماسٹرز کیا ہے۔ ''اربن ڈیزائن'' میں۔ اس کے بعد وہ مزید پڑھائی کے لیے امریکہ چلے گئے وہاں پڑھائی کے دوران ہی انہیں اتنی اچھی اچھی جگہوں سے جاب آفر ہوئیں مگر وہ ان سب کو ٹھکرا کر پاکستان واپس آ گئے۔ وہ صرف حب الوطنی کا راگ نہیں الاپتے بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے ملک سے محبت ہے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی فرم کا آغاز کیا اور صرف پانچ چھ سال میں ہی ان کی فرم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔'' علی کو باتوں کے موڈ میں دیکھ کر وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور مسکراتے ہوئے ''مرتضٰی نامہ'' سن رہی تھی۔

''ان کی فرم تو میں نے صرف ایکسپیرینس کے لیے جوائن کی ہے میرا ارادہ تو اپنی ذاتی کنسلٹینسی کھولنے کا ہے۔'' وہ اپنے مستقبل کے ارادوں کا اظہار کر رہا تھا۔

''لیکن اس سے پہلے تمہیں ماسٹرز کر لینا چاہیے۔'' تابہ نے اپنی رائے ظاہر کی تو وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

''ہاں ایک دو سال مرتضٰی کی فرم میں کام کر کے پھر میں پہلے ماسٹرز کرنے اسٹیٹس جاؤں گا اس کے بعد اپنی فرم اسٹیبلش کروں گا۔'' اپنی بات ختم کر کے اچانک وہ مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

''وہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مرتضٰی پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے جو وہ تمہارا اتنا Admirer بن گیا ہے۔ وہ تو اچھے اچھوں کے کام میں عیب نکالتا ہے۔ لیکن وہ مجھے بہت امپورٹنس دیتے ہیں۔ میرے مشوروں کو بہت دھیان سے سنتے ہیں اور میرے سینئر کولیگز پروفیشنل جیلسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔'' علی کی باتیں وہ بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اسے اپنے ذہین اور قابل بھائی پر فخر ہو رہا تھا اور وہ شخص بھی بہت اچھا لگ رہا تھا جو اسے اہمیت دے رہا تھا۔ یقیناً وہ خود بہت غیر معمولی ذہانت کا حامل شخص ہو گا جس نے علی کے اندر چھپے ہنر کو تلاش کر لیا تھا۔

علی نے اپنا پہلا پروجیکٹ کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا تھا۔ آج کل وہ ''مکرم بلڈرز'' کے لیے فلیٹ اور شاپنگ مال کی ڈیزائننگ میں مرتضٰی کی معاونت کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور آرکیٹیکٹ بھی اس پروجیکٹ میں مرتضٰی کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔

وہ کچن میں تھی جب فون کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی وہ جلدی سے لاؤنج میں آ گئی اور فون ریسیو کیا۔ اس کے سلام کے جواب میں دوسری طرف سے مرتضٰی بولا۔

''وعلیکم السلام، میں مرتضٰی بات کر رہا ہوں۔'' اپنا نام بتا کر وہ ایک سیکنڈ کے لیے خاموش ہو کر سوچنے لگا کہ علی کی بہن کا نام کیا ہے مگر ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود نام یاد نہ آیا تو بولا۔

''آپ علی کی سسٹر بات کر رہی ہیں؟''

''جی!'' وہ اس کے فون کرنے پر حیران ہوتی ہوئی مزید بولی۔ ''علی تو ابھی تک آفس سے واپس نہیں آیا۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آفس میں موجود نہیں ہے؟'' اسے اچانک ہی عجیب عجیب وہم ستانے لگے۔ اپنے اندر ہوتی دھکڑ پکڑ کو کنٹرول کرتی وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

''جی وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ ہم لوگوں کا آج لیٹ نائٹ آفس میں رک کر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی کو میں نے کسی کام سے باہر بھیجا ہے اور اسی کے کہنے پر آپ کو میسج دینے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ رات میں گھر نہیں آئے گا۔'' اس کی بات پر تابہ کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا۔

مرتضٰی سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اس لیے ''اچھا'' اور ''تھینک یو'' کہہ کر فون بند کر دیا مگر دل میں پکا ارادہ کر چکی تھی کہ علی کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنی ہے۔ ایسا بھی کیا کام کا جنون کہ بندہ اپنا آرام سکون اور نیند سب قربان کر دے۔ ساری رات جلتی کڑھتی وہ علی کو دل ہی دل میں خوب برا بھلا کہہ چکی تھی۔ صبح اس نے ہاسپٹل جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گھر میں رک کر علی کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ پاپا علی کی کھنچائی کا سوچ کر ہنستے ہوئے ہاسپٹل چلے گئے تھے۔ دس بجے کے قریب چوکیدار کے گیٹ کھولنے کی آواز سنائی دی تو وہ غصے کے مارے اٹھ کر باہر بھی نہیں گئی اور وہیں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے غصے کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتے مرتضٰی اور علی کو دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ علی کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے وہ آہستہ قدموں سے چلتا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ علی کا لنگڑا کر چلنا وہ بھی مرتضٰی کے سہارے، اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گویا دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔

''علی کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہونا؟'' وہ ایک دم آگے بڑھ کر علی کی طرف آئی تھی اور اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے کر ہراساں نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔

''یہ بالکل ٹھیک ہے۔ معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ آپ اسے بستر پر لیٹنے دیں پھر آرام سے بات کر لیجیے گا۔'' اس کے پریشان چہرے پر نظریں جمائے مرتضٰی نے رسانیت سے کہا تو وہ ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟'' وہ سخت غصے میں نظر آ رہی تھی۔ مرتضٰی نے گردن ہلا دی تھی اور بولا تھا۔

''میں کیا کرتا۔ علی نے مجھے منع کیا تھا کہ اصل بات مت بتانا میری بہن پریشان ہو جائے گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ تمام تر مروت اور اخلاق بالائے طاق رکھ کر اس پر الٹ پڑی۔

''اب تو یقیناً مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اس کا کیا ہے۔ یہ تو پاگل ہے آپ کو تو کم از کم صحیح بات بتانی چاہیے تھی۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا پھر۔۔۔'' آگے کی بات اس سے کی ہی نہیں گئی کہ آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے رونے پر وہ دونوں ہی بوکھلا گئے تھے۔

''پری! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھیں آپ کے سامنے تو ہوں۔ بہت ہی معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' علی نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر غرائی۔

''بات مت کرو مجھ سے۔'' علی نے بے بسی سے ایک نظر اسے اور ایک نظر مرتضٰی کو دیکھا تو وہ علی سے بولا۔

''علی تمہارا بیڈ روم کہاں ہے۔ آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔'' یقیناً اس رونے دھونے کے مظاہرے میں علی بے چارے پر بری گزر رہی تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی جبکہ بہن صاحبہ یہیں کھڑے کھڑے تمام حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھیں۔ علی کی نشاندہی پر وہ اسے لے آگے بڑھ گیا تو وہ بھی ان دونوں کے پیچھے چلتی علی کے کمرے میں آ گئی۔ مرتضٰی نے بستر پر لیٹنے میں اس کی مدد کی۔ علی کے چہرے پر موجود تکلیف کے آثار بتا رہے تھے کہ چلنے پھرنے میں اسے کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

''ایکسیڈنٹ ہوا کیسے؟'' وہ دونوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی تو علی اس کی تسلی کی خاطر تفصیل سے بتانے لگا۔

''میں اور مرتضٰی سائٹ سے واپس آ رہے تھے۔ گاڑی میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک اور گاڑی آ گئی۔۔۔ اور گاڑی سے ٹکرا گئی۔ ہم دونوں پتا نہیں کیسے معجزانہ طور پر بچ گئے۔'' وہ علی کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی جبکہ مرتضٰی سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ خود ڈاکٹر ہیں۔ اچھی طرح چیک کر لیں۔ کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے۔ کوئی اور Complication بھی نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں اور پیروں پر چوٹ لگی ہے۔ تھوڑا بہت ریسٹ کرے گا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' مرتضٰی نے علی کی جان چھڑانے کے لیے خود ہی جواب دے دیا۔ بڑا ٹھیک اندازہ تھا علی کا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا اگر جو اسے رات فون پر ایکسیڈنٹ کا بتا

[تو] یہ تو پتا نہیں کیا کر گزرتی۔ وہ اس کے ڈاکٹر ہونے پر حیران تھا۔ ایک ڈاکٹر اور اتنے کمزور دل کی [۔] اس کے جواب پر تائبہ نے بغور اس کی طرف دیکھا اور فکرمندی سے بولی۔

''آپ تو ٹھیک ہیں نا۔ آپ کو تو کوئی چوٹ نہیں لگی؟'' اس کے بات کرنے کا انداز بالکل ویسا [ت]ھا جیسے وہ علی کے دوستوں کے ساتھ اختیار کیا کرتی تھی۔ بڑی آپا وٴں والا۔

مرتضٰی کو آج وہ اس دن سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ وہ اس کی فکرمندی پر مسکراتا ہوا بولا۔

''الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معمولی سی خراشوں کے علاوہ اور کوئی چوٹ نہیں لگی۔'' پھر وہ علی [سے] کہنے لگا۔ ''اچھا علی میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔'' وہ جانے کے لیے کھڑا ہونے لگا تو وہ فوراً اٹھتے [ہو]ئے بولی۔

''آپ بیٹھیے پلیز۔ میں کافی لاتی ہوں۔'' اس کی بات پر علی بھی اصرار کرنے لگا۔

''ہاں پری! ان کو ایسے مت جانے دیجیے گا۔ ساری رات یہ میرے ساتھ ہاسپٹل میں خوار [ہوتے رہ]ے ہیں۔ خالی کافی نہیں بلکہ بہت اچھا سا ناشتا لائیں۔'' ان دونوں کے اصرار پر وہ ہنس پڑا اور

''ناشتا بھی کروں گا اور کافی بھی پیوں گا مگر آج نہیں پھر کبھی۔ ابھی مجھے ایک بہت ضروری [میٹنگ] میں شرکت کرنی ہے اور اس سے پہلے گھر جا کر اپنا حلیہ درست کرنا ہے۔'' وہ اپنی سلوٹ زدہ بلیو [شرٹ] کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ان دونوں کو خدا حافظ کہتا وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ بھی اسے گیٹ [تک] چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ ہی باہر آ گئی۔

''آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے علی کے لیے اتنی تکلیف اٹھائی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کا [شکریہ] کن الفاظ میں ادا کروں۔'' اس نے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو بڑے غور سے دیکھا جو بڑی [ممنونیت] اور تشکر آمیز انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''حالانکہ آپ کو تو مجھ سے ناراض ہونا چاہیے کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔'' اس کی بات [پر اسے] اپنا کچھ دیر پہلے کا رویہ یاد آیا تو وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''آئم سوری۔ اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں اس کے لیے ایکسکیوز کرتی ہوں۔'' [وہ ایک]دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ تائبہ کو اس کے قہقہے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسے خدا حافظ کہتا وہ [گ]اڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

پورے چھ دن تک اس نے علی کے کہیں بھی آنے جانے پر سخت پابندی لگائے رکھی۔ اسے بستر پر [ڈالے] وہ اس کی خدمتیں کرنے میں مصروف رہی۔ خوب اچھی طرح اسے زبردستی فروٹ کھلاتی۔ دودھ [پلاتی] اور وہ بے چارہ احتجاج کرتا رہ جاتا۔ اس موقع پر پاپا بھی تائبہ کے حمایتی بن گئے تھے اور اس کے [س]اتھ خود بھی اسے کھانے پلانے اور آرام کرانے میں مصروف تھے۔

اس کے تمام کولیگز گھر پر آ کر اس کی عیادت کر کے گئے تھے۔ خود مرتضٰی اس دن کے بعد سے [دوبارہ] نہیں آیا تھا۔ البتہ اس نے فون پر ایک دو مرتبہ اس کی خیریت پوچھی تھی۔ ساتویں دن کہیں جا کر [اسے بستر] چھوڑنے اور آفس جانے کی اجازت ملی تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ تائبہ نے اسے آفس [جانے] کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ وہ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد سیدھا گھر آئے گا اور بلاوجہ

کے کاموں میں لگ کر خود کو ہرگز بھی ہلکان نہیں کرے گا۔ علی کے وعدہ کرنے کے باوجود بھی اسے اعتباری تھی اس لیے اس کی گاڑی میں دفتر نہیں جانے دیا بلکہ جب خود ہاسپٹل کے لیے نکل رہی تو پہلے ڈرائیور نے علی کو اس کے آفس چھوڑا اور پھر اسے ہاسپٹل۔ واپسی کے لیے بھی اس نے علی سے کہا کہ ڈرائیور کے ساتھ آ کر شام میں اسے پک کر لے گی اور علی کو ناچار اس کی تمام شرائط ماننی پڑی تھیں۔

شام کو ٹھیک پانچ بجے وہ علی کے آفس پہنچ گئی تھی۔ ریسپشن پر بیٹھی اس گڈ لکنگ لڑکی سے وہ علی بابت دریافت کر رہی تھی کہ پیچھے سے مرتضٰی کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھ چلتے کسی آدمی کے باتیں کرتا ہوا وہاں سے جا رہا تھا۔ باتیں کرتے اچانک اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً رک گیا او کی طرف آتا ہوا بولا۔ ''السلام علیکم'' اس نے سلام کا جواب دیا تو وہ اس کی یہاں موجودگی پر ظاہر کرتا ہوا بولا۔

''آپ یہاں؟ خیریت تو ہے نا؟''

''جی خیریت ہے۔ مجھے علی سے کچھ کام تھا۔'' اس نے کام کی نوعیت بتانے سے پرہیز کیا۔

''علی تو خاور یزدانی صاحب کے ساتھ ان کے گھر کے لیے ٹائلز پسند کرنے گیا ہے۔'' سے دو تین قدم پیچھے کھڑے اس دوسرے بندے نے علی کی غیر موجودگی کی اطلاع دی تو اس کا مو طرح آف ہو گیا۔

''اچھا علی ان کے ساتھ گیا ہے۔ ویسے ان کا کام کتنا رہ گیا ہے؟'' مرتضٰی کو اس ذکر سے ایک بات یاد آئی تو وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''علی تو پریشان ہو گیا ہے۔ خاور صاحب کی پسند ہی اتنی مشکل ہے۔ ان کے گھر کا انٹیریر مشکل ثابت ہو رہا ہے بے چارے کے لیے۔'' اس دوسرے بندے نے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔ تا دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔

''علی ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ آپ آیئے پلیز۔'' مرتضٰی نے غالباً اسے اپنے کمرے چلنے کی آفر کی تو وہ انکار کرتے کرتے رہ گئی۔ اب یہاں تک آ گئی تھی تو اس طرح چلے جانا اسے با محسوس ہوا۔ اس نے قدم بڑھائے تو مرتضٰی جو اس کے انتظار میں کھڑا تھا وہ بھی اس کے ساتھ چ وہ دوسرا بندہ کسی اور کمرے میں گھس گیا تھا۔ اس کا پورا آفس ہی بہت شاندار تھا۔ وہاں کا زبردست تھا اور اگر یہاں کا انٹیریر اچھا نہیں ہوتا تو پھر کہاں کا ہوتا۔ آخر یہ ایک آرکیٹیکچر تھی۔ اگر یہاں کا انٹیریر اچھا نہیں ہوگا تو کلائنٹس تو پہلی دفعہ کے بعد دوبارہ کبھی آئیں گے بھی وہ وہاں کی سجاوٹ کو سراہتی اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئی تو داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

کمرے میں موجود فرنیچر، ان ڈور پلانٹس، پردے یہاں تک کہ ٹیبل پر رکھا کلینڈر بھی اتنی مناسبت سے اور اچھی طرح رکھا ہوا تھا کہ کہے بغیر بھی پتا چل جائے کہ یہ چیف ایگزیکٹو اور ڈائریکٹر کا کمرا ہے۔ اسے بیٹھنے کی آفر کرتا وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی او

''اپنے آفس کا سارا انٹیریر میں نے خود کیا ہے۔ یہاں تک کہ سارا فرنیچر بھی میں ڈیزائن کیا ہے۔'' وہ اس کے منہ سے یہ بات سن کر دھک سے رہ گئی۔ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ

انٹیریر کے بارے میں سوچ رہی ہے یا وہ یونہی بات برائے بات کے لیے یہ بات کہہ گیا تھا۔ تابیہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی ذہین شخص تھا اور اسے اپنے تاثرات دوسروں سے چھپانے بھی آتے تھے۔ اس لیے تابیہ کی طرف دیکھنے کے باوجود بھی کوئی اندازہ نہیں لگا پائی۔

''کیا لیں گی آپ؟ چائے، کافی یا کولڈ ڈرنک؟'' وہ انٹرکام اٹھائے اس سے پوچھنے لگا تو اس فوراً ہی کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز تکلف مت کریں۔'' وہ یہاں چائے کافی پینے تو نہیں آئی تھی۔ اسے تابیہ بدتمیزی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

''پھر بھی کچھ تو۔ آخر آپ پہلی مرتبہ ہمارے آفس آئی ہیں۔'' اس نے دوبارہ اصرار کیا تو اس مجبوراً چائے کے لیے کہہ دیا۔ وہ انٹرکام پر چائے لانے کے لیے کہہ کر فارغ ہوا تو اس کی فون کال آ وہ فون پر شاید اپنے کسی کلائنٹ سے بات کر رہا تھا اور تابیہ اس کی میز کے پیچھے بڑی خوب صورتی سے رکھے مختلف بلڈنگز کے ماڈلز دیکھنے لگی تھی۔

مرتضٰی نے باتیں کرتے کرتے بڑے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس کسی بھی غیر ضروری آرائش اور سجاوٹ کے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے نام پر شاید صرف لپ اسٹک ہی لگی ہوئی تھی۔ اپنے کمر تک آتے لائٹ براؤن بالوں کی سیدھی مانگ کے ساتھ چوٹی باندھے وہ آج کل کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے بننے سنورنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ اسے کمرے میں موجود اس شاندار اور ہینڈسم بندے سے زیادہ وہ ماڈلز قابل توجہ محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر گولڈن فریم کا نازک سا چشمہ لگائے وہ بڑے انہماک سے وہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اسی وقت چپڑاسی نے چائے لا کر رکھی اور چینی ملا کر ان دونوں کے آگے کپ رکھتا واپس چلا گیا۔

مرتضٰی نے فون بند کر کے اس سے کہا۔ ''آپ چائے لیں۔'' اس نے خاموشی سے کپ اٹھا لیا اور چائے پینے لگی۔ ''آپ نے صرف ایم بی بی ایس کیا ہے یا کسی خاص فیلڈ میں اسپیشلائزیشن بھی کی ہے؟'' مرتضٰی کے سوال پر وہ مسکرا دی اور بولی۔

''صرف ایم بی بی ایس کیا ہے۔ ویسے آپ کسی میڈیکل کے اسٹوڈنٹ سے پوچھیں تو اسے وہ سال پانچ صدیوں کے برابر محسوس ہوتے ہیں اور ان کے لیے ''صرف'' کا لفظ بہت بڑی زیادتی ہے۔'' اس کی بات کو مرتضٰی نے بہت انجوائے کیا تھا اس لیے ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھیں۔'' وہ بڑی فرصت سے بیٹھا اس سے بات چیت کو انجوائے کر رہا تھا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ دستک دے کر علی اندر آ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی تابیہ کو صبح کی بات یاد آ گئی جو وہ کام میں لگ کر بھول چکا تھا۔ اس لیے ایک دم گڑبڑا گیا۔ اسے دیکھ کر وہ فوراً اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی اور اس سے بولی۔

''کہاں رہ گئے تھے میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔'' پھر اس کے جواب دینے سے پہلے کہنے لگی۔

''میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' علی نے بڑی فرماں برداری سے گردن ہلا دی تو وہ

بیگ کندھے پر ڈالتی مرتضٰی کی سمت مڑی۔
''اچھا مرتضٰی صاحب، خدا حافظ! آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ اس کی بات
اپنی سیٹ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔
''میری مجبوری ہے کہ مجھے رسمی جملے بولنے نہیں آتے۔ اس لیے میری طرف سے صرف
حافظ پر اکتفا کیجیے۔'' وہ اپنی ذہانت سے بھرپور آنکھیں اس پر جمائے مسکرا کر بولا تو وہ ایک نظر اس
ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

اگلے روز آفس سے واپس آکر کچھ دیر ریسٹ کرنے کے بعد علی کہیں جانے کی تیاری کرنے
وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ''ابھی تو آفس سے آئے ہو۔ اب پھر کہاں جانا ہے؟''
''مجھے مرتضٰی نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ وہیں کی تیاری ہے۔'' وہ بالوں میں برش کرتا ہوا
وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔
''ڈنر! کس خوشی میں؟''
''خوشی ووشی تو مجھے نہیں پتا۔ انہوں نے کہا آج کا کھانا میرے ساتھ بزاہٹ میں کھاؤ اور
نے ان کی دعوت قبول کر لی۔'' وہ لاپروائی سے جواب دیتے پرفیوم اسپرے کرنے لگا تو وہ پرفیوم کی
شیشی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔
''آخر بات کیا ہے؟'' یہ مرتضٰی ہاشم تم پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہیں۔ کل میرے
ساتھ بھی بہت وی آئی پی سلوک کیا تھا۔ پتا کرو کہیں ان کی کوئی بہن وہن تو نہیں ہے۔ جس کے لیے
تمہیں ہموار کر رہے ہیں۔'' علی اس کے شک وشبے پر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔
''پری! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ ایسا ہی تو شہزادہ گلفام ہوں نا میں۔''
''ارے تمہیں کچھ نہیں پتا، دنیا میں کیسے کیسے چالباز لوگ پڑے ہیں۔ بہر حال تم محتاط رہو تو بہتر
ہے۔'' اس کی بات پر علی کو شرارت سوجھی تو سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔
''فرض کریں ایسا ہے بھی تو اس میں آخر برائی کیا ہے۔ مرتضٰی کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے
ان کی بہن بھی یقیناً بہت خوب صورت ہوگی۔'' وہ علی کی شرارت پر سچ مچ چڑ گئی اور اسے گھورنے لگی
ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔
''سچ کہہ رہا ہوں۔ مرتضٰی کے بارے میں ہمارے ہاں ایک آرکیٹیکٹ ہے شیریں۔ اس
کمنٹس دیے ہیں کہ انہیں بلڈنگز اور گھر وغیرہ ڈیزائن کرنے کے بجائے کم سے کم ماڈلنگ تو ضرور
ہی دینی چاہیے۔ بینسن اینڈ ہیجز یا جیلٹ کے ایڈورٹائزمنٹ کے لیے وہ بڑے موزوں
ویسے یہ کمنٹس ان کی غیر موجودگی میں دیے گئے تھے۔ ان کے سامنے کسی کی اس قسم کی بات کرنے کی
مجال نہیں ہے۔'' علی کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھی۔ پھر علی چلا گیا تو وہ لاؤنج میں پاپا کے ساتھ
اور ٹی وی دیکھنے لگی۔ علی کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہوئی تھی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ اور پاپا آرام سے بیٹھے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے جب علی
ٹی پر کسی پاپ گانے کی دھن بجاتا اندر داخل ہوا۔
''کیوں بھئی صاحبزادے! آپ کا ڈنر کیسا رہا؟'' پاپا نے علی سے پوچھا تو وہ پری کے برابر میں
ٹھتا ہوا بولا۔
''ایک دم فرسٹ کلاس۔ مرتضٰی کی کمپنی اتنی اچھی ہوتی ہے کہ بوریت کا سوال ہی نہیں ہے۔''
''کیا ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟'' وہ علی کو ایک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر کچھ چڑ کر بولی۔
''آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں اس لیے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے تابہ کی تعریف کی
تا۔
''ان لان کے کپڑوں اور دھلے ہوئے منہ کے ساتھ میں صرف تمہیں ہی خوب صورت لگ سکتی
ں۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی تو علی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔
ہو سکتا ہے اسی حلیے میں آپ کسی اور کو بھی خوب صورت لگ جائیں۔ آفٹر آل امید پر دنیا قائم
ہے۔''
''پاپا دیکھیں اس علی کے بچے کو۔'' وہ علی کی بکواس پر پاپا سے شکایت کرنے لگی تو وہ اسے
ارتے ہوئے کہنے لگے۔
''بیٹا وہ مذاق کر رہا ہے۔ تم کیوں ناراض ہوتی ہو۔'' علی ابھی بھی چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ
ئے بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

''پری خوش ہو جائیں۔ مرتضٰی کی بہن کی انگیجمنٹ ہو رہی ہے۔ اب آپ ان بے چارے کی
نہ پر شک نہیں کر سکیں گی۔'' علی ہاتھ میں دعوتی کارڈ پکڑے اس کے پاس کچن میں آکر بولا تو وہ
Donu فرائی کرتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولی۔
''کیا پتا کوئی اور بہن بھی ہو۔'' وہ تابہ کی شرارت سمجھ کر خود بھی شرارتی انداز میں بولا۔
''میرا خیال ہے اس سسپنس کا خاتمہ انگیجمنٹ والے دن ہو جائے گا۔ پتا چل جائے گا کہ
ا بہنیں ہیں پھر آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ انگیجمنٹ میں۔
''میں کیا کروں گی جا کر۔ نہ میں کسی کو جانتی ہوں نہ کوئی میرا ان سے تعلق۔ تم چلے جانا۔'' اس
صاف انکار کر دیا۔ اس کے جواب پر علی کا منہ بن گیا تھا۔ مگر وہ اپنے اصرار سے باز نہ آیا تھا۔ شام
دوبارہ اس سے چلنے کے بارے میں پوچھنے لگا تو وہ بری طرح چڑ گئی۔
''علی! مجھے اس طرح انجانے لوگوں میں جا کر بالکل مزا نہیں آتا۔''
''انہوں نے اتنی محبت اور خلوص سے ود فیملی بلایا ہے اور آپ نخرے کر رہی ہیں۔'' پاپا خاموشی
دونوں بہن بھائی کی نوک جھونک سن رہے تھے۔ علی کی بات پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی

''انہوں نے اخلاقاً سب کو انوائٹ کر لیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب کے سب اٹھ کر پہنچ جائیں اور ایسے تو ہمارے گھر کتنے انویٹیشنز آتے ہیں جہاں سب کو بلایا جاتا ہے مگر ہم سب تو نہیں چل دیتے۔''

''اور لوگوں میں اور مرتضیٰ بھائی میں بہت فرق ہے۔'' علی نے خفگی بھرے انداز میں کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

''مرتضیٰ بھائی؟ یہ مرتضیٰ تمہارے بھائی کب سے ہو گئے؟''

''میری ان سے بہت کلوز فرینڈ شپ ہو گئی ہے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے اس بات کی اجازت دی ہے کہ میں انہیں بھائی کہہ سکتا ہوں۔ آفٹر آل وہ مجھ سے اتنے بڑے ہیں۔ پروفیشنل لیول پر تو بھائی یا انکل کہنا اچھا نہیں لگتا مگر جہاں دوستی ہو وہاں تو اچھا لگتا ہے۔ پلیز پری چلیں نا۔'' علی نے اپنی بات ختم کر کے وہی دوبارہ مرغے کی ایک ٹانگ والا رویہ اپنایا تو پاپا بھی اسے سمجھانے لگے کہ جانے میں کوئی حرج نہیں۔ خود پاپا کو کسی سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ اس لیے ان کا جانا تو ناممکن تھا۔ علی کی ناراضگی اور پاپا کے اصرار پر آخر کار وہ آمادہ ہو ہی گئی۔

اگلے روز علی لنچ ٹائم میں اسے لینے ہاسپٹل پہنچ گیا وہ حیران ہو کر اس کے آنے کی وجہ دریافت کرنے لگی۔ ''بس آپ سے ایک کام تھا اسی لیے آفس سے جلدی اٹھ گیا۔ چلیں جلدی کریں۔'' اس نے جلدی جلدی کا ایسا شور مچایا کہ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنا اسٹیتھسکوپ اور اوور آل ہاتھوں میں لیے اس کے پیچھے بھاگتی دوڑتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ علی نے گاڑی گھر پر لا کر روکی تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''اب بتا بھی چکو مسئلہ کیا ہے؟''

''آپ اندر تو آئیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔'' وہ لاپروائی سے جواب دیتا آگے بڑھ گیا۔ اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تابیہ بھی وہیں اس کے پیچھے چلی آئی۔ اندر گھس کر وہ اس سے کہنے لگا۔

''اپنی وارڈروب کھولیں اور آپ کے پاس جتنے اچھے ڈریسز ہیں وہ سب مجھے دکھائیں۔'' وہ علی کے حاکمیہ انداز پر چڑ گئی۔

''کیوں تمہیں میرے کپڑوں سے کیا کام ہے؟''

''مجھے یہ کام ہے کہ آج رات میں جس فنکشن میں ہمیں جانا ہے وہاں میرے بہت سارے کولیگز اور دیگر جاننے والے بھی مدعو ہیں اور میں ان سے یہ تعارف تو ہرگز نہیں کروا سکتا کہ یہ جو بڑی بی ٹائپ ڈل سے کپڑوں میں ملبوس خاتون کھڑی ہیں یہ میری بہن ہیں۔ لہٰذا آپ کے کپڑوں کا انتخاب میں کروں گا۔'' علی نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کی وارڈروب کھول لی اور ایک ایک کر کے ہینگ ہوئے تمام ڈریسز نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے کھڑی علی کی تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر تمام کپڑوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے بڑی مایوسی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ یہ کسی ساٹھ ستر سالہ خاتون کی وارڈروب ہے۔ کوئی ایک بھی جوڑا ایسا نہیں جو آپ کی ایج کے لحاظ سے مناسبت رکھتا ہو۔''

''ٹھیک ہے تو میں نہیں جاتی۔ جب مجھے لے جانے سے تمہاری انسلٹ ہوتی ہے تو مجھے بھی نے کا کوئی شوق نہیں۔'' وہ برا مان کر بولی تو علی نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے دوبارہ پورٹیکو میں آ کر گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ھلا گئی۔

''علی آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ اب کہاں جا رہے ہو؟'' وہ کوئی جواب دیے بنا اسے اپنی ر والی سیٹ پر بٹھا کر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ علی کے پراسرار از پر زچ سی ہو گئی تھی۔

گاڑی مین زمزمہ پر لا کر ایک بوتیک کے سامنے روک کر علی گاڑی سے اترا تو وہ بھی اتر آئی۔ علی کرنا چاہ رہا تھا اب اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا۔ مگر وہ جگہ کسی بھی بحث مباحثہ کے لیے وں نہیں تھی اس لیے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ اندر آ گئی۔ علی بغور مختلف کپڑوں کا معائنہ کر رہا ۔ وہاں موجود سیلز گرل نے اس سے اس کی پسند پوچھ کر اب خود ہی آگے بڑھ کر مختلف ڈریسز دکھانے ع کر دیے تھے مگر کوئی لباس بھی علی کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ صرف خاموش تماشائی کی یت سے علی کے ہم قدم تھی۔ آخر کار علی کو ایک جوڑا پسند آ ہی گیا تھا۔ کاٹن نیٹ اور گنزا کا لائٹ پنک کا سوٹ جس کی قمیص کا اوپری حصہ بھاری کام اور نچلا حصہ نگوں سے مرصع تھا۔ پنک پلین کاٹن کی ار اور قمیص ہی کے میٹریل کا دوپٹہ جس پر نگ لگے ہوئے تھے علی کو اتنا بھاری جوڑا پسند کرتا دیکھ کر کے اوسان خطا ہو گئے۔

''علی! ہمارے کسی کزن کی شادی نہیں ہے جس میں، میں اتنا ہیوی ڈریس پہن کر جاؤں گی۔'' نے اس کی منمناہٹ پر دھیان دیے بغیر سوٹ پیک کروایا، پیمنٹ کی اور بوتیک سے باہر آ گیا تو سے بولا۔

''کزنز کی شادیوں میں کون سا آپ ڈھنگ سے تیار ہوتی ہیں۔ آپ کو تو شوق ہے اپنے اوپر ھاپا طاری کرنے کا۔ بہر حال آج آپ میری پسند کی تیاری کریں گی۔'' اسے برے برے منہ بناتا کر وہ ہنس پڑا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ شام تک علی اس کی منت سماجت کر کے اسے اس بات پر دہ کر چکا تھا کہ وہ اس کا خریدا ہوا سوٹ پہنے۔ وہ علی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اس لیے نا چاہتے ئے بھی وہ سوٹ پہن لیا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال برش کر رہی تھی جب علی اس کے رے میں آیا۔ اسے نک سک سے درست تیار دیکھ کر وہ بولی۔

''تیار ہو گئے تم۔ بس پانچ منٹ رکو میں بھی تیار ہی ہوں۔'' علی نے ایک بھرپور نظر اس کے اپے پر ڈالی اور بولا۔

''پری! آپ کو پتا ہے آپ کتنی حسین ہیں۔ بغیر کسی میک اپ کے صرف ان کپڑوں ہی میں آپ پیاری لگ رہی ہیں۔'' وہ اس کی تعریف پر ہنس پڑی تھی۔ خود اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ں تھی۔ علی اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''جب میرے کہنے سے یہ کپڑے پہن لیے ہیں تو باقی تیاری بھی میری مرضی سے کریں۔''

''اب اور کیا کروں؟'' وہ علی کی فرمائشوں پر عاجز ہوئی۔

''صبح سے میک اپ کریں اور آج یہ گلاسز لگانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا نے کونٹیکٹ لینسز سجانے کے لیے نہیں دلائے تھے۔ ان گلاسز کے پیچھے آپ کی گرے گرین آنکھوں کی خوب صورتی بالکل چھپ جاتی ہے۔''

''جب بقول تمہارے میں اتنی خوب صورت ہوں تو پھر تو مجھے کسی قسم کے میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ برش رکھتے ہوئے بولی۔ علی نے ڈریسنگ ٹیبل کا تفصیلی جائزہ لے کر aqua Foemdation کا اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور بولا۔

''آج اس خوب صورتی کو چار چاند لگائیں میری خاطر۔ میرا دل چاہ رہا ہے آج وہاں بس آپ ہی آپ ہوں۔ آپ سے زیادہ کوئی اچھا نہ لگے۔'' پھر علی اس کے سر پر کھڑا ہو کر اسے میک اپ کرتا دیکھتا رہا۔ وہ میک اپ کے بارے میں اس کی اتنی معلومات پر حیران تھی۔

''سچ سچ بتاؤ۔ آخر چکر کیا ہے؟ تمہیں میک اپ کی چیزوں کے بارے میں اتنی درست معلومات کون فراہم کرتا ہے۔'' وہ اس کے مشکوک انداز پر ہنس دیا اور بولا۔

''آخر ہم بھی تو آنکھیں رکھتے ہیں۔ صبح سے شام تک بے شمار لڑکیوں سے ملتا ہوں اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے اکثر کو اگر میں بغیر میک اپ کے دیکھوں تو چیخ اٹھوں۔ آپ تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔'' اس کے سوٹ کے ساتھ پہننے کے لیے جیولری بھی علی نے منتخب کی۔ اپنے ہاتھوں سے اسے کانچ کی چوڑیاں پہنائیں۔ پرفیوم اسپرے کیا جب اس نے حسب عادت بالوں کی چوٹی بنانی چاہی تو علی نے ٹوک دیا۔

''ایسے ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ آج بال کھول لیں۔''

''علی میں اپنی سسرال نہیں جا رہی ہوں۔'' وہ تنگ آ گئی تھی۔

''جو بھی ہے آپ آج میری مرضی سے ہی تیار ہوں گی۔'' علی نے اس کے ہاتھ سے لے کر برش رکھ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر نکلا۔ پاپا بھی تیار ہو کر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسے اور علی کو آتا دیکھ کر رک گئے۔

''پاپا دیکھیں میں نے پری کو کتنا اچھا تیار کروایا ہے۔'' علی نے پاپا کو دور سے آواز دے کر پکارا وہ بڑی محبت پاش نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے قریب آنے پر انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی تھی اور نظر کی دعا پڑھ کر پھونکی تھی۔ اس سے انہیں اس میں جمیرا نظر آئی تھی۔ وہ بالکل اپنی ماں کی طرح تھی۔ وہ اچانک کچھ سوچ کر افسردہ سے ہو گئے تھے۔ مگر بچوں کے سامنے قطعاً خود کو فریش ظاہر کر کے مسکراتے ہوئے بولے۔

''علی میری بیٹی کا دھیان رکھنا۔ کبھی دوستوں میں لگ جاؤ اور یہ بور ہوتی رہے۔'' وہ پاپا کے ہدایت نامے پر ہنستے ہوئے گردن ہلا گیا تھا۔

وہ علی کے ساتھ Carlton ہوٹل کے ارینا کورٹ یارڈ میں داخل ہوئی تو سخت نروس ہو رہی تھی۔ اس قسم کی تیاری اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کی تھی۔

''علی مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' علی کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی تو وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑا۔

''اور مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اتنی خوب صورت خاتون میری بہن ہیں۔ بائی دا وے آپ کو اتنی گھبراہٹ ہے کس بات پر؟'' وہ اس کے ہاتھوں کی نمی محسوس کر کے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ انہیں باتوں کے دوران چلتے ہوئے وہ دونوں استقبالیہ تک پہنچ گئے تھے۔

مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے دونوں طرف قطار میں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ جن میں سے وہ کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ علی نے ان میں سے دو تین لوگوں سے ہاتھ ملائے اور آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ فاصلے پر راؤنڈ ٹیبل کے پاس کھڑے کسی سے باتیں کرتے مرتضیٰ کی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ ان صاحب سے معذرت کرتا تیزی سے ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا جیسے اسے دیکھ کر مرتضیٰ کی آنکھوں میں ایک دم بڑی خاص سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ علی کا شکریہ ادا کرتا اس سے خیر خیریت دریافت کرتا اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اور آپ کیسی ہیں؟'' تانیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے عام سے انداز میں اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے آنکھوں میں ابھرنے والی چمک بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔

"I am fine thank you"

''آؤ علی میں تمہیں اپنی ماما سے ملواؤں۔'' اس کے جواب دیتے کے ساتھ ہی مرتضیٰ نے علی سے کہا تو علی نے فوراً قدم آگے بڑھائے اور اس سے بولا۔

''آئیں پری۔ مرتضیٰ بھائی کی ماما سے مل کر آتے ہیں۔'' ان دونوں کے ساتھ چلتی وہ نظریں جھکائے ہوئے بھی یہ بات محسوس کر سکتی تھی کہ اچانک ہی وہ اس محفل میں مرکز نگاہ بن گئی ہے۔ بہت سے لوگ اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ وہ اتنے لوگوں کی خود پر مرکوز نگاہوں سے کنفیوژ سی ہو رہی تھی۔ اس کے برابر چلتے مرتضیٰ نے بڑے غور سے اس کی نروس شکل کی طرف دیکھا تھا۔

علی کو اچانک وہاں ایک ٹیبل کے پاس اپنے کچھ پرانے دوست نظر آ گئے تو بولا ''آپ چلیں مرتضیٰ بھائی میں ابھی ان لوگوں سے ہائے ہیلو کر کے آتا ہوں۔'' مرتضیٰ نے اس کی بات پر گردن ہلا دی اور آگے چلنے لگا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے؟ علی کے ان دوستوں کو وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی اور مرتضیٰ کے ساتھ جانا بھی اسے بڑا اکورڈ لگ رہا تھا۔ اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر مرتضیٰ بھی ایک دم رک گیا تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ رک کیوں گئیں؟ آیئے پلیز۔'' وہ خود کو سخت مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اپنا اعتماد بحال کر کے وہ مرتضیٰ کے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر مرتضیٰ ایک خاتون کے پاس پہنچ کر رک گیا تھا۔ بلیک کلر کی سلک ساڑھی جس پر بنارسی بارڈر بنا ہوا تھا۔ پہنے وہ ایک بہت ہی گریس فل شخصیت کی حامل خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اور نسبتاً ینگ خاتون بھی کھڑی تھیں۔

''ماما یہ تانیہ ہیں۔'' وہ مرتضیٰ کے تعارف کے انداز پر حیران رہ گئی۔ اس کی ماما تو شاید علی کو بھی نہ جانتی ہوں تو اس کی بہن کو کیسے جانیں گی۔ مگر اگلا پل اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ خاتون اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور ایک بہت ہی گہری نگاہ اس پر ڈال کر مسکرا دی تھیں۔ اسے اپنا آپ اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا۔ بھلا علی کے بغیر اس کی ماما سے ملنے کے لیے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

''کیسی ہو تابہ؟'' انہوں نے اس طرح اس کی خیریت دریافت کی۔ جیسے اس سے پہلے بے شمار مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ اپنی بداخلاقی پر شرمندہ سی ہوتی فوراً بولی۔

''السلام وعلیکم۔ میں ٹھیک ہوں۔'' وہ اس کے اتنی دیر بعد سلام کرنے پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور بولی تھیں۔

''وعلیکم السلام۔'' ان کے ساتھ کھڑی وہ دوسری خاتون بھی بڑی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس طرح کی صورت حال کا سامنا وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کر رہی تھی اور اپنے نروس ہونے پر اسے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اسی وقت علی بھی وہاں آ گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اچانک ایسا لگا جیسے وہ محفوظ ہو گئی ہے۔ بے اختیاری میں اس نے دھیرے سے علی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا کہیں پھر غائب نہ ہو جائے۔ اس طرح علی کے ہاتھ پکڑنے کو کسی اور نے نہیں دیکھا مگر مرتضیٰ کی تیز نگاہوں سے یہ چیز چھپی نہیں رہ سکی۔ بے اختیار ایک گہری مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

علی نے مرتضیٰ کے تعارف کروانے پر اس کی ماما کو سلام کیا تو انہوں نے بڑی خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''بہت ذکر سنا ہے تمہارا مرتضیٰ سے بلکہ ایمن بھی تمہارے بارے میں بتا رہی تھی۔'' ان کی بات پر علی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے امید ہے وہ ذکر تعریفی ہی تھا۔'' وہ اپنے باقی تمام مہمانوں کو فراموش کیے ان دونوں کی طرف مکمل طور پر متوجہ تھیں۔ تابہ کو ان کی خود پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پڑنے والی گہری نگاہوں سے بہت الجھن ہو رہی تھی۔

''اور بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟'' انہوں نے تابہ سے پوچھا تو اس نے ان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے جواب دیا۔

''میں نے میڈیسن پڑھی ہے اور اپنے پاپا ہی کے ہاسپٹل میں کام کرتی ہوں۔'' وہ اپنا اعتماد کسی حد تک بحال کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اس لیے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔ اس کے جواب پر انہوں نے ایک ستائشی نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔ مرتضیٰ کی ماما سے فارغ ہو کر علی اسے اپنے کولیگز سے ملوانے لے آیا۔ خود مرتضیٰ ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے دیگر مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ علی کے کولیگز کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی اسی ٹیبل پر بیٹھ گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ ان میں ایک دو خواتین بھی تھیں اس لیے وہ بور نہیں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مرتضیٰ کی ماما اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لیے اس کے پاس آ گئیں اور اس سے بولیں ''بھئی تابہ ان دونوں سے ملو۔ یہ میری بڑی بیٹی ہے صبا اور یہ اس سے چھوٹی شفاء۔'' وہ اپنی کرسی پر سے کھڑی ہو کر ان دونوں سے ہاتھ ملانے لگی۔ ان دونوں کی ڈریسنگ کا اسٹائل ہی بتا رہا تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ اس سے ملتے وقت ان دونوں ہی نے بڑی گرم جوشی اور ایکسائٹمنٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔

''ہم بہن بھائی میں سب سے بڑے مرتضیٰ بھائی ہیں پھر میں ہوں میرے بعد شفاء اور ہم سب سے چھوٹی ایمن جس کی انگیجمنٹ ہے۔'' صبا نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بتایا تو اس نے گردن ہلا دی۔ میز پر موجود باقی لوگ بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ کچھ جز بز ہوتی صبا کو دیکھ رہی تھی جس نے ہاتھ ملانے کے بعد ابھی تک اس کا ہاتھ بڑی محبت سے تھاما ہوا تھا۔ دو چار منٹ وہ

لوگ اس سے رسمی سی باتیں کرتی رہیں مگر تابہ کو ایسا لگا جیسے وہ باتیں کرنے سے زیادہ اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے برابر بیٹھے علی سے بولی۔

''علی گھر چلو۔'' علی نے اس کا حتمی اور دوٹوک انداز دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ آہستہ آواز میں بولی۔ ''مجھے بہت بوریت ہو رہی ہے اور مجھے فوراً گھر واپس جانا ہے۔''

''یہ بہن بھائی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟'' علی کی کولیگ مسز خرم نے دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے انہیں اپنی گھر واپسی کا بتانے لگی۔ پھر علی کے تمام ساتھیوں سے خدا حافظ کہتی وہ کھڑی ہو گئی اس کے انداز سے علی کو پتا چل گیا تھا کہ اب مزید وہ ایک سیکنڈ بھی نہیں رکے گی اس لیے وہ بھی بغیر کسی حجت کے کھڑا ہو گیا تھا۔ واپسی کے راستے پر چلتا علی ادھر ادھر نظریں دوڑا کر مرتضیٰ کو تلاش کر رہا تھا تا کہ ان سے اجازت لے سکے۔

تین چار افراد کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا مرتضیٰ اسے نظر آیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کی طرف چلا گیا جبکہ وہ وہیں کھڑی علی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑی علی کی واپسی کی منتظر اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ علی کی بات سن کر مرتضیٰ بھی اس کے ساتھ چلتا ہوا اسی طرف آ گیا۔ اس کے پاس آ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کے آنے کا بہت شکریہ۔ ویسے یہ جو ایمن ہے میری سب سے چھوٹی بہن ہے اور اس سے بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔'' وہ اس کے منہ سے اتنی غیر متعلقہ بات سن کر حیران رہ گئی۔ وہ اسے اپنی فیملی کی تفصیلات کس خوشی میں فراہم کر رہا تھا۔ تابہ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہاں لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت نظر آئی۔ اچانک اس کی نظر علی پر پڑی تو وہ بھی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا نظر آیا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے ناگواری کے رنگ علی سے چھپے نہ رہ سکے تو وہ جلدی سے مرتضیٰ سے ہاتھ ملا کر الوداعی کلمات ادا کرنے لگا۔ وہ علی سے پہلے ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ راستے میں علی نے دو تین مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اگلا پورا دن اس نے علی سے بات کیے بغیر گزارا۔ رات میں وہ اکیلی لان میں واک کر رہی تھی جب علی بھی آ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''پری آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔

''پری پلیز مجھ سے بات کریں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں بولا تو اس نے علی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"Ali do you take me for a fool"

''ہرگز نہیں۔'' علی نے پرزور انداز میں اس کی بات کی تردید کی۔

''ایک ایسی بات جو ہم بہن بھائی کے درمیان ہوئی تھی کیا تمہیں اسے بتانی چاہیے تھی؟'' وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''بلیو می میں نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی۔ آپ کے خیال سے کیا میں اتنا احمق ہوں کہ انہیں ان کے اور ان کی بہنوں کے بارے میں آپ کے نادر و نایاب خیالات بتاؤں گا۔ فرینڈ شپ اپنی جگہ ہے لیکن میں نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔'' علی کی بات پر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

''پھر شاید انہیں فرشتوں نے آکر بتایا ہوگا۔'' وہ علی کی غلط بیانی پر چڑ گئی تھی۔

''پری میرا یقین کریں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ آپ کی طرح ان کی بات پر میں بھی حیران ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ذہانت کا بھی قائل ہو گیا تھا۔ یہ بات تو آپ بھی مانتی ہیں کہ مرتضیٰ بھائی غیر معمولی ذہین آدمی ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی ان کی ذہین آنکھوں سے خوف آنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی ایکس رے مشین ہے۔ وہ آپ کے فیس ایکسپریشنز سے شاید کوئی بات بھانپ گئے تھے۔ آپ ان کی بہنوں اور کزنز کو دیکھ بھی تو خالصتاً ٹیپکل بہنوں والے اسٹائل میں دیکھ رہی تھیں۔'' علی نے اپنی بات کے اختتام پر اس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ ہنوز سنجیدہ شکل بنائے واک کر رہی تھی۔

''پھر بھی آئندہ میں تمہارے ساتھ کسی جاننے والے کے ہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' اس کی بات پر علی نے بڑی عاجزی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پری وہ آپ سے مذاق کر رہے تھے۔''

''لیکن میرا ان کے ساتھ مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے جو وہ میرے ساتھ مذاق کرتے پھریں۔ سمجھا دینا اپنے مرتضیٰ بھائی کو۔'' وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کون تھا وہ جو اس کی شخصیت کے گرد کھینچے حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک قلعے میں قید کر رکھا تھا اور کسی کو بھی وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس قلعے میں داخل ہو۔ وہ کمرے میں لیٹ کر بھی بہت دیر تک کھولتی رہی تھی۔ اگلے روز سے اس نے علی کے ساتھ اپنا رویہ نارمل کر لیا تھا۔ وہ علی کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے اصل غصہ اس کی ماما اور بہنوں کے ملنے کے انداز پر آیا ہے۔ وہ نا سمجھ بچی نہیں تھی جو ان کے انداز سے کچھ سمجھ نہ پاتی۔

☆☆☆

اس روز سنڈے تھا۔ اس کی ساتھی ڈاکٹر، ڈاکٹر میمونہ عابد کے ہاں محفل میلاد تھی اور وہ اس میں شرکت کے لیے ان کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مغرب سے کچھ پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو پاپا اور علی کے ساتھ صوفے پر بیٹھے مرتضیٰ کو دیکھ کر اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ان تینوں ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''السلام علیکم پاپا۔'' وہ سلام کر کے پاپا کا جواب سنے بغیر ہی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ شعیب بٹ اس کی اس بد اخلاقی پر سخت متعجب تھے۔ وہ تو اپنے اچھے اخلاق، رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ہر جگہ سراہی جاتی تھی اور اس وقت مہمان کو سلام کیے بغیر وہ کتنی بدتمیزی سے اوپر چلی گئی تھی۔

انہوں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ مرتضیٰ کی طرف دیکھا تو وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا اس کے

چہرے پر کسی ناراضگی کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ وہ اس کی اعلیٰ ظرفی پر حیران ہوئے اس نے اپنی انسلٹ کا برا نہیں منایا تھا۔ پھر تابعہ کی بدتمیزی کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ سارا وقت مرتضیٰ اور علی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

وہ اپنے کمرے میں آکر آرام سے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی بلا سے اگر کریم بابا نے چائے پیش کر دی تو اچھی بات ہے اور اگر نہیں کی تو میں کیا کروں۔ وہ نماز پڑھ کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اسے اس طرح حجرہ نشین ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ علی بھوک کا کتنا کچا ہے۔ جانے سے پہلے وہ چپلی کبابوں کا مسالا تیار کر کے گئی تھی۔ اب صرف تلنے کا کام رہتا تھا۔ پلاؤ کے لیے یخنی بھی تیار تھی صرف چاول بگھارنے تھے۔ یہ تمام کام کریم بابا کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج سے ابھی بھی ان تینوں کی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ موصوف بڑی ہی فرصت سے آکر بیٹھے ہیں اس نے جل کر سوچا تھا۔ پھر جب تمام چیزیں تیار ہو گئیں اور اس نے کھانا میز پر چن دیا تو کریم بابا سے ان لوگوں کو کھانے کے لیے بلانے کا کہہ کر دوبارہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے پاپا نے کریم بابا سے تابعہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

''بٹیا کہہ رہی ہیں انہیں بھوک نہیں ہے بعد میں کھائیں گی۔''

''ایسی ہی ہے وہ کھانے پینے کے معاملے میں۔ وہاں میلاد میں ذرا کچھ چکھ لیا ہوگا بس اب کھانا نہیں کھائے گی۔'' پاپا نے مرتضیٰ سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ رات دس بجے مرتضیٰ کی واپسی ہوئی تو وہ اپنے کمرے سے نکلی پاپا سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور علی بھی شاید اپنے بیڈروم میں تھا۔ وہ کچن میں آکر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

وہ علی سے صاف صاف لفظوں میں کہنا چاہتی تھی کہ اسے مرتضیٰ ہاشمی کی اپنے گھر آمد و رفت پسند نہیں اس لیے اس دوست کو گھر سے باہر ہی رکھو۔ مگر ایک جھجک سی آڑے آرہی تھی وہ اپنی ناپسندیدگی کی کیا وجہ بتائے گی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تھا کہ وہ دفاعی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مقابل کے وار کا سامنا کرنے کی ہمت اسے خود میں نظر نہیں آرہی تھی اسے اپنا defensive ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس طرح دندناتا ہوا گھستا چلا آرہا تھا کہ وہ اپنے قلعے کے دروازے مضبوطی سے بند کیے خود کو ممکنہ شکست سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اور علی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر اسٹار اسپورٹس دیکھ رہے تھے۔ فون کی بیل پر تابعہ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف مرتضیٰ کی آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم۔ میں مرتضیٰ بات کر رہا ہوں۔''

''وعلیکم السلام۔'' اس نے سلام کا جواب دیتے کے ساتھ ہی کسی اگلی بات سے قبل ہی ریسیور علی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ''کون ہے؟'' اس نے اشارے سے

پوچھا تو وہ باآواز بلند بولی۔
''آپ کے مرتضٰی بھائی کا ہے۔'' اس کی آواز دوسری طرف بڑے آرام سے سنی گئی ہوگی اس بات کا اسے صدفی صد یقین تھا۔ علی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور بات کرنے لگا۔ وہ ٹی وی بند کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ کچن سے پانی پی کر وہ لان میں جارہی تھی۔ علی ابھی بھی مرتضٰی سے بات کر رہا تھا۔
''آپ کو خود ہی شوق ہے مشکل کام کرنے کا۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا۔'' وہ پتا نہیں کس کام کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف اس نے پتا نہیں کیا جواب دیا تھا کہ علی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
''مرتضٰی بھائی یہ آپ کی زندگی کا مشکل ترین پروجیکٹ ہے۔ اس سے کہیں آسان تو اہرام مصر کی ڈیزائننگ رہی ہوگی۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں شاید اپنے کسی نئے پروجیکٹ کو ڈسکس کر رہے تھے۔ تابہ لان میں چلی گئی تھی۔ علی نے اسے یہاں آتے اور لان کی طرف جاتے نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا وہ علی کے ساتھ گھر کے روزمرہ استعمال کا سامان خریدنے سپر مارکیٹ آئی تھی۔ گھر والوں کی خوراک کے بارے میں وہ جتنی فکر مند رہا کرتی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ فروٹ، سبزی، گوشت سب کچھ خود خرید کر لائے۔ تقریباً دو گھنٹے علی بے چارہ اس کے ساتھ خوار ہوا تب کہیں جا کر اس کی شاپنگ مکمل ہوئی۔ واپسی میں گھر جانے کے بجائے علی نے گاڑی دوسرے راستے پر ڈالی تو وہ پوچھنے لگی۔
''کہاں جارہے ہو؟'' وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا بولا۔
''مرتضٰی کے گھر۔ ہمارے گھر سے قریب ہی ہے ان کا گھر۔ مجھے ان سے ایک ضروری فائل لینی ہے۔ صرف دو تین منٹ لگیں گے۔'' وہ اس کے جواب پر بدمزگی سے بولی۔
''علی پہلے مجھے گھر ڈراپ کردو پھر جہاں بھی جانا ہے جاؤ۔''
''پری کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ ایسا بھی ان بے چاروں نے آپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا جو آپ کی ان سے اتنی دشمنی ہوجائے۔'' وہ علی کے جواب پر ناراض شکل بنا کر چپ ہوگئی۔ پانچ چھ منٹ بعد ہی گاڑی ایک شاندار سے مکان کے سامنے روک کر علی باہر نکلا۔
اسے دیکھ کر چوکیدار پورا گیٹ کھولنے لگا۔ وہ اس مکان کی طرف سے رخ موڑ کر قصداً دوسری طرف دیکھنے لگی۔ علی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اندر چلا گیا۔ علی کو گئے تین چار منٹ ہوگئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ مرتضٰی یا اس کے گھر کے کسی فرد سے اس کی ملاقات نہ ہو علی گیٹ سے باہر نکلتا نظر آیا تو اس نے شکر ادا کیا۔ مگر ان کے پیچھے مرتضٰی کی ماما کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو بوکھلا گئی۔ انہیں گاڑی کی طرف آتا دیکھ کر وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور ان سے پہلے چلتی ان کے پاس آگئی۔
''السلام علیکم۔'' اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ خفگی بھرے لہجے میں بولیں۔
''یہاں تک آکر باہر سے ہی چلی جاؤ گی۔ علی کہہ رہا تھا کہ تم نے اندر آنے سے منع کر دیا ہے

دن بھی کیا ہم لوگ تمہیں اچھے نہیں لگے۔'' وہ اپنائیت سے بولیں تو وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔
''ایسی بات نہیں ہے آنٹی اصل میں اس وقت کچھ جلدی ہے اس لیے۔'' وہ اس کی وضاحت سے قطعاً مطمئن نہ ہوئیں اور بولیں۔
''تم مجھے علی کے سامنے شرمندہ کراؤ گی۔ چلو اندر شاباش۔'' وہ اتنی بڑی خاتون اسے خود گیٹ پر بلا رہی تھیں وہ اتنی بدتمیز کبھی بھی نہیں تھی کہ انہیں منع کر دیتی سو ناچار اس نے ان کے ساتھ گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔ ان کے ساتھ چلتے اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے ہی صوفے پر مرتضٰی اور لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کے چہروں پر اسے دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ آگئی تھی۔ مرتضٰی اپنی جگہ پر سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اسے گھر آئے مہمان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں سمجھا رہا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس نے اپنے گھر میں مرتضٰی کی عزت افزائی کی تھی۔
وہ لڑکی اس کے پاس آکر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔
"Hello! i am Aeman" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے تابہ نے تھام لیا اور مسکراتے ہوئے اس کے ہیلو کا جواب دیا۔
''تو ماما آپ کو اندر لے ہی آئیں۔ علی کہہ رہا تھا آپ کو گھر جانے کی بہت جلدی ہے۔'' اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایمن نے کہا تو اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ مرتضٰی کی ماما بھی اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ علی اور مرتضٰی ان لوگوں کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وائٹ ٹی شرٹ اور بلیک جینز پہنے بکھرے بالوں کے ساتھ وہ اس سوٹ اور ٹائی والے مرتضٰی سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔
''ایمن جاؤ اپنے ڈیڈی کو بلا کر لاؤ۔'' آنٹی نے ایمن سے کہا تو وہ فوراً حکم کی تعمیل میں اٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور مرتضٰی کے ڈیڈی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ علی سے شاید وہ پہلے بھی ملے ہوئے تھے اس لیے خوشدلی سے بولے۔
''کیسے ہو علی۔'' علی نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''بالکل ٹھیک آپ سنائیں۔''
''ہم بھی ٹھیک ہی ہیں یار۔ بس آج کل تمہاری آنٹی نے میٹھا کھانے پر پابندی لگائی ہوئی ہے اس لیے زندگی بڑی پھیکی گزر رہی ہے۔'' ان کی بات پر وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے۔
''ڈیڈی آپ تابہ سے تو ملے نہیں۔'' ایمن نے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئے اور بغور مسکراتے ہوئے دیکھنے لگے۔ اس نے انہیں سلام کیا جس کا انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں جواب دیا اور اپنے بیٹے کے برابر ہی میں ٹک گئے۔
''علی یہ تم نے ہمارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ یہ اتنی پیاری لڑکی کو آج تک چھپا کر رکھا ہوا تھا۔'' انہوں نے علی کو مخاطب کیا۔ ان کی بات پر وہ بری طرح پزل ہوگئی تھی۔ جبکہ علی ہنس پڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی خود کو خاصا احمق محسوس کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر کوئی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آنٹی نے ایمن کو کولڈ ڈرنک لانے کے لیے کہا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔

''تم دونوں میں سے بڑا کون ہے؟'' انکل نے علی سے پوچھا تو وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ ان کے برابر بیٹھے مرتضیٰ پر اتفاقاً ہی اس کی نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ چہرے پر شرارت سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے چڑ سی گئی تھی۔ علی انکل کی بات کے جواب میں بولا۔

''تائبہ بڑی ہیں۔''

''اچھا ویسے لگتا نہیں ہے۔ دیکھنے میں وہ تم سے چھوٹی لگتی ہے۔'' ان کی بات پر اچانک ہی اسے ایک خیال سوجھا تو فوراً بولی۔

''علی مجھ سے پورے دس سال چھوٹا ہے۔'' سات سال کو اس نے دس سالوں میں بدل دیا تھا۔ تھوڑی بہت مبالغہ آرائی میں کوئی حرج نہیں۔ علی تو ویسے بھی اپنی ہائٹ اور جسامت کی وجہ سے چھبیس چھبیس سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ اس کی تیسویں سالگرہ اگلے مہینے ہے۔ چھبیس سالہ بھائی کی دس سال بڑی بہن یقیناً چھتیس سال کی ہوگی اور کسی چھتیس سالہ خاتون میں کسی کے لیے بھی کوئی اٹریکشن نہیں ہوتی۔ یہاں تو اپنے پچپن سالہ بیٹوں کے لیے بھی اٹھارہ، بیس سال کی لڑکی تلاش کی جاتی ہے تو چھتیس سال کی عمر میں اسے کون منہ لگائے گا۔ وہ بھی اپنے ذہین، قابل اور ہینڈسم بیٹے کے لیے۔ وہ اچانک بڑی پرسکون ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی جان بڑی عمدگی سے چھڑالی تھی۔

''بچو جی اب لاکھ سر پٹخو تمہاری اماں کبھی بھی تمہاری بات نہیں مانیں گی۔'' وہ اپنی سوچ پر مسکرا دی تھی۔ ایمن کے کولڈ ڈرنک لانے پر اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ وہ اب کیونکہ بالکل پرسکون ہوگئی تھی اس لیے کچھ دیر پہلے والی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ پر بھی قابو پا چکی تھی۔

ایمن اپنے ساتھ ایک البم بھی لائی تھی۔ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی ''میری انگیجمنٹ کی تصویریں ہیں۔'' وہ اسے تصویریں دکھا رہی تھی۔ جبکہ تینوں مرد حضرات آپس میں گفت و شنید میں مصروف تھے۔ آنٹی اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔ وہ تعریفیں کرتے ہوئے اس کی تمام تصویریں دیکھ رہی تھی۔

''علی! گھر چلیں۔'' اس نے البم بند کرتے ہوئے علی کو مخاطب کیا۔

''ایسے تو ہم تمہیں کبھی بھی نہیں جانے دیں گے۔ کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے کھانا کھا کر جانا۔'' علی سے پہلے انکل نے جواب دیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آنٹی واپس آگئیں انہیں دیکھ کر انکل بولے۔

''بھئی وہ کھانے کا کیا ہوا؟''

''کھانا بالکل تیار ہے۔ بس سلاد رہ گئی ہے۔ جاؤ ایمن سلاد بناؤ جا کر۔'' ایمن نے سلاد بنانے کے نام پر برا سا منہ بنایا تھا۔

''دیکھو ذرا اسے کتنی کام چور ہے۔'' وہ تائبہ سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔

''کوکنگ کا بالکل شوق نہیں ہے۔ میں کام کرنے کو کہوں تو کہتی ہے نوکر کس مرض کی دوا ہیں۔'' ایمن اپنی برائیوں پر ناراض ہو کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''کوئی بات نہیں آنٹی آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔ میں نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں جنہیں شادی سے پہلے کوکنگ کا بالکل شوق نہیں ہوتا مگر بعد میں وہ سب سیکھ جاتی ہیں۔'' اس نے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔

''امید تو یہی ہے۔'' انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''اور ہماری بیٹی کو کوکنگ کا کتنا شوق ہے؟'' انکل نے جو اس کی اور آنٹی کی باتیں بغور سن رہے ہا۔

''مجھے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ بس گزارا ہو جاتا ہے۔'' اسے اپنی برائیاں کرنے میں بہت اتھا۔

''تمہیں ٹائم بھی کہاں ملتا ہوگا۔ ڈاکٹرز کی لائف تو کتنی بزی اور ٹف ہوتی ہے۔'' آنٹی نے سے کہا۔ علی اور مرتضیٰ اس تمام گفتگو میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہوئے مسکرا رہے

''شوق ہو تو انسان ٹائم بھی نکال لیتا ہے۔ اصل میں مجھے شوق ہی نہیں ہے۔'' وہ چاہتی تھی کہ ں کے جانے کے بعد مرتضیٰ کی ماما جو تبصرہ اس کے بارے میں کریں وہ کچھ یوں ہو ''صرف کو لے کر ہمیں چاٹنا ہے کیا۔ نہ سگھڑ نہ سلیقہ مند اور اوپر سے عمر رسیدہ۔ نہ بابا مجھے منظور نہیں۔'' ے واپسی میں وہ علی کو کیسے فیس کرے گی اس بات سے قطع نظر وہ اس وقت بہت خوش تھی۔ ر سے مسکراہٹ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آ کر کھانا لگ جانے کی ی تو وہ سب اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔

ہ اب بڑی پرسکون تھی اس لیے بغیر کسی گھبراہٹ یا ہچکچاہٹ کے کھانے کی میز پر آگئی تھی۔ اس ں سامنے والی کرسی پر مرتضیٰ اور اس کے برابر میں علی بیٹھے ہوئے تھے۔ آنٹی اور انکل دونوں ہی اطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔

''تائبہ تم یہ نرگسی کوفتے ضرور ٹرائی کرنا۔ میری یہ ڈش سب ہی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔'' ے ان کے کہنے پر تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔

''لگتا ہے آنٹی آپ نے اپنے ہاں کک نہیں رکھا ہوا۔ کھانا آپ خود ہی پکاتی ہیں۔'' اس کی بات نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اس معاملے میں یہ بہت وہمی ہیں۔ انہیں نوکروں کے ہاتھ کا پکا کھانا اصول صحت کے خلاف ۔ خود اپنے ہاتھ سے صاف ستھرے طریقے سے کھانا پکا کر ہی انہیں تسلی ہوتی ہے۔'' وہ اپنی اور ذہنی سوچ کی اس مماثلت پر حیران تھی۔ مرتضیٰ کی خود پر مرکوز نگاہوں پر اسے سخت کوفت ہو رہی ھانا کھانے کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ایمن تم کیا پڑھ رہی ہو؟'' صرف اس کی نظروں کے حصار سے نکلنے کے لیے وہ اپنے برابر ن سے بولی۔

''میں سول انجینئرنگ کر رہی ہوں۔ فائنل ایئر کا امتحان تو دے دیا ہے آج کل ہمارا پروجیکٹ ہے۔'' ایمن نے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''واہ بھئی زبردست۔ آپ دونوں بہن بھائی نے فیلڈز کا انتخاب تو خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے رائنگ ڈیزائن کریں گے اور ایمن ان کی ڈیزائن کردہ building پر عملی کام کریں گی۔ ان کنسٹرکشن R.C.C میں ہونی چاہیے یا steel structures میں یہ ایمن ڈیسائڈ

کرے گی۔ یعنی یہ کہ کسی آؤٹ سائڈر کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ گھر کا انجینئر اور گھر ہی
آرکیٹیکٹ۔" وہ ہنستے ہوئے براہ راست مرتضیٰ کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے دیکھنے پر نروس ہو جاؤں گی بالکل کسی سولہ سترہ سال کی لڑ
کی طرح۔" وہ چیلنج کرتی نظروں سے مرتضیٰ کو دیکھ رہی تھی۔ تابیہ شعیب کوئی عام لڑکی نہیں جسے تم ا
سامنے جھکا سکو۔ میں تمہارے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گی۔"

اس کی بات کو سب ہی نے بہت انجوائے کیا تھا۔ میز پر بیٹھے کسی اور فرد کو پتا بھی نہیں تھا
سامنے سامنے بیٹھے دو افراد اس وقت ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ مرتضیٰ نے اس کی مگر
آنکھوں کو اپنی مقناطیسی آنکھوں کی گرفت میں لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"اور اگر کسی وجہ سے بلڈنگ گر گئی تو ڈاکٹر بھی تو گھر ہی کا ہوگا۔" مرتضیٰ کے جواب پر ا
سمیت سب ہی بے اختیار ہنس پڑے تھے اور اسے پتا نہیں کیا ہوا تھا وہ ان نظروں کا سامنا نہیں کر
تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ثابت ہوا تھا۔
نے بے اختیار اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ اتنی دیر سے سنجیدہ بیٹھے مرتضیٰ کے لبوں پر ایک دم مسکراہٹ آ
تھی۔

"مجھے چیلنج قبول کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ آسان کام تو آج تک میں نے کوئی کیا ہی نہ
اس کے چہرے پر موجود یہ تحریر وہ سر جھکائے ہوئے بھی پڑھ سکتی تھی۔

علی کھانے کے دوران زیادہ وقت خاموش ہی رہا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو اس
علی سے گھر چلنے کا کہا۔ اسے ایک منٹ رکنے کا کہہ کر آنٹی اندر چلی گئیں۔ وہ لوگ کھڑے ہوئے ا
واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈبا تھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" انہوں نے وہ ڈبا اس کی طرف بڑھایا تو وہ بڑے جھجکتے ہوئے انداز
بولی۔

"آنٹی پلیز آپ اس تکلف کو رہنے دیں۔" وہ ان سے کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے ہچکچا
تھی۔

"تم پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو اور میں تمہیں خالی ہاتھ جانے دوں اور یہ کوئی ایسی قیمتی چ
نہیں ہے۔ بازار گئی تو یہ شال اچھی لگ گئی تھی میں نے ایسے ہی خرید لی تھی۔ شاید یہ لی ہی تمہارے
گئی تھی اور دیکھنا یہ بلیک کلر تمہیں کتنا سوٹ کرے گا۔"

انہوں نے ڈبا کھول کر اسے شال دکھائی۔ بلیک کلر کی شال جس پر سرخ اور زرد رنگ سے
کڑھائی ہوئی تھی۔ اسے بغیر ہاتھ میں لیے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی قیمتی ہے۔ اسے تحفہ قبول کر
میں متامل دیکھ کر انکل نے بھی اصرار کیا تو اس نے ایک نظر علی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ
اشارے سے گفٹ لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مجبوراً اس نے شکریہ کے ساتھ ان کا تحفہ قبول کر لیا
سب لوگ انہیں باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔

"آنٹی آپ ایمن کو لے کر ہمارے گھر آیئے گا۔" اس نے پرخلوص انداز میں انہیں ا
آنے کی دعوت دی تو وہ چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ لیے بولیں۔

"تمہارے گھر تو تم نہ بھی بلاتیں ہم نے تب بھی آنا ہی تھا۔" ان کی بات پر اس کا چہرہ ایک لمحے
خ ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔ مگر باقی تمام افراد کے چہروں پر دبی دبی
ہٹ پھیل گئی تھی۔ اس سے زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا اسے آج تک کی زندگی میں کبھی نہیں
۔ وہ خود کو انجان اور لاتعلق ظاہر کرنا چاہ رہی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ آنٹی اور انکل دونوں نے
ے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ سامنے کھڑے مسکراتے ہوئے مرتضیٰ
جودگی اس سے اس پر بڑی بھاری پڑ رہی تھی۔

راستے میں وہ علی سے نظریں چرائے روڈ کی طرف توجہ سے آتی جاتی گاڑیوں کا معائنہ کرتی رہی
اسے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے اس وقت بڑی سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ آخر وہ کوئی چھوٹا سا
ں تھا جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتا ہو۔ اپنی اس شرمندگی اور جھینپ کو مٹانے کے لیے وہ علی سے ایمن
ق پوچھنے لگی۔

"علی تم ایمن کو کیسے جانتے ہو؟" وہ جو بڑی توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا ایک لمحے کے لیے اس
ے دیکھا اور دوبارہ ونڈ اسکرین پر نظر جما کر بولا۔

"وہ اکثر آفس آتی ہے اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں مدد لینے اور زیادہ تر مجھ بے چارے ہی کی
آتی ہے کہ اسے اور اس کے گروپ کے باقی لوگوں کو گائیڈ کروں۔"

وہ جواب دینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیوں آپ کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"بس ایسے ہی۔ تم لوگوں کے بات کرنے کے اسٹائل سے لگ رہا تھا کہ بہت اچھی دوستی ہے۔"
ائی سے بولی تھی۔

☆☆☆

وہ ان دنوں عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ سارا دن خود کو کام میں دانستہ مصروف رکھ کر وہ جب
تھک ہار کر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتی تو بند آنکھوں کے سامنے کسی کی مسکراتی ہوئی شبیہ
جاتی کسی کی مقناطیسی آنکھیں اسے اپنی گرفت میں لیتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ جتنا اس خیال
ا چھڑانے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی آن بان سے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ یہ دروازہ کبھی بھی اور
ے لیے بھی نہیں کھولنا چاہتی تھی مگر وہ اس قلعے کا محاصرہ کیے اس طرح کھڑا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی
بیر کرنے کے باوجود خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ "پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ میں بڑی
مادی اور پرسکون زندگی گزار رہی ہوں میرے اس سکون کو درہم برہم مت کرو۔" وہ اس کے
ے التجا کرتی۔

رتضیٰ آفس کے کسی کام سے علی کو اسلام آباد بھیج رہا تھا۔ جس صبح علی جا رہا تھا وہ پتا نہیں کیوں اس
اداس تھی۔ اپنی یہ بے کلی اور اداسی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ علی کو روک
ہ نہ جانے دے۔ مگر وہ اسے کیا کہہ کر روکتی یہی سوچ کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

پری میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ تو اس طرح فکرمند ہو رہی ہیں جیسے میں

سال بھر کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔'' وہ اس کی مسلسل نصیحتوں سے عاجز آ کر بولا تھا۔ علی کے اوپر بہ
سی قرآنی سورتیں پھونک کر اس نے اسے رخصت کیا تھا۔

اس روز ہاسپٹل میں بھی اس کا دل نہیں لگا تھا۔ سارا دن عجیب سی الجھن میں گزر گیا تھا۔ وہ ا
اوہام کو جھٹک کر جتنا خود کو پرسکون کرنا چاہتی اتنا ہی اس کا دل اداسی میں ڈوبتا چلا جاتا۔ رات ک
کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے وہ اور پاپا ٹی وی پر اپنی پسندیدہ مووی دیکھ رہے تھے۔

''پاپا دیکھیں یہ سین میں آپ سے کہہ رہی تھی۔ کتنا زبردست پکچرائز کیا ہے۔ ڈائریکٹر کی ذہا
ہیں پتا چلتی ہے۔'' وہ اسکرین پر نظریں جمائے پاپا سے بولی انہوں نے اس کی بات کا کوئی جواب
دیا تو اس نے نظریں گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹ بھینچے سینے پر ہاتھ رکھے انتہائی اذیت میں
آ رہے تھے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پر گر گیا تھا۔

''پاپا! وہ چیخی تھی۔ ''پاپا کیا ہوا ہے آپ کو۔'' وہ پاپا کا ہاتھ پکڑ کر روہانسی آواز میں بولی۔ ا
جواب دینے کی کوشش میں اپنے لب وا کرتے وہ صوفے پر گر گئے تھے۔ بے ہوش پڑے پاپا کو د
اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر ہارٹ بیٹ چیک کر کے وہ انہیں فر
ایڈ دینا چاہتی تھی مگر اس کے اوسان ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اس کے کانپتے ہوئے بازوؤں میں بالکل
سکت نہیں تھی۔ وہ پوری کی پوری کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا کفن میں
چہرہ آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی اس کی سوچنے سمجھنے کی تمام حسیات اس کا ساتھ چھوڑتی جا
رہی تھیں۔

ڈرائیور تو رات نو بجے ہی جا چکا تھا۔ وہ کہاں سے مدد مانگے۔ وہ بغیر کچھ سوچے بھاگتی ہوئی
کے کمرے میں گئی تھی اور اس کے ٹیلی فون انڈیکس میں سے ایک نمبر نکال کر اب کانپتے ہاتھوں سے ن
ملا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر نیم دراز کتاب پڑھتے ہوئے اپنا فیورٹ میوزک سن رہا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو
نے ایک نظر گھڑی کی طرف ڈالی اور سوچا کہ رات کے بارہ بجے کون ہو سکتا ہے۔

''ہیلو!'' تیسری چوتھی بیل پر اس نے کال ریسیو کی تھی۔

''ہیلو۔ مرتضیٰ میں تائبہ۔'' دوسری طرف سے آتی تائبہ کی آواز سن کر وہ چونک گیا تھا۔ بج
گھبرایا ہوا سا انداز تھا اس کا۔

''کیا بات ہے تائبہ؟ آپ ٹھیک ہیں۔'' اس کی شارپ حسیات اسے کسی خطرے کی نشان دہ
رہی تھیں۔

''آپ پلیز جلدی سے آ جائیں۔ پاپا کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔
کے رونے پر بوکھلاتا ہوا وہ ایک دم بستر سے اتر گیا تھا۔

''آپ روئیں مت میں آ رہا ہوں۔'' اسے دلاسا دیتے ہوئے اس نے فون بند کیا تھا اور گا

چابیاں اٹھا کر سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا تھا۔

لاؤنج میں ایمن ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ''ایمن میں علی کے گھر جا رہا ہوں۔ اس کے پاپا کی طبیعت
ب ہے۔'' اسے اطلاع دے کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

اس سے زیادہ تیز رفتاری سے گاڑی اس نے زندگی میں کبھی نہیں چلائی تھی۔ رات کا وقت
نے کی وجہ سے ٹریفک بھی کم تھا تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ گاڑی باہر ہی چھوڑ کر وہ
آ گیا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آواز سن کر وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی باہر نکل تھی۔ وہ چوکیدار سے اسے بلانے
ہ ہی رہا تھا جب وہ اس کے پاس آ گئی تھی۔

''مرتضیٰ پلیز میرے پاپا کو بچا لیں۔'' وہ آنکھوں میں خوف و ہراس لیے اس سے بولی تو وہ اسے
جواب دیے بغیر خود ہی اندر آ گیا۔ لاؤنج میں صوفے پر بے ہوش پڑے انکل کو دیکھ کر وہ تیزی
ن کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دور کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھا کر وہ تیزی سے
لا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے
وہ اس سے بولا ''بیٹھیں'' وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ انہیں جلد از جلد قریب ترین ہاسپٹل پہنچا دینا چاہتا تھا۔
مسلسل آنسو بہاتا دیکھ کر وہ نرمی سے بولا تھا۔

''آپ تو ایک ڈاکٹر ہیں آپ کو اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔'' اس نے شاید اس کی
سنی ہی نہیں تھی وہ گردن موڑے پاپا کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ گاڑی ہاسپٹل کے احاطے
روک کر وہ اندر چلا گیا تھا۔ اسٹریچر پر لٹا کر انہیں آئی سی یو میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مرتضیٰ ادھر ادھر پتا
کیا بھاگ دوڑ کرتا پھر رہا تھا۔ وہ اکیلی اس ٹھنڈے یخ اور خاموش کوریڈور میں دیوار سے ٹیک
ے کھڑی تھی۔ کافی دیر بعد مرتضیٰ اس کے پاس آیا۔ وہ اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر بے اختیار دیوار پر
تی ہوئی تھوڑی دور ہٹ گئی تھی۔

''مجھے کوئی بری خبر مت سنائیے گا۔'' وہ وحشت زدہ انداز میں چیخی تھی۔

''تائبہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ انکل ٹھیک ہیں۔ پھر انہیں فوراً طبی امداد بھی مل گئی ہے خطرے کی
بات نہیں ہے۔'' وہ اسے رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میرے دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ممی بھی مجھے چھوڑ گئی تھیں میں نے انہیں کتنی آوازیں
تنا بلایا تھا مگر انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی تھی۔'' وہ اس وقت ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک سات
سال کی بچی بن گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا ممی ابھی ابھی اسے چھوڑ کر گئی ہیں۔ مرتضیٰ نے ایک نظر اس
تے سسکتے وجود پر ڈالی اور خود کو عجیب سی الجھن میں گھرا پایا۔ ان آنکھوں میں آنسو اس نے کبھی بھی
یکھنے چاہے تھے۔

علی نے ایک بار اس سے کہا تھا ''مرتضیٰ بھائی میری بہن بہت حساس ہے۔ وہ آج تک ممی کا
ہیں بھولی۔ اسے کبھی کوئی دکھ مت دیجیے گا۔'' اور اس نے علی سے وعدہ کر لیا تھا۔

''آئیں وہاں بینچ پر بیٹھ جائیں۔'' مرتضیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ وہ یونہی کھڑی روتی رہی تو
نے خود ہی پکڑ کر اسے بینچ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''آپ اللہ سے دعا کریں۔ دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''میرے بھائی کو بلا دیں۔ پلیز میرے علی کو بلا دیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کر رہی تھی۔

''اتنی رات کو اسے پریشان کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں صبح اسے کال کر دوں گا۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

''چاہے تب تک میرے پاپا کو کچھ بھی ہو جائے۔'' وہ روتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخی۔ ''علی تم کہاں ہو دیکھو پاپا بھی ممی کی طرح ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' مرتضیٰ سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ با آواز بلند چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''تابیہ ہوش میں آئیں۔'' مرتضیٰ نے اسے جھنجوڑا تھا۔ وہ ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی ''آپ کو میری بات پر اعتبار ہے؟''

اس نے بے اختیاری میں گردن ہلا دی تھی۔ ''پھر میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ انکل کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اگلے پل وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ مگر اب صرف اس کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔ چیخنا چلانا ختم ہو چکا تھا۔ مرتضیٰ نے اسے ٹوکنے کے بجائے رونے دیا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد جب صرف اس کی سسکیوں کی آوازیں باقی رہ گئیں تو مرتضیٰ نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور بولا ''پانی پینا ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر آنسو صاف کر کے اب وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ مرتضیٰ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

''لیں پانی پی لیں۔'' اس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور پانی پینے لگی۔ دوبارہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

''کب سے خراب تھی انکل کی طبیعت؟'' اس کے سوال پر تابیہ نے جواب دیا تھا۔

''پاپا کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ ہم دونوں تو ٹی وی دیکھ رہے تھے جب۔۔۔'' اس کے حلق میں پھندا لگنے لگا تھا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی سعی کرنے لگی۔ جتنا وہ آنسو کو پیچھے دھکیل رہی تھی اتنا ہی وہ بہے جا رہے تھے۔ مرتضیٰ نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کیے اور بولا ''اب نہیں رونا۔''

وہ اس کی بات پر چپ سی ہو کر بیٹھ گئی تھی ''شاباش Thats like a good girl'' مرتضیٰ نے اسے چیراپ کروانے کی کوشش کی۔ ''آپ تو بہت ہی نالائق ڈاکٹر ہیں۔ جب میری ڈیزائننگ کی ہوئی بلڈنگ گرے گی تو میں کم از کم آپ سے تو یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ آپ زخمیوں کا علاج کر سکیں گی۔ ویسے سچ سچ بتائیں آپ واقعی ڈاکٹر ہیں بھی یا نہیں۔ اب تو مجھے اس بات کی تصدیق کے لیے ڈگری دیکھنی پڑے گی۔'' وہ بڑی شگفتگی سے ہنستے ہوئے بولا تو اس کی بات پر تابیہ کے چہرے پر ایک لمحے کو ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آتے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

''مرتضیٰ پاپا ٹھیک ہو جائیں گے نا؟'' اس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

''ہاں! ان شاء اللہ۔'' اس نے جواب میں یقین دلایا تھا۔

صبح چھ بجے کے قریب ڈاکٹر نے انہیں خوش خبری سنائی کہ پاپا کی حالت خطرے سے باہر ہے اور ان کو پرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ کمرے میں آکر دواؤں کے زیر اثر بے خبر سوئے ہوئے پاپا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دوبارہ برسات ہونے لگی تھی۔

''میرے خیال سے یہ وقت خدا کا شکر ادا کرنے کا ہے نا کہ بیٹھ کر رونے کا۔'' مرتضیٰ نے پاپا کے بیڈ کے پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ خود کو سرزنش کرتی وضو کرنے چلی گئی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے پاپا کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے ایک دو بار خیال آیا بھی کہ اس کی وجہ سے مرتضیٰ ساری رات تھکا ہے اور اب اسے گھر جانے کے لیے کہہ دینا چاہیے۔ مگر وہ ایسا کہہ نہیں پائی اس کے ہونے سے ایک ڈھارس سی بندھی ہوئی تھی۔ اگر یہ ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔

اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بے شمار رشتے داروں، ملنے والوں اور دوستوں میں سے کسی سے مدد مانگنے کے بجائے آخر اس نے مرتضیٰ کو کیوں بلایا تھا۔ اس سے تو آج تک وہ کبھی ڈھنگ سے ملی بھی نہیں تھی۔ مصیبت کے وقت تو انسان اسے پکارتا ہے جس پر اسے سب سے زیادہ بھروسہ ہو۔ کیا وہ مرتضیٰ پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتی تھی؟ اسے لگا جس قلعے کے فتح ہو جانے کا ڈر اسے ہر وقت رہتا تھا کہ کہیں وہ اس قلعے کے دروازے کھول کر اندر نہ آ جائے اس کے دروازے تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے مرتضیٰ کے لیے کھول دیے تھے۔ وہ بغیر کسی جنگ کے ہی جیت گیا تھا۔ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا شاید مرتضیٰ ہی کے لیے کہا گیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے پاپا کو ہوش آیا تھا۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔

''پاپا آپ ٹھیک ہیں نا؟ پاپا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' وہ بیڈ پر بیٹھ کر پاپا کا ہاتھ تھام کر پوچھ رہی تھی۔ جواب میں پاپا نے نقاہت سے بھرپور آواز میں کہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں میری جان۔'' ایک مرتبہ پھر آنکھوں سے آنسو رواں ہونے کے لیے تیار تھے۔ اسے رونے کے لیے آمادہ دیکھ کر پیچھے کھڑا مرتضیٰ اس کے کان میں بولا۔

''خبردار رونا مت۔ انکل کی طبیعت تمہیں روتا دیکھ کر دوبارہ خراب ہو جائے گی۔'' اس کی دھمکی یا نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس نے جلدی سے خود کو نارمل کیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے مرتضیٰ آگے بڑھ کر انکل کی خیریت دریافت کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے آ کر ان کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد تسلی بخش جواب دیا تو وہ اور بھی پرسکون ہو گئی۔ ایک بہت ہی کڑی مصیبت کی رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

''انکل کی طبیعت اب بہتر ہے۔ چلیں گھر چل کر فریش ہوں ناشتا کریں اور انکل کے لیے بھی کچھ کھانے کے لیے لائیں۔'' مرتضیٰ کی بات کی پاپا نے بھی بڑی کمزور اور نحیف آواز میں تائید کی تھی۔ اسے اپنے آپ سے زیادہ پاپا کا خیال تھا ان کے لیے ناشتا بنانے کی خاطر وہ گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

مرتضیٰ کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ ابھی بھی رات کا ہولناک منظر یاد کر رہی تھی۔ اگر مرتضیٰ فوراً نہیں آ جاتا تو پتا نہیں کیا ہوتا۔ وہ دہل رہی تھی۔ گاڑی گھر کے سامنے رکی تو وہ اس سے کہنے لگی۔

"ڈرائیور آ گیا ہوگا میں پاپا کے لیے ناشتا اس کے ساتھ لے جاؤں گی۔" وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ جمائے کچھ برا مان کر بولا۔

"یعنی یہ کہ مجھے اب چلے جانا چاہیے۔"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ آپ کو میری وجہ سے اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتی۔ میں تو صرف اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ آپ رات بھر جاگ کر تھک گئے ہوں گے آپ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔" وہ وضاحت کرنے لگی تھی۔

"صاف کہو تمہارا ارادہ مجھے ناشتا کرانے کا نہیں ہے بہانے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اس کے "تم" پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اس سے بات کر رہا تھا اور وہ جس بات اسے زیادہ حیرت ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کی بے تکلفی اسے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بڑے غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان ذہین آنکھوں سے تو وہ ہمیشہ ہی خائف رہی تھی اس لیے فوراً گاڑی سے اتر گئی تھی۔

وہ بھی گاڑی کا دروازہ بند کرتا اس کے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔ مرتضیٰ کو لاؤنج میں بٹھا کر وہ ا کمرے میں چلی گئی تھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور واپس نیچے آ گئی۔ وہ صوفے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔

"صرف پانچ منٹ میں کسی خاتون کو تیار ہوتے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ اس بات پر دھ سروں میں ہنس پڑی اور بولی۔

"آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟" وہ اس کی خاطر اتنا خوار ہوا تھا تو اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ ا کی اچھی طرح خاطر مدارات کرے۔

"کیا میں یہ امید رکھ سکتا ہوں کہ یہ جملہ میں آئندہ بھی بے شمار مرتبہ آپ کے منہ سے سنوں گا؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اپنی نروس ا گھبرائی ہوئی حالت سے چھٹکارا پانے میں اسے ایک دو سیکنڈ لگے تھے۔ وہ گہری نگاہوں سے ا دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔ کیا لیں گے؟" وہ خود کو سنبھال کر دانستہ اس کی بات نظر انداز کر کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ نے بھی تو جواب نہیں دیا۔" وہ برجستہ بولا تھا۔ فون کی بیل نے اسے اس مصیبت سے نجات دلا دی تھی۔ وہ فوراً فون سننے لگی تھی۔ دوسری طرف علی کی آواز سن کر وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔

"اوہ علی تم! جلدی سے واپس آ جاؤ پاپا کی۔۔۔" مرتضیٰ نے اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ تھا اور اسے گھورتا ہوا خود علی سے بات کرنے لگا تھا۔ ساری بات تفصیل سے مناسب الفاظ میں ا طرح بتائی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ وہ اسے بات کرتا دیکھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر اس نے مرتضیٰ نے نا کیا اور پاپا کے لیے ناشتا لے کر وہ مرتضیٰ کے ساتھ ہاسپٹل چلی آئی۔ اسے چھوڑ کر مرتضیٰ چلا گیا تھا۔

پہلی فلائٹ سے علی واپس آ گیا تھا اور آتے ہی سیدھا ہاسپٹل چلا آیا۔ علی کے آتے ہی وہ بالک پرسکون ہو گئی۔ ہر طرح کی فکر، پریشانی اور سوچ سے آزاد وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ عمر میں اس سے چھ

سہی پر تھا تو ایک مرد۔ مضبوط اعصاب کا مالک ہر طرح کے حالات میں ہمت اور شجاعت سے کام لینے والا۔ اس نے آتے ہی اسے اور پاپا کو سنبھال لیا تھا۔ پاپا کو ان کے اپنے ہاسپٹل میں منتقل کروا کر اس نے بڑے بڑے قابل ڈاکٹرز کا پاپا کے گرد جمگھٹا لگا دیا تھا۔

وہ علی کے گلے لگ کر بہت روئی تھی "علی اگر پاپا کو کچھ ہو جاتا تو میں اسی لمحے مرجاتی۔" وہ اسے اپنے بانہوں میں چھپائے دلاسے دے رہا تھا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ علی کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اب علی کو اس کی پناہ کی ضرورت نہیں بلکہ اسے علی کی پناہ چاہیے۔ وہ اس کا مان تھا اس کا فخر اور غرور۔ اس کے ہاتھ میں پلا وہ اب اس قابل ہو گیا تھا کہ اس کی اور پاپا کی دیکھ بھال کر سکے۔ جن کے جوان بھائی موجود ہوں ان بہنوں کو کبھی بھی فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا تھا۔

شام میں مرتضیٰ اپنے ماما اور ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا۔ پاپا کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ وہ بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ علی اور پاپا کو مرتضیٰ کے ان کے گھر رات آنے اور پھر ساری رات ہاسپٹل میں رہنے کے بارے میں بتا چکی تھی اس لیے پاپا اس کا اور اس کے والدین کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ جتنی دیر وہ لوگ وہاں رہے وہ کچھ کترائی کترائی چپ بیٹھی رہی۔ مرتضیٰ کی طرف دیکھنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ کتنی آسانی سے ان دونوں کے بیچ موجود اجنبیت کی دیوار گر گئی تھی۔ وہ ابھی تک حیران تھی کہ یہ ہوا کیا ہے؟

پاپا تین دن ہاسپٹل میں رہے تھے۔ چوتھے روز ان کو ڈسچارج کیا گیا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ مریض بننا کتنا مشکل ہے اس بات کا اندازہ انہیں ان تین چار دنوں میں ہوا تھا۔ علی جب سے واپس آیا تھا آفس نہیں گیا تھا اور مرتضیٰ بھی اس روز کے بعد سے دوبارہ نہیں آیا تھا۔

تائبہ نے ایک دو بار اس کے بارے میں سوچا کہ وہ آیا کیوں نہیں؟ شام میں وہ اور علی لان میں گھاس پر بیٹھے Hang man کھیل رہے تھے۔ بچپن میں وہ دونوں یہ گیم بہت کھیلا کرتے تھے۔ آج اچانک علی کو بچپنا سوجھا تھا اور وہ لوگ کھیلنے لگے تھے۔ پاپا اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔

لان کی طرف آتے مرتضیٰ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر قوس وقزح کے تمام ہی رنگ بکھر گئے تھے۔ کیا کسی ایک آدمی کی موجودگی یا غیر موجودگی اتنے معنی بھی رکھ سکتی ہے اس نے خود سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلے رنگوں کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" مرتضیٰ ان لوگوں کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔

"Hang man کھیل رہے ہیں ہم لوگ آپ بھی ہمارا گیم انجوائے کریں۔ بس میں جیتنے ہی والا ہوں۔" علی نے مرتضیٰ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بچپن میں ہم بہن بھائی بھی بہت کھیلا کرتے تھے۔" مرتضیٰ نے تائبہ اور علی کے درمیان گھاس پر رکھے پیپر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بس پری اب میرا خیال ہے وہ ڈرا کر دیں۔"

"غلطی کی تو اب ویسے بھی آپ کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بے چارہ Man تقریباً Hang ہو ہی چکا ہے۔" علی نے پین منہ میں دبائے کچھ سوچتی ہوئی تائبہ سے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"V" بولو' مرتضٰی نے تابہ سے کہا۔

"مروائیں گے مجھے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا پیپر پہ نظریں جمائے بولی۔

"مرتضٰی بھائی ہم لوگوں کی شرط لگی ہے اگر پری ہار گئیں تو مجھے آئس کریم کھلائیں گی اور اگر جیت گئیں تو میں کھلاؤں گا۔" علی نے اسے اپنی شرط سے آگاہ کیا۔

"تم "V" بولو تو سہی۔ اگر ہار گئیں تو آئس کریم دونوں کو میں کھلوا دوں گا۔" مرتضٰی نے اسے اکسایا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کیا آپ کی سمجھ میں آ گیا ہے کہ علی نے کیا لفظ پوچھا ہے؟"

"ہاں Vowels تو تم پہلے ہی فائل کروا چکی ہو۔ اسے دیکھ کر ہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ کیا لفظ ہے۔" علی ان دونوں کی بے تکلف گفتگو کو بڑے تعجب سے سن رہا تھا۔

"اچھا علی "V" لکھو' اس کی بات مان کر وہ بولی اور علی نے سب سے پہلے Bland میں "V" لکھ دیا۔

"مرتضٰی بھائی ویسے یہ فاؤل ہے۔ آپ اب اور کوئی لفظ نہیں بتائیں گے۔" وہ مصنوعی خفگی طاری کر کے بولا تھا۔ ورنہ دل تو اس وقت بھنگڑا ڈالنے کا چاہ رہا تھا، کوئی خوشگوار تبدیلی آ چکی ہے یہ بات تو اس نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔ مگر اتنی زیادہ کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ تو مرتضٰی بھائی آخر کار آپ یہ معرکہ جیت ہی گئے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا تھا وہ علی کی سوچوں سے بے نیاز یہ سوچنے میں لگی ہوئی تھی کہ باقی چار خانوں میں کون سے الفاظ آئیں گے۔

"T" بولو۔" مرتضٰی علی کی ناراضگی کو خاطر میں لائے بغیر دوبارہ بولا تو وہ احتجاجاً چیخ اٹھا۔

"کیوں اس میں فاؤل کیا ہے۔ گیم کے رولز اینڈ ریگولیشن میں یہ کہاں طے پایا تھا کہ کسی سے مدد نہیں لے سکتے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"چلو "T" لکھو۔" وہ علی کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی، اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے دو خانوں میں "T" لکھ دیا تو وہ خوش ہو کر بولی' میری سمجھ میں آ گیا ہے اب آخری لفظ آپ مت بتائیے گا۔"

"بڑی جلدی سمجھ میں آ گیا۔" علی نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"P" وہ بڑے یقین سے بولی اور مرتضٰی اس کی خوشی سے دمکتی شکل دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

"بڑا کمال کیا۔ ساری مدد تو مرتضٰی بھائی نے کی ہے۔ علی نے "P" بھی لکھ دیا لفظ Vituperte مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

"پیسوں کا انتظام کر لو میں بہت ساری آئس کریم کھاؤں گی۔" وہ اسے چڑاتے ہوئے بولی تو مرتضٰی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"انکل کہاں ہیں؟" اسے اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو انکل کے بارے میں پوچھا۔

"پاپا کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں ہیں۔" علی نے جواب دیا۔

"ہاں میں انکل کی طبیعت ہی پوچھنے آیا تھا۔ دو تین دن سے آنا ہی نہیں ہوا۔" وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔ چکن اور چیز کے سینڈوچز، اور چائے ٹرے میں رکھ کر وہ واپس لان میں آئی تو مرتضٰی علی سے کہہ رہا تھا۔

"The word no has no exiztance for me"، جب میں

کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔" علی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے آتا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ ان دونوں کے سامنے ٹرے رکھ کر خود بھی سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"واہ میرے فیورٹ چیز سینڈوچز۔" علی نے خوشی سے نعرہ لگایا اور جلدی سے اپنی پلیٹ میں سینڈوچ رکھ کر کھانے لگا۔

"آپ بھی لیں۔" تابہ نے پلیٹ مرتضٰی کے ہاتھ میں پکڑائی۔ تو اس نے بھی سینڈوچ لے لیا۔

"علی ایک بات پوچھوں؟" مرتضٰی نے ڈرامائی انداز میں علی کو مخاطب کیا۔

"جی پوچھیں؟" علی نے کھانے کے دوران جواب دینے کی فرصت نکالی۔ تابہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"کیا تابہ واقعی ڈاکٹر ہے؟" وہ اس کی شرارتی مسکراہٹ سے ہی سمجھ گئی تھی کہ بات اسی سے متعلق ہے۔

"کیوں آپ کو کوئی شک ہے؟" علی کے پوچھنے پر وہ بڑی صاف گوئی سے بولا۔

"صرف شک، مجھے تو یہ بات سو فیصد جھوٹ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ڈاکٹر ہے۔ میں یا تم کم از کم کسی زخمی کی مرہم پٹی وغیرہ تو کر ہی لیتے ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے مریضوں کا علاج کیسے کرتی ہو گی۔" اس کی بات پر علی کا قہقہہ بے ساختہ تھا جبکہ وہ منہ بنائے خاموش بیٹھی تھی۔

"آپ کو کیا پتا ہمارے گھر میں کیسے کیسے سین ہوتے ہیں۔ یہ تو پھر بھی پاپا کا معاملہ تھا اور اپنے ماں باپ کے لیے تو ہر کوئی اموشنل ہوتا ہے یہاں تو یہ حال ہے کہ کسی مریض کی ڈیتھ ہو جائے تو اس دن کھانا نہیں کھایا جائے گا کمرا بند کر کے خوب رونا دھونا مچے گا۔"

"علی!" وہ اس کی باتوں پر چڑ کر تنبیہی انداز میں بولی تھی۔

"لیکن یہ ٹھیک تو نہیں ہے۔ مصیبت میں پریشان ہونا تو بجائے خود ایک مصیبت ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اسے سمجھانے لگا تھا۔

"رہنے دیں مرتضٰی بھائی۔ یہ تمام باتیں پاپا اور میں انہیں بہت دفعہ سمجھا چکے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں۔" علی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"آپ لوگ کیا اس وقت مجھے ڈسکس کرنے بیٹھے ہیں۔" وہ ناراض ہو گئی تھی۔

"آپ کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔" مرتضٰی نے بردباری سے کہا۔

"میں بگڑی ہوئی ہی ٹھیک ہوں۔" وہ واک آؤٹ کے ارادے سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"پری ناراض ہو کر تو مت جائیں۔" علی نے اسے منانے کی کوشش کی۔

"ہاں fairy آپ بیٹھ جائیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بیٹھنے کے بجائے اسے کھڑی ہوئی گھورتی رہی۔

"یہ اسی نے تمہیں کہا ہو گا کہ مجھے پری کہا کرو۔ پتا نہیں لڑکیوں کو اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی کیوں ہوتی ہے۔" وہ اسے چڑا رہا تھا اور وہ واقعی چڑ بھی گئی تھی۔ علی مسلسل مسکراتا ہوا کبھی اسے اور مرتضٰی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندر جاتے دیکھ کر علی نے روکا تھا مگر وہ رکنے کے بجائے یہ کہتی ہوئی اندر چلی

ے الجھتے، لڑتے وہ تنگ آ گئی تو تمام سوچیں ذہن سے جھٹکتے وہ علی کے کمرے میں آ گئی۔ کچھ نہیں ں سے باتیں کر کے وہ تھوڑی فریش ہی ہو جائے گی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو تر پر اوندھا لیٹا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اپنی باتوں میں مگن اسے اس کے اندر آنے کا پتا ہی ا چلا تھا۔ وہ بڑا ابھر پور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"مان گئے آپ کو مرتضیٰ بھائی۔ جو کام آج تک کوئی نہیں کر سکا وہ آپ نے کر دکھایا۔" وہ اس کی بات کے جواب میں بولا تھا۔

"ہاں اس وقت لان میں یہاں سے وہاں مارچ پاسٹ ہو رہا ہے۔ ویسے بے فکر رہیں فیصلہ پ ہی کے حق میں ہوگا۔" وہ بڑے مزے سے بولا۔

"دعائیں دیں مجھے اگر پہلے ہی وقت اپنا پرپوزل بھجوا دیتے اور جواب میں وہی سب ہوتا جو ے پہلے اوروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے پھر میں پوچھتا کہ لفظ No سننا کیسا لگتا ہے۔"

کوئی عمارت جیسے پوری کی پوری اس پر گر پڑی تھی۔ وہ اس کے ملبے کے نیچے دبی سسک رہی ا۔

"آپ کو خود ہی شوق ہے مشکل کام کرنے کا۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا۔ یہ آپ کی زندگی کا کل ترین پروجیکٹ ہے۔ اس سے کہیں آسان تو اہرام مصر کی ڈیزائننگ رہی ہوگی۔" کب کے سنے لوں کا مطلب آج اس پر واضح ہو رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف علی اس کی آمد سے بے خبر اپنی باتوں میں مروف تھا۔

"ہاں جی کیا بات ہے آپ کی۔ آپ اپنے چیلنج میں جیت گئے میں ہار گیا۔ لیکن یہ ہار مجھے بہت ش کر رہی ہے۔ اس جگہ ہار جانے کی تو میں کب سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

ویسے آپ ہیں بھی تو بڑے مستقل مزاج۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو کب کا میدان چھوڑ کر بھاگ تا۔" علی نے سیدھے ہو کر لیٹتے ہوئے کہا تو سامنے کھڑی تابہ کو دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کے چہرے پر موجود تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔

"مرتضیٰ بھائی میں آپ کو بعد میں کال کروں گا۔" اس نے پریشانی کے عالم میں ریسیور رکھا تھا۔

"آ ئیں پری بیٹھیں۔" وہ ڈرتے ہوئے بولا۔ وہ ایک ایک قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی تھی۔ ں بوکھلاہٹ میں بستر سے اتر گیا تھا۔

"میں نے تمہیں جنم نہیں دیا مگر ماں بن کر پالا تو تھا۔ میرے ہاتھوں میں پل کر آج تم اس قابل دیکھے ہو کہ مجھے چیلنج بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کر سکو۔ میرے اوپر شرطیں لگا سکو۔" وہ کسی صدمے کے زیر اثر ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ لہجے میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔

"پری آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے بائی گاڈ۔" وہ بڑی عاجزی سے بولا تھا اور جواب میں اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے اپنی اس بہن کو دیکھ رہا تھا جس نے کبھی اسے اونچی آواز میں ڈانٹا تک نہیں تھا۔

"علی مجھے تم سے سخت نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ پتا نہیں آج کے بعد میں کسی پر اعتبار کر سکوں گی یا نہیں اور آج کے بعد کون ہوگا جس پر میں فخر کروں گی۔ جو میرا مان غرور ہوگا۔ علی تم نے مجھے میری اپنی

گئی تھی۔ "مجھے پاپا کے لیے سوپ بنانا ہے۔"

☆☆☆

وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے جب کریم بابا نے مرتضیٰ کے ڈیڈی کے فون کا بتایا۔ وہ پاپا سے بات کرنا چاہتے تھے۔ پاپا اٹھ کر بات کرنے کے لیے چلے گئے۔ تین چار منٹ بعد پاپا کی واپسی ہوئی تو علی بولا۔ "خیریت انکل کو آپ سے کیا کام پڑ گیا؟"

"وہ اور ان کی مسز آج شام ہمارے ہاں آنا چاہ رہے ہیں۔ وہی پوچھ رہے تھے کہ میں بزی تو نہیں ہوں۔" پاپا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ایک دم سر جھکا گئی تھی۔ پاپا یا علی سے نظریں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بچی تو نہ تھی کہ یہ بات نہ سمجھ پاتی کہ وہ لوگ کیوں آنا چاہتے ہیں؟ علی نے پاپا کے جواب پر ایک معنی خیز نگاہ بہن کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی تھی اور بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

اس طرح تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ابھی اپنے دل پر گزرنے والی اس تازہ ترین واردات ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی۔ اسے بھی سوچے سمجھے بغیر محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کرتے کرتے بالآخر اس کے آگے ہار گئی تھی مگر اس سے آگے ابھی اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اس مسئلے کا حل سوچ رہی تھی۔ وہ پاپا اور علی کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔ اس بات کے لیے وہ خود کو کیسے آمادہ کر سکتی تھی۔ تو کیا وہ مرتضیٰ سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔ اس کا دل دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک پاپا اور علی کا طرف دار تھا تو دوسرا مرتضیٰ کا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے کسی کو بھی نہیں چھوڑنا پڑے۔ وہ تمام لوگ جن سے وہ پیار کرتی ہے وہ سب ایک ہی وقت میں اسے مل جائیں۔ وہ ایک محبت پانے کے لیے دوسری محبت کھونے کا حوصلہ خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اپنے اندر چھڑی یہ جنگ اسے نڈھال کر رہی تھی۔ دونوں میں سے جس کسی کے حق میں بھی وہ فیصلہ کرتی، دکھ تو اسے ملتا۔ وہ کیسے چھوڑ دے اور کسے اپنائے۔ وہ کس سے مدد مانگے۔ اسے بتائے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کسی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔

شام میں آنٹی اور انکل ان کے گھر آئے تھے۔ پاپا اور علی نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے خود کو تمام صورت حال کے لیے تیار کرتی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ آنٹی اور انکل نے حسب سابق بڑی محبت اور شفقت سے اس کا حال احوال دریافت کیا تھا۔ وہ بمشکل چار پانچ منٹ وہاں بیٹھ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر وہ لوگ کتنی دیر بیٹھے اور کب گئے وہ اس بات سے انجان اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پاپا اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔ وہ جو فیصلہ کرے گی وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اسے اس بات کا سو فیصد یقین تھا۔ مگر وہ فیصلہ کرے کیا؟ پاپا جب اس کی رائے پوچھیں گے تو وہ کیا جواب دے گی؟ وہ اس مقام پر آ کر خود کو جتنا بے بس محسوس کر رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اکیلی کتنی ہی دیر تک لان میں واک کرتی رہی تھی۔ اپنے

ہی نظروں میں گرادیا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرانا چاہا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چیخی تھی۔

''اتنی ہی بوجھ لگنے لگی تھی میں تمہیں تو تم مجھ سے کہتے۔ میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جاتی کبھی اپنی شکل تک نہیں دکھاتی۔ مگر یوں مجھے ذلیل کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا تھا۔''

''پری پلیز میری بات تو سنیں۔ مجھے میری بات کی وضاحت تو کرنے دیں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اس کے سامنے خود کو بے قصور ثابت کرے۔ وہ جیسا نہیں تھا ویسا ثابت ضرور ہو رہا تھا۔ جسے دکھوں سے بچانا چاہتا تھا، جس کے لیے ساری دنیا کی خوشیاں اکٹھی کرنا چاہتا تھا وہ بری طرح اس سے بدگمان ہو چکی تھی۔

''بھائی تو بہت غیرت والے ہوتے ہیں۔ بہن کے لیے جان تک دے دیتے ہیں۔ تم کیسے بھائی ہو۔ لیکن بے فکر رہو میں تمہاری ساری پریشانی دور کروں گی۔ جو بھی وجہ ہو لیکن تم مجھ سے بے زار ہو چکے ہو۔ تو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ تمہارے مرتضیٰ صاحب سے تو نہیں لیکن ان کے علاوہ کسی سے بھی شادی کر کے میں تمہیں اپنی منحوس صورت آئندہ کبھی نہیں دکھاؤں گی۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''پری ایسا نہیں ہے میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں، وہ اپنے آنسوؤں پر بڑی مشکلوں سے قابو پا کر بولا تھا۔

''آج سے پہلے مجھے بھی یہی خوش فہمی تھی کہ میرا بھائی جسے میں نے ماں اور بہن دونوں کا پیار دیا ہے وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ میں اس کی ماں نہ سہی پر ماں جیسی ضرور ہوں۔'' وہ اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح سہم گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے اپنے رویے کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہے مگر اچانک ہی الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ گم صم سا کھڑا رہ گیا تھا اور وہ اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

''پری میں آپ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہوں۔ کیسے یہ بات آپ کو بتاؤں۔ آپ کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔ پلیز میرا اعتبار کریں۔ کیا آپ کا بھائی ایسا ہو سکتا ہے۔'' وہ رو پڑا تھا۔

صبح وہ صرف پاپا کی وجہ سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ساری رات روتے سسکتے گزار کر وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو پاپا اور علی دونوں ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر علی کے چہرے پر ڈالی وہاں اداسی اور گہرا ملال چھایا نظر آیا۔

''علی محبت تو تم سے ہمیشہ کروں گی کہ یہ میری مجبوری ہے۔ تمہاری محبت میری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔ مگر اب شاید میں کبھی تم پر اعتبار نہیں کر سکوں گی۔ تم نے میری انا میری خودداری اور میری نسوانیت کا خون کیا ہے۔ اعتبار قائم کرنے میں برسوں لگتے ہیں اور ٹوٹنے میں صرف ایک لمحہ۔ میرا وہ بھائی جسے میں نے گودوں میں کھلایا تھا۔ اس نے اس طرح میری تحقیر کی ہے کہ اب میں خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی۔ علی تم نے ایسا کیوں کیا؟''

وہ خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی۔ علی نے برائے نام ناشتا کیا تھا۔ پاپا نے دونوں کے چہروں پر چھائی اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کبھی نہیں لڑے تھے۔ مگر اس وقت ایک دوسرے سے نظریں چرائے شاید صرف ان کی خاطر ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ ان دونوں سے اس بارے میں پوچھتے پوچھتے چپ ہو گئے۔ ان کے بچے بہت سمجھدار ہیں۔ وہ اپنے تمام مسائل خود ہی بہت اچھی طرح حل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ جو بھی بات ہے وہ خود ہی سے مل بیٹھ کر کلیئر کر لیں گے۔ ان کے درمیان کسی بھی قسم کا کمیونیکیشن گیپ نہیں ہے۔ انہوں نے حتمی طور پر یہی سوچا تھا۔ ناشتے کے بعد علی اس کے کمرے میں آیا تھا۔

''پری!'' اس نے بڑی لجاجت سے اسے پکارا تھا۔

''علی! میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کے دو ٹوک اور سرد لہجے میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ وہ کانپ اٹھا تھا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی وہ ایک مایوس نگاہ اس پر ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ سارا دن اسی طرح گزر گیا تھا۔ علی کی التجائیہ نظریں اس کا غمزدہ چہرہ کوئی بھی چیز اس کا دل پسیجنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔

اگلے روز جب وہ ناشتے کے بعد آفس کے لیے تیار نہ ہوا تو پاپا نے اس سے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا آفس نہیں جاؤ گے؟''

''پاپا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید کچھ بخار بھی ہو رہا ہے۔'' علی کی بات پر تابہ نے اسے دیکھا وہ ایک دن میں برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ وہ دل کو کڑا کر کے اس کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگی۔ پاپا نے ہاسپٹل جانا دوبارہ شروع کر دیا تھا سو وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد علی اپنے کمرے میں بند ہو گیا اور وہ اکیلی گھر میں ادھر اُدھر پھرتی رہی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام ہو رہی تھی پاپا کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا اسی لیے وہ خود کو فریش کر کے پاپا کا انتظار کرنے لگی۔ لان چیئر پر بیٹھی وہ خالی الذہنی کے عالم میں گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جب اس نے مرتضیٰ کو اندر آتے دیکھا۔ اس شخص سے وہ آئندہ کبھی بھی نہیں ملنا چاہتی یہ بات تو اس نے پرسوں رات ہی سوچ لی تھی۔ اسے اسی طرف آتے دیکھ کر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی والی تھی کہ وہ اس کے پاس آگیا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کی شرمندگی یا ندامت رقم نہیں تھی۔ یا تو اسے کچھ معلوم ہی نہیں وہ جانتا ہی نہیں کہ اسے سب پتا چل چکا ہے یا پھر وہ بہت ہی ڈھیٹ اور بے غیرت انسان ہے۔ تابہ نے دل میں سوچا تھا۔

''کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟'' وہ ناراض انداز میں گویا ہوا تھا۔

''وہ تو میری علی سے فون پر بات ہو گئی تو مجھے پتا چلا۔ تابہ یہ سب کیا ہے؟'' وہ اس کی دیدہ دلیری پر جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔ ''آپ یہاں کیوں آئے ہو؟''

"What ever you planned to har done" جائیے جا کر اپنی فتح کا جشن منائیے۔ آپ سے بڑا چیلنجر بھلا اور کون ہوگا۔ میں آپ کو چیلنج لگی اور آپ ٹھہرے فاتح عالم آپ نے مجھے تسخیر کر لیا۔ دنیا کی سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں میں بھی مختلف تو نہ تھی جھوٹی باتوں اور پرفریب محبت کے جال میں پھنس جانے والی۔ جائیے جا کر خوشیاں منائیے آپ نے ایک ایسی لڑکی کو

اپنے قدموں میں جھکالیا ہے جو آپ کو مقابلے کی دعوت دے رہی تھی۔ میں بھی انہیں عام سی لڑکیوں کی کیو میں کھڑی ہوں جن کے ساتھ آپ وقت گزاری کرتے ہوں گے اور۔۔۔" اس کی بات مرتضیٰ کی چیختی ہوئی آواز نے کاٹ دی تھی۔

"It is enough taeba" وہ ہاتھ اٹھا کر اسے وارننگ دے رہا تھا۔ چہرے پر غیظ وغضب کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ کڑی نظروں سخت تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اپنا غصہ بڑی مشکلوں سے کنٹرول کر رہا ہے۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟ کوئی دیوی کوئی سپر وومین۔ کون ہو آخر تم کہ تم سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اور دوسرے سب غلط ہیں۔ تم اپنے نکتہ نظر سے ہر کسی کے بارے میں سوچو گی اور فیصلے کرو گی۔ جو تم سوچو گی وہ سب صحیح ہوگا اور باقی دوسرے سب جھوٹے ہیں سازشی ہیں۔ تابیہ شعیب مجھے یہ بات کہہ لینے دو کہ تم خود کو دوسروں سے بلند ایک آفاقی مخلوق سمجھتی ہو تم محبت اپنے لیے کرتی ہو۔" وہ اس پر اپنی غصے سے بھری نگاہیں جما کر بولا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر دھکیل کر بٹھا تا وہ بھی اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"تم بہت اچھی ہو، دوسروں سے مختلف ہو۔ تم اپنی خوشیاں فراموش کر کے اپنے باپ اور بھائی کے لیے قربانیاں دے سکتی ہو۔ اپنی زندگی تج سکتی ہو۔ دوسروں کی طرح یہ بات میں بھی مانتا تھا مگر اب نہیں مانتا۔ انکل اور علی سے تمہاری بے تحاشا محبت دراصل تمہاری خود اپنے آپ سے محبت ہے۔ دوسروں کو اپنا زیر بار رکھنا کہ وہ کبھی بھی تمہارے احسانات کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔ تمہاری قربانیاں تمہاری محبتیں ان سب سے مجھے غرور کی بو آتی ہے جن پر تم یہ احسانات کر رہی ہو کبھی ان سے تو پوچھو کہ انہیں تمہاری قربانیاں درکار بھی ہیں یا نہیں۔ وہ تمہارے احسانوں کا بوجھ اٹھانا بھی چاہتے ہیں کہ نہیں۔" وہ مرتضیٰ کے جملوں پر ششدر بیٹھی تھی۔ وہ اسے اس کی اپنی ہی بہت بدصورت شکل آئینے میں دکھا رہا تھا۔

"کیا جانتی ہو تم؟ کچھ بھی نہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انکل کی بیماری کا سبب کیا ہے؟ وہ اس طرح ٹوٹ کیوں گئے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے۔ انہیں دن رات تمہاری فکر کھائے جاتی ہے۔ ان کی بیٹی اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک پرسکون ازدواجی زندگی گزارے۔ یہی ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لیے وہ تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ تمہاری سونی زندگی انہیں دکھوں کے سمندر میں دھکیل رہی ہے اور علی! جانتی ہو وہ کیا کہتا ہے تمہارے بارے میں۔ مگر تم کیسے جان سکتی ہو تم تو سب سے اعلیٰ وارفع بہت اونچی مسند پر چڑھی بیٹھی ہو۔" وہ بڑی بے رحمی سے اس کی شخصیت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے لفظوں پر کانپ گئی تھی۔

"تمہیں چاہے میری یہ باتیں بہت بری لگ رہی ہوں مگر آج میں تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ بہت دعویٰ ہے تمہیں انکل اور علی سے محبت کا۔ بولو کتنا جانتی ہو تم انہیں؟" وہ کچھ بھی بولے بغیر آنکھیں پھاڑے غیر یقینی کے عالم میں بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ اسے شاید خود ہی اپنے لفظوں کی سختی کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے لہجے کو قدرے نرم کرتا ہوا بولا "میں نے بہت دنیا گھومی ہے۔ بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں بہت سوں سے دوستی بھی ہوئی مگر محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی۔ مگر جب تم ملیں تو میرے دل

ہی دی یہی ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو بیٹی اور بہن بن کر محبتوں کے خزانے ہے وہ جب کسی کی بیوی بن کر ایسی ہی بے مثال محبت اور چاہت کا اظہار کرے گی تو کتنی حسین شخص کتنا خوش قسمت ہوگا۔ جسے ایسی ہم سفر ملے گی اور کیا وہ خوش قسمت انسان میں نہیں ؟ یہ تمام باتیں تم سے محض دوسری ہی ملاقات میں، میں نے سوچ ڈالی تھی۔ صرف کسی کو جھکانے یا نے کے لیے محبت نہیں کی تھی میں نے میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا تھا مگر اس سے بھی پہلے میں یہ لی سے کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ تمہارے گھر آنا اور تم سے ملنا علی ہی کے توسط سے ہوا تھا۔ میں اس و بہت بڑی بددیانتی سمجھتا تھا کہ علی کے حوالے سے تمہارے گھر آؤں اور اس کے علم میں لائے یں کسی اور حوالے سے دیکھوں یا سوچوں۔ میں نے اپنا پرپوزل علی کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا ب میں نے اپنی خواہش کا اظہار اس سے کیا تو بحیثیت ایک بھائی کے اس نے اس رشتے کو قبول ا۔ میں نے رشتہ بھجوانے کی بات کی تو اس نے مجھے روک دیا اور پھر علی نے مجھے تمہارے بارے ہت سی باتیں بتائیں۔ یہی کہ تم نے اس کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں اس کے لیے اپنا بچپن شوق اور اپنی ہر خواہش پس پشت ڈال دی اور اب بھی محض اس کی اور پاپا کی وجہ سے شادی کرنے نکاری ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ دن اس کی زندگی کا خوب صورت ترین دن ہوگا۔ جب وہ ہن کو دلہن بنا کر اپنے ہاتھوں سے رخصت کرے گا۔ وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے تم شاید کبھی اس کا ہ بھی نہیں کر پاؤ۔ اس نے مجھے بتایا کہ شادی کے لیے تم کسی کی بات نہیں مانتیں اور اس وقت میں ں کو یقین دلایا کہ میں تمہیں منالوں گا۔ تم اپنے باپ اور بھائی کی خواہش کے مطابق ایک نارمل ا گزارو گی۔ ان تمام باتوں کو اگر تم پلان کہتی ہو تو ہاں یہ پلان ہی تھا۔ مگر اس سارے قصے میں ہم ے کسی نے بھی تمہاری تضحیک نہیں کرنی چاہی تھی۔ ہم تمہیں تمہاری خامیوں کا احساس دلائے بغیر ا تبدیلی لانا چاہتے تھے۔" وہ ایک لمحے کو رکا تھا۔ اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ دوبارہ بولا۔

"تمہیں پتا ہے کہ تمہاری وجہ سے علی اپنی محبت سے دستبردار ہو گیا۔ مناہل اس کی کلاس فیلو جسے وہ پسند کرتا ہے محض تمہاری وجہ سے وہ اس سے قطع تعلق کر گیا۔ اس کے ماں باپ اس کا کہیں اور رشتہ ر رہے ہیں اور علی میرے سمجھانے کے باوجود کسی بھی قسم کی پیش قدمی کے لیے تیار نہیں۔ جب تک ی زندگی میں سیٹ نہ ہو جاؤ وہ خود پر ہر طرح کی خوشیاں حرام کر چکا ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ علی ں عمر میں اتنا سنجیدہ اور میچور کیوں ہو گیا ہے؟ اسے ہر لمحہ تمہاری فکر رہتی ہے۔ یہ احساس رہتا ہے کہ پنے حصے سے بہت زیادہ محبت اس پر نچھاور کر چکی ہو اور پتا ہے آج فون پر وہ مجھ سے روتے ہوئے ہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا "مرتضیٰ بھائی پری کے ہر دکھ کی وجہ میں ہی ہوں۔ میں پیدا ہوا اور پری سے ہن گئیں۔ کاش میں مر جاتا اور ممی بچ جاتیں پھر پری ایسی نہ ہوتیں۔ وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ا خوش وخرم اور مطمئن۔ کاش میرے بس میں ہوتا میں ساری کائنات کی خوشیاں اکٹھی کر کے اپنی ی جھولی میں ڈال دیتا۔" وہ مرتضیٰ کے منہ سے علی کے کہے ہوئے جملے سن کر رو پڑی تھی۔

"تابیہ خود کو بدلو۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو تم سے پیار کرتے ہیں جنہیں تمہاری پروا ہے۔ ا میں گیو اینڈ ٹیک اچھا لگتا ہے تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ صرف تم ہی دیے جاؤ اور دوسرے تم سے لیے ں۔ انکل، علی اور میں ہم سب تم سے پیار کرتے ہیں۔ اپنے پیاروں کے لیے خود کو بدل ڈالو ورنہ تم

اکیلی رہ جاؤ گی۔" مرتضیٰ نے اس کی طرف جھک کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دیوی کی پوجا کی جاتی ہے ان سے محبت نہیں کی جاتی۔ تم نادانستگی میں دیوی ہی بننے کی کوشش کرنے لگی ہو اپنے پجاریوں کو دان کرنا دیوی دیوتاؤں کا ہی شیوہ ہوتا ہے۔ مگر تم نے کبھی سوچا کہ دیوی دیوتا کو مورتی بنا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ ان کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی اکیلی رہ جاؤ گی۔ کچھ وقت گزرے گا علی کے لیے تمہاری محبت صرف ایک احسان بن کر رہ جائے گی ایسا احسان جس کا بدلہ وہ کبھی نہیں چکا سکتا۔ وہ ہمیشہ تم سے جھک کر ملے گا یہ احساس ساری زندگی اسے کچوکے لگا رہے گا کہ تمہاری زندگی کی بربادی کا ذمہ دار وہ ہے۔ اس کے دل میں تمہاری محبت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ صرف ایک دیوی وہاں براجمان ہوگی جس کی وہ پرستش کیا کرے گا۔ مگر جس سے وہ شاید اس وقت محبت نہیں کرتا ہوگا۔ وہ خود کو تمہارے مقابلے میں اتنا چھوٹا اتنا حقیر سمجھنے لگے گا کہ وہ خود کو تم سے محبت کرنے کا اہل نہیں سمجھے گا۔" مرتضیٰ نے اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"میری باتوں پر غور کرنا۔ میں تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر رہا مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ سچائی کا سامنا کرو۔ تم کہاں پر غلط ہو اس بات کا فیصلہ کرو۔" مرتضیٰ نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی ذات کے حصار میں قید اس نے یہ بات تو کبھی سوچی ہی نہیں کہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ ان جانے میں کتنے لوگوں کے دکھوں کا سبب تھی۔ پاپا اس کی وجہ سے پریشان تھے اور علی اس کی خاطر اپنی خوشیوں کی قربانی دے رہا تھا۔ اور وہ کتنی خود غرض تھی ہمیشہ اپنے دل کی مانتی رہی کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں اور علی میرا پیارا بھائی اسے میں نے کتنا ہرٹ کیا۔ علی کا خیال آتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھ کر بھائی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ساری سختی ساری ناراضگی غائب ہو چکی تھی اب صرف یہ خیال باقی تھا کہ وہ اداس ہے اکیلا ہے۔ میری خفگی اسے پریشان کر رہی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو وہ تکیے میں منہ دیے پڑا تھا۔ پورا کمرا اندھیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ نہیں چونکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تمام لائٹس آن کر دیں علی نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھنا چاہا تو سامنے کھڑی تابعہ کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"پری آپ؟" وہ جواب میں کچھ بھی کہے بنا آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"پری آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ اس کے رونے پر ہراساں پوچھ رہا تھا۔ تابعہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔

"علی میری جان میرے چندا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔ تم پر ہاتھ اٹھایا۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ دیوانگی کے عالم میں اسے پیار کر رہی تھی اس کے ہاتھ چوم رہی تھی۔

"پری آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ مگر میرا یقین کریں

ے میں۔ میں نے کہیں بھی آپ کی انسلٹ نہیں کرنی چاہی تھی۔" وہ بڑے دکھ سے بولا تو تابعہ ے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سب پتا ہے مجھے تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تم بس مجھے معاف کر دو۔"

"آپ اس طرح معافی مانگ کر مجھے اذیت تو مت دیں۔ آپ مجھ پر ہر طرح کا حق رکھتی ہیں۔ ے اور ماریں جتنا دل چاہے مار لیں گر آئندہ کبھی مجھ سے خفا مت ہوئیے گا۔ آپ کی خفگی میں سہہ نا۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز پر تابعہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ آنسوؤں پر بند باندھ رہا ں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ بچپن میں اسے چھپا لیا ی۔

"علی مائی سوئیٹ ہارٹ میری جان۔" وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کی گود میں لیٹا رہا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

"پری آپ کو مجھ پر بھروسا ہے نا۔ آپ اب تو مجھ سے ناراض نہیں؟" علی نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں علی تم پر تو مجھے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اعتماد ہے۔ مرتضیٰ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے یہ یرا بھائی اب اتنا بڑا تو ہو ہی گیا ہے کہ مجھ سے باتیں چھپانے لگا ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پری وہ سارا پلان مرتضیٰ بھائی کا تھا۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھا تھا۔ وہ اس کی ناسمجھی پر ہنس پڑی۔

"پتا ہے پری جب میں پہلی بار مرتضیٰ بھائی کی فرم میں گیا اور وہاں میری ان سے ملاقات ہوئی ا دیکھ کر میرے دل میں کیا خیال آیا تھا۔" وہ کوئی بات یاد کر کے بولا تھا۔

"کیا خیال آیا تھا؟"

"میرے دل نے کہا تھا کہ میرے بہنوئی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے پھوپھو کے فیضان ے فواد اور عاصم اور دوسرے بہت سے لوگوں میں سے کسی کو دیکھ کر کبھی بھی میرے دل میں ایسی واہش نہیں جاگی تھی۔ عاصم کے لیے بھی میں نے صرف پاپا کی وجہ سے آپ کو کنوینس کرنے کی ی کی تھی۔ مگر مرتضیٰ بھائی میں کوئی خاص بات تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میری اتنی پیاری اور غیر بہن کے لیے بندہ بھی کوئی ایکسٹرا اورڈنری خوبیوں کا مالک ہی ہونا چاہیے۔ وہ اتنے جینئس، ور ہینڈسم ہیں کہ مجھے ان سے بہتر آپ کے لیے کوئی اور نہ لگا۔ پھر جب انہوں نے مجھے جاب آفر ں نے ان کی آفر صرف اس لیے قبول کر لی کیونکہ میں ان کے قریب آنا چاہتا تھا۔ اس وقت میں ایک بھائی بن کر سوچ رہا تھا مجھے وہ بندہ اپنی بہن کے لیے پسند آ چکا تھا۔ وہ میرے کام سے اور ملاحیتوں سے متاثر تھے۔ مجھے ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے یوں میں دن بدن ان سے ہوتا چلا گیا۔ میں انہیں پہلی مرتبہ ہمارے گھر بھی جان کر لایا تھا اور خدا سے میں نے بہت ما مانگی تھیں کہ کچھ ایسا ہو جائے۔ یہ بندہ میری بہن کا نصیب بن جائے اور خدا نے میری دعاؤں ا کر لیا تھا۔ میں اپنی اس خواہش کا اظہار ان سے کیسے کر سکتا تھا اپنے منہ سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ بہن سے شادی کر لیں مگر میرے کچھ بھی کہے بغیر انہوں نے خود ہی مجھ سے اپنی اس خواہش کا یا کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

علی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بڑی تفصیل سے اسے تمام باتیں بتا رہا تھا۔

''یاد ہے پری وہ دن جب مرتضٰی بھائی نے مجھے ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا اور آپ بڑی مشکوک ہو
تھیں کہ وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ اس رات مرتضٰی بھائی نے آپ سے شادی کی خواہش
اظہار کیا تھا۔ میرے انکار کا تو کوئی جواز ہی نہیں تھا وہ ہر لحاظ سے آپ کے قابل تھے سو میں نے اپ
طرف سے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔'' علی کوئی بات یاد کر کے ہنس پڑا تھا۔ ''شادی سے انکار کر
کے معاملے میں وہ بھی بالکل آپ کی طرح تھے۔ ان کے گھر والے کہہ کہہ کر تھک چکے تھے اور وہ شاد
کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ انہیں کبھی کوئی لڑکی اس حد تک پسند نہیں آ
تھی کہ وہ اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتے۔ پھر جب انہوں نے آپ کا انتخاب کیا اور اپنے گھر والوں
اپنی پسند سے آگاہ کیا تو ان کی ماما نے فوری طور پر آپ سے ملنا چاہا۔ مرتضٰی بھائی نے اپنی یہ پرابل
میرے سامنے رکھی۔ آپ کو ان سے ملوانے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ ایمن کی منگنی پر آپ کو ا
ساتھ لے جاؤں۔ آپ کو اپنی ہونے والی ساس سے پہلی مرتبہ ملنا تھا تو اس کے لیے ڈھنگ سے ت
بھی ہونا تھا۔ وہ جتنی بھی اچھی سہی ہوتیں تو ایک ساس ہی۔ انہوں نے جو اگر آپ کو عام سے حلیے م
دیکھ کر یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا کہ ''خالی اچھی شکل سے کیا ہوتا ہے لڑکی کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں سوہا
موو کرنی نہیں آتی۔ کس فنکشن میں کیسا لباس پہنے یہ پتا نہیں ہے۔'' اسی لیے میں آپ کو خوب اچ
طرح تیار کروا کر لے گیا اور نتیجہ ظاہر ہے بہت اچھا تھا۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے کی پسند وہ بھی اتنی حسین
انہوں نے آپ کو پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا اور مرتضٰی بھائی سے بضد ہوئی تھیں کہ کب ہمارے ہاں ر
لے کر آئیں۔ بڑی مشکلوں سے مرتضٰی بھائی نے انہیں روکا تھا۔'' وہ علی کی مکاریوں پر ہنس رہی تھی۔
''علی تم نے مجھے کتنا بے وقوف بنایا ہے۔ میری ہر بات جا کر مرتضٰی کو بتا دیتے تھے۔ بدتمیز۔''
زبردستی غصہ طاری کرتے ہوئے بولی۔ علی بھی اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔ ''پری مرتضٰی بھائی بہت اچ
ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ بہت ہی پیارے انسان ہیں۔'' وہ شاید یہ سمجھ رہا
کہ مرتضٰی کے خلاف ابھی بھی اس کے دل میں کوئی بدگمانی ہے اسی لیے بڑی سنجیدگی سے اس کی تعر
کرنے لگا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔
''ویسے کیا میں بہت بری ہوں؟'' وہ شرارت سے مسکرا دی۔
''نہیں پری آپ تو سب سے اچھی ہیں۔ آپ سے اچھا تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔''
''کیا منائل بھی نہیں؟'' علی نے ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھی۔
''تم کیا سمجھتے ہو اگر تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے کوئی بات پتا ہی نہیں چلے گی۔ ویسے مجھ سے اچ
مرتضٰی ہی ہیں جن سے تم اپنے دل کی ہر بات شیئر کر لیتے ہو۔'' وہ جان بوجھ کر ادا س شکل بنا کر بو
علی کی جان پر بن گئی۔
''میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ خود ہی سمجھ گئے تھے۔ منائل ایک آدھ مرتبہ آفس آئی
نہیں مرتضٰی بھائی کو کیسے پتا چل گیا میں نہیں جانتا۔ بعد میں انہوں نے بڑی آسانی سے سب کچ
سے اگلوا لیا۔'' وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''ویسے وہ ہے کیسی؟'' اس نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''پری وہ آپ کی جیسی ہے۔ مجھے اس میں جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی۔ وہ آپ کی
رح ہے۔ بالکل آپ کی طرح نرم، محبت کرنے والی طبیعت کی مالک۔ اتنے آرام سے ہر کسی کو اپنی
نابیں، اسائنمنٹ اور لیکچرز دے دیا کرتی تھی چاہے مانگنے والا کوئی بھی ہو اور چاہے خود اسے ان
زوں کی کتنی ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔''
''تم بھی اس سے چیزیں لیا کرتے تھے؟'' وہ بڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلومات
مل کر رہی تھی۔
''نہیں میں تو خیر نہیں لیتا تھا۔ مگر اس کی اس حرکت کو بغور دیکھا ضرور کرتا تھا۔'' وہ اطمینان سے
ا۔
''علی تم نے مجھے اس کے بارے میں کبھی بتایا کیوں نہیں۔'' وہ شکوہ کرنے لگی۔
''پری یقین کریں میری اس کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگی تھی
رشاید اسے بھی میں پسند تھا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ تو مرتضٰی
ئی نے اس بات کو پتا نہیں کیسے بھانپ لیا اور اب تو اس کا رشتہ بھی طے ہونے والا ہے۔'' وہ سر جھکا
ر بولا۔
''ہونے والا ہے ہوا تو نہیں۔ وہ دوسرا جو کوئی بھی ہے میرے بھائی سے زیادہ اچھا تو نہیں ہو سکتا
اس کے ماں باپ مانیں ہی نہیں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
''پری!'' وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا ''علی تم میرے لیے اتنی بڑی قربانی دینے جا رہے
ہ۔ علی مجھ سے اتنا پیار مت کرو میں اس کی مستحق نہیں۔'' وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔ علی نے ایک
ہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
''آپ کو کیا پتا آپ میرے لیے کیا ہیں۔ پری کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ واقعی اتنی زیادہ
ین ہیں یا صرف مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔ ایسا کیوں لگتا ہے جیسے دنیا میں ساری خوب صورتی صرف
پ کی وجہ سے ہے۔'' وہ علی کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔
''چلو چلو جھوٹ مت بولو۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ میں زیادہ خوب صورت ہوں یا منائل۔''
رعلی نے ایک دم جھینپ کر اپنا سر جھکا لیا۔ وہ ایک پیار بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر کھڑی
ئی۔
''علی پاپا سے کہنا کہ مرتضٰی کی ماما کو ہاں کہہ دیں۔'' علی اس کی بات پر خوشی سے چیخ اٹھا تھا۔
''ہرے'' وہ پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی اچانک ہی بڑی حسین ہو گئی تھی۔ ایک پھولوں بھری راہ گزر تھی جس پر وہ اپنے پیاروں
کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہی تھی۔ اتنے تھوڑے سے دنوں میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں رونما
ہو چکی تھیں۔ مرتضٰی کی ماما اسے رنگ پہنا گئی تھیں، علی کی شادی طے ہو گئی تھی سب کچھ بہت دلکش اور

خوش کن تھا۔علی کی شادی کے ایک ہفتے بعد اسے مرتضٰی کے سنگ رخصت ہو جانا تھا اور اس کے ٹھیک ایک مہینے بعد پاپا، علی اور مناہل کو امریکہ فلائی کر جانا تھا۔علی اپنے خوابوں کی تعبیر کے پہلے زینے پر قدم رکھ رہا تھا۔امریکہ میں اسے ماسٹرز کرنا تھا۔پھر وہاں سے واپس آ کر اسے اپنی فرم اسٹیبلش کرنی تھی۔ وہ اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہ تھا۔اسے ابھی اپنا کیریئر بنانا تھا مگر مرتضٰی نے علی کو قائل کر کے ہی دم لیا تھا۔اس نے تائبہ کے کہے بغیر ہی اس کے دل کی بات جان لی تھی وہ جانتا تھا کہ وہ نئی زندگی کی ابتداء اسی وقت پرسکون ہو کر کر سکتی ہے جب پاپا اور علی کا خیال رکھنے کے لیے مناہل آ چکی ہو۔وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی کم تھا۔وہ اس کا کتنا خیال رکھتا تھا وہ کتنا محبت کرنے والا، خیال کرنے والا تھا۔اس پر چاروں طرف سے محبتوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔سب لوگ اس سے کتنا پیار کرتے تھے شکر تھا کہ مرتضٰی نے بروقت اسے اس کی غلطیوں کا احساس دلا دیا ورنہ اگر خدانخواستہ دیر ہو جاتی پھر کیا ہوتا۔جس روز مرتضٰی کی ماما اسے رنگ پہنا کر گئی تھیں اس رات مرتضٰی نے اس سے فون پر کہا تھا۔

تائبہ میری کوئی بھی بات اگر تمہیں بری لگی ہو تو میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔مگر یقین کرو تمہیں ہرٹ کرنا بھی میرا مقصد نہیں تھا۔'' اور جواب میں اس نے کہا تھا۔

''نہیں مرتضٰی مجھے آپ کی کوئی بھی بات بری نہیں لگی۔آپ تو میرے محسن ہیں آپ نے میرے لیے خضر کا کام کیا ہے میری راہنمائی کی ہے۔میں نادانستگی میں دوسروں کو دکھ دینے کا باعث بن رہی تھی۔جن سے میں پیار کرتی تھی ان کو اپنی ملکیت سمجھ کر ان کی اور اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنے لگی تھی۔

اس کی بات پر مرتضٰی بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔

''تائبہ تم بہت اچھی ہو مگر اپنی اچھائی، نیکی اور محبت میں تم بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اسی لیے میں نے تمہیں ٹوکا تھا۔محبت ہو یا نفرت کسی بھی جذبے میں انتہا پسندی اچھی نہیں۔تمہاری یہی سوچ خود تمہیں اور ہم سب کو نقصان پہنچا رہی تھی۔اپنی خوشی کو دوسروں کے لیے قربان کر دینا، دوسروں کے لیے جینا یقیناً عین عبادت ہے مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیے اس بات کی تعلیم تو خود ہمیں ہمارے مذہب نے دی ہے۔ہماری ذات کا بھی تو ہم پر کچھ حق ہے۔''

عید کے فوراً بعد علی کی شادی تھی۔آنٹی اور ایمن نے علی کی شادی کی تیاری میں اس کی بھرپور مدد کرائی تھی۔اس کے لاڈلے بھائی کی شادی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کیا نہ کرے۔عروسی لباس سے لے کر زیورات اور دیگر سامان تک اس نے ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک تیار کی تھی۔

چاند رات کو مرتضٰی کا فون آیا۔

''کل شام میں تیار رہنا۔ہم لوگ کہیں باہر چلیں گے۔'' وہ اس کے اس انوکھے مطالبے پر ششدر رہ گئی۔''لیکن میں کس طرح جا سکتی ہوں۔'' اس نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا جسے مرتضٰی نے خاطر میں لائے بغیر فوراً کہا'' کیوں تم کیوں نہیں جا سکتیں؟''

''عید کا دن ہوگا۔گھر میں اتنا کام اور مہمان وغیرہ۔۔۔۔'' مرتضٰی نے اس کی بات کاٹ دی اور حکمیہ انداز میں کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا، بس تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔''

''پلیز مرتضٰی سمجھنے کی کوشش کریں۔مجھے پاپا اور علی کے سامنے اس طرح جاتے بہت عجیب لگے

گا۔'' وہ بالآخر اصل بات پر آ ہی گئی تھی۔

''عجیب کیوں لگے گا۔میں نے انکل سے پرمیشن لینے کے بعد ہی تم سے کہا ہے۔بس کل شام پانچ بجے میں آ رہا ہوں۔ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا۔'' وہ اسے حکم دے کر فون بند کر گیا اور وہ بے بسی سے سر تھام کر رہ گئی۔

اگلے روز وہ صبح سے کانشس تھی کہ کیا کرے۔مرتضٰی کو ناراض بھی نہیں کر سکتی تھی اور یوں جانا اسے بہت ہی برا لگ رہا تھا۔شام پانچ بجے وہ حسب وعدہ پہنچ گیا اس کی گاڑی کا ہارن پہچان کر وہ کچن میں کھڑے کھڑے ہی کچھ نروس سی ہو گئی۔ایسی صورت حال کا سامنا اس نے کب کیا تھا۔اسے پاپا اور علی کے سامنے اس طرح جاتے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔دو چار منٹ بعد علی کچن میں آ گیا اور بڑی شرارتی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔

''میں حیران ہو رہا تھا کہ ہمیشہ بڑی بی بی رہنے والی خاتون آج اس قدر تیار کس خوشی میں ہیں۔ وجہ اب سمجھ میں آئی ہے۔جائیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''علی فضول بکواس مت کرو۔'' اس نے غصے کا اظہار کیا جبکہ علی اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔اسی لمحے پاپا نے اسے آواز دی تو بڑی دقتوں سے خود کو لاؤنج میں گھسیٹ کر لائی۔ سامنے ہی وہ پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔اسے آتا دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا اور پاپا سے بولا۔

''انکل ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے میں آ جائیں گے۔''

''ہاں ہاں بیٹا آرام سے جاؤ۔'' پاپا نے کھلے دل سے اجازت دی۔جبکہ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔کیا سوچا ہوگا پاپا اور علی نے اس نے باقاعدہ پہلے سے مرتضٰی کے ساتھ پروگرام طے کر رکھا تھا۔وہ دل ہی دل میں مرتضٰی سے خفا ہو گئی۔

''چلیں!'' وہ اب اس سے مخاطب تھا۔وہ یونہی سر جھکائے اس کے پیچھے چلتی پورٹیکو میں آ گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے مرتضٰی نے اس کا پھولا منہ دیکھا تو ہنستے ہوئے بولا۔

''اتنی اچھی تیاری کے ساتھ یہ پھولا ہوا منہ بالکل سوٹ نہیں کر رہا۔''

''آپ نے اتنی بری حرکت کی ہے۔کیا سوچا ہوگا پاپا اور علی نے میرے بارے میں۔'' وہ ناراض لہجے میں بولی تو وہ بے ساختہ بولا۔

''انہوں نے بجائے کچھ سوچنے کے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اب ان کی بیٹی اپنی عمر کے لحاظ سے کچھ نارمل طرح کے کام کرنے لگی ہے۔پچاس ساٹھ سال کی بڑی بننے سے اس نے توبہ کر لی ہے اور اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو خود مڑ کر دیکھ لو۔'' مرتضٰی کی بات پر اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا تو لاؤنج کی گلاس وال سے کھڑے پاپا اور علی ان دونوں ہی کو دیکھ رہے تھے۔دونوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔اس نے اپنی آج تک کی زندگی میں پاپا اور علی کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج نظر آ رہے تھے۔اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر علی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا اور وہ بھی ایک دم مسکرا دی تھی۔مرتضٰی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا وہ بھی بڑے سکون سے اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔اور اندر کھڑے پاپا اور علی نے اس لمحے بڑی شدتوں سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا جس نے تائبہ کو اس کی سوچ کو تبدیل کر کے ان پر احسان عظیم کیا تھا۔اب وہ ان شاء اللہ ایک نارمل زندگی گزارے گی۔فطرت سے

منہ نہیں موڑے گی۔ اب کسی بھی رشتے سے متعلق وہ بے تحاشا جذباتی ہو کر شدتوں سے نہیں سوچا کرے گی اور پاپا کو لگ رہا تھا آج وہ اپنی پیاری حمیرا کے سامنے سرخرو ہو گئے ہیں۔ تابعہ نے اپنی منزل پالی تھی۔ آگے زندگی کا راستہ بڑا ہموار اور پھولوں بھرا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

وہ اک ایسا شجر ہو

سناٹے کو چیرتی ایک فائر کی آواز گونجی تھی اور ساتھ ہی کسی جانور کی خوفناک سی چنگھاڑ بھی سنائی دی تھی اور وہ جو پہلے ہی حواس باختہ تھی ڈری سہمی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی اس اچانک افتاد پر بے اختیار بوکھلا کر اس کے منہ سے طویل و عریض چیخ برآمد ہوئی۔ پھر اس چیخ کا گلا بڑی ہی بے دردی کے ساتھ کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھونٹ دیا اور ساتھ ہی انگریزی میں نہایت ہی سفاک لہجے میں اس سے کہا گیا۔

''خبردار اگر کوئی حرکت کی یا منہ سے آواز نکالی۔ جان سے مار دوں گا۔'' اور وہ بے چاری تو پہلے ہی اتنی سہمی ہوئی تھی مزید کسر اس کے سرد و سفاک لہجے نے پوری کر دی تھی اس سے تو خوف کے مارے گردن موڑ کر یہ تک نہ دیکھا گیا کہ اسے دھمکانے والا جلاد آخر ہے کون۔ وہ بدستور اس کے منہ پر ہاتھ رکھے اسے گھسیٹتا ہوا دو چار قدم پیچھے ہٹا اور پھر اسے کچھ دور لا کر زمین پر پٹختا ہوا بولا۔

''بغیر کوئی آواز نکالے یہاں بیٹھی رہو۔ پہلے ہی میرا سارا پلان چوپٹ کر دیا ہے۔ اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو چھوڑوں گا نہیں۔'' آنلہ بے چاری تو اتنی سخت اور کھردری زمین پر اپنے پٹخے جانے پر بازوؤں سے نکلتا ہوا خون ہی دیکھتی رہ گئی اور وہ دوبارہ آگے بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

''یا اللہ! یہ کس جرم کی سزا ہے، اتنے ویران خوفناک جنگل میں اتنے ہی خوفناک آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔ یا اللہ مدد فرما۔'' وہ خاموشی سے اپنی چوٹیں سہلاتی ہوئی آنسو بہا رہی تھی جب وہ واپس آتا دکھائی دیا۔ آنلہ نے اسے دور سے اپنی طرف آتے دیکھا تو نئے سرے سے سہم گئی۔ اس کی خوفناک قسم کی دھمکی

اسے بری طرح خوف زدہ کر گئی۔

''تمہاری وجہ سے میری اتنے دنوں کی محنت برباد ہوگئی۔تم اسٹوپڈ لڑکی۔میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا گلا دبا دوں۔تمہیں اتنی بے تکی قسم کی چیخ مارنے کی ضرورت کیا تھی۔اگر اتنی ہی ڈرپوک ہو تو یہاں اس جنگل میں کر کیا رہی ہو۔جا کر اپنے گھر بیٹھو آرام سے۔'' وہ اس کے سر پر کھڑا اسے گھورتا ہوا بول رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے کچا چبانے کا دل چاہ رہا ہو۔

''تین دن سے اس کی تاک میں تھا۔آج کہیں جا کر یہ سنہری موقع ہاتھ آیا تھا۔لیکن تم پتا نہیں ایک دم کہاں سے نازل ہوگئیں۔نہ یوں فضول طریقے سے چیختیں نہ وہ چوکنا ہوتا۔صرف تمہاری وجہ سے میرا نشانہ چوک گیا اور گولی اس کی ٹانگ پر لگ گئی۔'' وہ بری طرح اس پر برس رہا تھا اور وہ سر جھکائے اشک برسانے میں مصروف تھی۔

''پتا نہیں وہ جھاڑیوں میں کہاں چھپ گیا ہے۔زخمی شیر کو تو یوں چھوڑا بھی نہیں جا سکتا اور اب تو میرے بجائے وہ میری تاک میں ہوگا۔آخر اسے اپنے زخمی کیے جانے کا انتقام بھی تو لینا ہے۔'' وہ خود کلامی کرنے میں مصروف تھا۔کچھ سوچتا ہوا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور وہ رونا دھونا بھول کر لفظ ''زخمی شیر'' پر بری طرح دہل گئی تھی۔اس کی خوف سے پھٹی ہوئی آنکھوں پر اس کی نظریں پڑی تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتا ہوا بولا۔

''تم بھی اپنی خیر مناؤ۔ہوسکتا ہے میرے بجائے تم ہی اس کے ہتھے چڑھ جاؤ۔بڑا عیار اور چالاک ہے۔تین دن سے مجھے نچا کر رکھا ہوا ہے چلو اچھا ہے کچھ تمہیں بھی سزا ملے یوں بے موقع چیخنے چلانے کی۔'' پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آگے بڑھ گیا۔

''یہ تو شاید واپس جا رہا ہے۔اوہ تو مجھے اسی سے ہیلپ مانگنی چاہیے۔جیسا بھی سہی آخر ہے تو ایک انسان ہی۔چاہے جلادنما۔کم از کم اس زخمی شیر سے تو یہی بہتر ہے۔اگر یہ بھی چلا گیا تو میرا نہ جانے گا کیا۔' اس سوچ کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ جو اتنی دیر سے زمین پر مستقل ایک ہی اینگل سے بیٹھی ہوئی تھی بے اختیار اس کے پیچھے بھاگی۔چیخ کر اسے آواز قصداً نہیں دی کہ وہ پہلے ہی اس کے چیخنے پر بہت چڑا ہوا تھا۔وہ بڑی سست روی سے چل رہا تھا۔اس لیے آنلہ نے دو چار سیکنڈ میں ہی اسے جا لیا اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس سے مخاطب ہوئی۔

''دیکھیں میں یہاں راستہ بھٹک کر آگئی ہوں۔آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری مدد فرما دیں۔پلیز۔'' وہ جو اس کے بھاگ کر اپنے پیچھے آنے پر حیران تھا اس کی بات پر بڑی بے نیازی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''اول تو مجھے خدمت خلق کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔دوئم یہ کہ اگر ہوتا بھی تو تمہاری تو میں ہرگز بھی مدد نہ کرتا۔لہٰذا میری طرف سے معذرت۔'' اس پر ایک سخت، غصے سے بھرپور نگاہ ڈالتا وہ جیسے ہی آگے بڑھا آنلہ اس کے سامنے آگئی اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''پلیز آپ میری مدد کریں۔آپ کو انسانیت کا واسطہ۔دیکھیں میں جان کر نہیں چیخی تھی۔آپ مجھے معاف کر دیں۔میں یہاں اس خوفناک جنگل میں خوف اور دہشت ہی سے مر جاؤں گی۔'' اس کے سامنے وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی آنکھوں میں التجا لیے۔وہ خاموشی سے دو چار منٹ اسے گھورتا رہا۔ پھر

گے بڑھتا ہوا بولا۔

''آؤ۔'' تو وہ جو اتنی دیر سے امید و بیم کی کیفیت کا شکار تھی ایک دم پرسکون سی ہو کر اس کے پیچھے ل پڑی۔جبکہ وہ اس بات سے قطعاً بے نیاز نظر آ رہا تھا کہ وہ اس کے پیچھے آ بھی رہی ہے یا نہیں۔آنلہ قریباً دوڑ رہی تھی تب بھی اس سے کافی پیچھے تھی۔بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگیں شل ہوگئی تھیں۔سانس ری طرح پھول گیا تھا۔لیکن وہ مسلسل بھاگ رہی تھی یوں جیسے اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اسے چھوڑ کر نہ لا جائے۔اسے شاید اس طرح دوڑتے بھاگتے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا جب وہ ایک جیپ کے پاس جا کر کا۔ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔آنلہ کے بیٹھتے ہی اس نے جیپ اسپیڈ میں دوڑانی شروع کر دی۔اسے شاید ہر کام تیز رفتاری سے کرنا پسند تھا۔تیز چلنا، تیز گاڑی چلانا اور تیز آواز میں بول کر سامنے والے کو دہلانا۔اس کی طرف تو اس نے سرسری نظروں سے ھی نہ دیکھا تھا۔جبکہ وہ چوری چوری کتنی ہی مرتبہ اس کی طرف دیکھ چکی تھی۔بلیک جینز، بلیک ہی جیکٹ، انگ شوز، کندھے سے لٹکتی ہوئی رائفل، جیکٹ کی جیب میں ٹھونسا ہوا ریوالور اور جینز میں اڑسا ہوا خنجر۔ ہ شاید کوئی پروفیشنل شکاری تھا۔اس لیے اس کا جیپ چلانے کا انداز اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس جگہ اور یہاں کے حالات سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔آنلہ کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔

''شکر ہے میں درست بندے کے پاس خود بخود پہنچ گئی۔ورنہ اگر یہ بھی میری طرح کوئی انجان آدمی ہوتا تو میں تو گئی تھی کام سے۔'' وہ اس کا مکمل جائزہ لینے کے بعد سوچ رہی تھی۔اس وقت جیپ یک جھٹکے سے رکی۔اس سے کچھ بھی کہے بغیر وہ جیپ سے اتر گیا اور سامنے موجود خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر اخل ہو گیا۔وہ اس کی بدتمیزی پر کھول کر رہ گئی۔

''اتنا بے ہودہ اور بدتہذیب انسان ہے۔اگر مدد کر ہی دی ہے تو کچھ انسانیت کا ثبوت بھی دے دو۔'' وہ وہیں جیپ میں بیٹھی جل رہی تھی۔جب یونہی بیٹھے بیٹھے دس پندرہ منٹ گزر گئے اور وہ دوبارہ باہر نہ نکلا تو مجبوراً وہ جیپ سے اتری اور بن بلائے مہمان کی طرح اس کے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوگئی۔اپنی اس بے شرمی پر اسے خود پر سخت تاؤ آ رہا تھا مگر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ گدھے کو باپ بنا لیا جائے۔اس لیے چہرے کے تاثرات بھی بڑے دوستانہ ہی رکھے۔اس کا خیمہ کیا تھا پورا ایک لگژریز قسم کا بیڈ روم تھا۔کم از کم اس نے اب تک کی زندگی میں جتنے بھی خیمے دیکھے تھے ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ پورا خیمہ وال ٹو وال کارپٹڈ تھا۔میرون کلر کا دبیز اور آرام دہ قالین جس پر سبز اور سنہری پرنٹ تھا۔سنگل فولڈنگ بیڈ جس پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔سائڈ میں تہ کیا ہوا مورا کا بلینکٹ۔جس پر ٹائیگر پرنٹ بنا ہوا تھا۔بیڈ کے پاس ہی فولڈنگ چیئر رکھی ہوئی تھی۔ذرا آگے ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ جس پر ٹائم پیس ٹیپ ریکارڈر دو چار کتابیں اور سگریٹ کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی۔بیڈ کے بالکل سامنے یعنی خیمے کی دوسری دیوار کے پاس قالین پر دو عدد فلور کشنز رکھے ہوئے تھے۔ایک عدد ڈسٹ بن بھی تھا اور پھر سب سے آخر میں ایک میز کے اوپر چولہا رکھا ہوا تھا۔اسی میز پر دو چار برتن اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔

''یا الٰہی یہ کوئی نواب صاحب ہیں یا شکاری۔اتنے شاہانہ انداز میں تو آج تک کسی کو شکار کرتے نہیں دیکھا۔یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ حضرت مستقل یہیں قیام و طعام فرماتے ہیں۔''

وہ اس کی آمد کا کوئی نوٹس لیے بغیر اپنے لیے چائے بنانے میں مصروف تھا۔ چائے بن گئی تو بڑے اطمینان سے کپ ہاتھ میں لیے آرام سے ٹانگیں پھیلا کر فلور کشن پر بیٹھ گیا اور چائے کے سپ لینے لگا۔ اپنی اتنی انسلٹ پر اسے سخت غصہ آرہا تھا مگر کوئی اور جائے پناہ بھی نہیں تھی اس لیے مجبوراً خود کو گھسیٹتی وہیں سمٹ سمٹا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی مشکلوں سے خود اپنے ہی آپ کو سمجھا بجھا رہی تھی اپنی انا کو اور اونچی ناک کو تھپ تھپک کر سلا رہی تھی۔

''ذرا سوچو اگر مجھے یہ نہ ملتا تو اس وقت میرا کیا حشر ہو رہا ہوتا۔ وہ زخمی شیر مجھے کب کا چیر پھاڑ چکا ہوتا۔ ان حالات میں اس کا ملنا بھی بہت غنیمت ہے۔'' وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی۔ جبکہ وہ بڑی خاموشی سے اسے خود سے جنگ کرتے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ چائے پی چکا تو کپ وہیں قالین پر ہی رکھ کر سر فلور کشن پر رکھ کر لیٹ گیا۔ آنلہ نے دو چار بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کی بند آنکھوں سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ جس وقت وہ اس کے ساتھ آئی تھی شام کے چار بج رہے تھے۔ جبکہ اب ساڑھے چھ ہو رہے تھے۔ صبح سے وہ جتنے پریشان کن حالات کا سامنا کر رہی تھی اب تھک ہار کر نڈھال سی ہو گئی تھی اور کچھ کچھ غنودگی بھی طاری ہو رہی تھی۔ وہ نیند بھگانے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس خیمے کا پرسکون اور آرام دہ ماحول اسے اس کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک کپ چائے کا بنا کر پی لے نیند بھاگ جائے گی۔ مگر ایسا کرنا اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس لیے خوف پر ضبط کرتی یونہی بیٹھی رہی۔ پھر پتا نہیں کب وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی۔ گھٹنوں میں منہ دیے وہ گہری نیند سو رہی تھی جب کسی چیز کے گرنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک دم ہڑبڑا کر سر اوپر اٹھایا اور نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ چولہے کے پاس کھڑا نظر آیا۔ شاید اس کے ہاتھ سے کوئی برتن گرا تھا۔ آنلہ نے گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ نو بجا رہی تھی۔

وہ جب سے آئی تھی اسی زاویے سے بیٹھی ہوئی تھی ٹانگیں بری طرح اکڑ گئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسے شدید قسم کا چکر آرہا ہے۔ وہ جو ٹانگیں سیدھی کرنا چاہ رہی تھی شدید قسم کی کمزوری کے سبب ایسا بھی نہ کر سکی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے آج دن بھر ایک قطرہ پانی تک نہیں پیا ہے اور یہ کہ اگر ابھی کچھ دیر اور اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تو وہ کمزوری سے بے ہوش ہو جائے گی۔ اتنی سخت بھاگ دوڑ اس نے اپنی تمام زندگی کب کی تھی وہ بھی بھوکے پیاسے لہٰذا اس کا نڈھال ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ وہ اوپنر سے ٹن پیک ڈبا کھول رہا تھا۔ پھر اس میں سے اس نے شاید خشک مچھلی کے ٹکڑے نکالے اور فرائنگ پین میں ڈال کر انہیں فرائی کرنے لگا۔ بھوکے پیٹ کو کھانے کی خوشبو پاگل کرنے لگی اور وہ ندیدوں کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہی۔

وہ تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت یہاں بالکل اکیلا ہے۔ اسے اس کے وجود سے کوئی سروکار نہ تھا۔ شاید اپنے خیال میں وہ اسے اپنے ساتھ لا کر کافی سے زیادہ احسان کر چکا تھا لہٰذا مزید کسی مروت اور مہمان داری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے اس کی طرف ایک دوستانہ سی مسکراہٹ بھی اس نے نہیں پھینکی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ مچھلی فرائی ہو گئی تو اس نے ڈبل روٹی کے ایک سلائس پر مچھلی اور دوسرے پر چیز کا سلائس رکھ کر تین عدد سینڈوچز تیار کیے۔ انہیں بڑے پیار سے پلیٹ میں رکھا اور اپنے

لیے کپ میں کافی گھولنے لگا۔ کافی بھی تیار ہو گئی تو وہ دونوں چیزیں ہاتھ میں اٹھائے وہیں اس کے امنے فلور کشن پر آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''تم کھاؤ گی۔'' اس کا تو یہ حال تھا کہ اس سے چھین کر کھا جاتی۔ خالی پیٹ ساری انا و نا بھی بھول ئی تھی۔ آج اس نے جانا تھا کہ بھوک کتنی بری بلا ہے۔ شاید اسی لیے اس پیٹ کی خاطر انسان کوئی بھی ام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ بمشکل اپنے لڑکھڑاتے اور چکراتے وجود کو سنبھال کر فوراً آگے بڑھی اور ں کی آفر کے جواب میں بغیر کسی تکلف کے ایک سینڈوچ اٹھا لیا اور جلدی سے کھانا یوں شروع کر دیا یسے اس کے چھن جانے کا خطرہ تھا۔ وہ اپنا کھانا بھول کر بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایتھوپیا کے ط زدگان میں سے کوئی لگ رہی تھی۔ دو تین نوالوں میں اس نے سینڈوچ ختم کر لیا۔ مگر ایک سینڈوچ ے تو ابھی آدھا پیٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ اس نے پلیٹ اس کے آگے کر دی تو اس نے فوراً ہی دوسرا ینڈوچ اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت اسے سوائے بھوک کے اور کوئی بات یاد نہ تھی۔ وہ بے چارہ دا اپنے سینڈوچ کا ایک نوالہ لے چکا تھا وہ بھی اس کے آگے رکھی پلیٹ میں رکھ دیا اور اٹھ کر اپنے بیگ ں سے بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی نکال لایا۔ جب تک اس نے پیکٹ کھولا وہ بڑے اطمینان سے تینوں ینڈوچز کھا چکی تھی۔ اس نے بسکٹ اس کے آگے رکھے تو وہ ایک دم کچھ شرمندہ سی ہو گئی پیٹ میں اناج لیا تو ساری شرم وغیرہ بھی یاد آ گئی اور اپنی بے اختیاری اور ندیدے پن پر سخت افسوس بھی ہونے لگا۔ سکٹوں کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر وہ یونہی چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ تو وہ بولا۔

''اگر کافی پینی ہے تو اٹھ کر خود ہی اپنے لیے بنا لو مجھ سے یہ امید مت رکھنا کہ میں تمہاری مہمان اری کروں گا۔'' لہجہ اچھا خاصا روڈ اور بے مروت قسم کا تھا مگر وہ اس کے لہجے پر ناراض ہونے کے جائے اس بات پر حیران رہ گئی کہ وہ اس سے اردو میں بات کر رہا تھا۔

''آپ پاکستانی ہیں؟'' وہ کچھ جوش اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تو وہ اپنے مخصوص اکھڑ انداز ں بولا۔

''کیوں میں تمہیں جاپانی نظر آتا ہوں۔ فضول اور احمقانہ سوالات سے سخت چڑ ہوتی ہے مجھے۔'' ہ بسکٹ کھاتا ہوا بڑی بدتمیزی سے بولا تو وہ کھول کر رہ گئی۔

''اس جنگلی کو تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ خواتین کا احترام بھی کوئی یز ہوتی ہے۔''

وہ سوچتی رہی جبکہ وہ کافی پیتا ہوا اس سے دوبارہ لاتعلق ہو چکا تھا۔ اس نے تو اس سے یہ تک نہ وچھا تھا کہ وہ کون ہے اور اتنے خوف ناک جنگل میں اکیلی کیا کر رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے س کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ وہ اگر ہے تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ پھر وہ اٹھا کافی کا کپ اور پلیٹ اٹھا کر وہیں چولہے کے پاس جا کر رکھ دی اور خود خیمے سے باہر چلا گیا۔ کافی دیر گزر گئی در وہ واپس نہ آیا تو آنلہ کو گھبراہٹ ہونی شروع ہو گئی۔ وہ بے اختیار خیمے سے باہر نکل آئی۔ ارد گرد پھیلا ناٹا اور اندھیرا اس کے خوف کو دو چند کر گیا۔ سوائے دور دراز سے آتی عجیب و غریب آوازوں کے کچھ نائی نہ دے رہا تھا۔ عجیب و غریب آوازیں شاید جانوروں کی تھیں یا پتا نہیں کس چیز کی۔ وہ خوف د ہشت سے سن سی کھڑی تھی۔ چاروں طرف پھیلی تاریکی اور گھنا جنگل جس میں اس وقت وہ بالکل اکیلی

تھی اس نے خوف زدہ ہو کر رونا شروع کر دیا۔ اچانک اسے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا مصیبت ہے تمہیں چیخنے چلانے کے سوا کچھ اور آتا ہے یا نہیں۔ عجیب اجڈ قسم کی لڑکی ہو۔'' وہ اسے بری طرح ڈانٹتا چلاتا خیمے میں گھس گیا تو وہ بھی آنسو پونچھتی اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس کی تمام تر بدتمیزی کے باوجود اس کے ہونے سے ایک عجیب سا تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک دم سارا ڈر خوف زائل ہو گیا تھا۔ اس نے اندر آ کر ٹیبل پر رکھی ایمرجنسی لائٹ آف کی اور کمبل تان کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تو کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر وہیں قالین پر دونوں فلور کشنز کو آپس میں ملا کر ان کے اوپر لیٹ گئی اور دوپٹہ پورا کھول کر اپنے اوپر ڈال لیا۔ ''بھلا ہو اس فیشن کا'' اس نے خود سے کہا۔ ''ورنہ اتنی ٹھنڈ میں ٹھٹھر کر ہی مر جاتی۔'' لیٹے ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ آس پاس سے آتی جانوروں کی آوازوں سے کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تمام جنگلی جانور اور درندے مل کر کورس میں رو رہے ہیں۔ ماحول اتنا ہیبت ناک تھا کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ گھپ اندھیرا اور ویران جنگل اس کے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے آنے لگے۔

''سنیں آپ سو گئے ہیں کیا؟'' اپنے خوف کو زائل کرنے کے لیے وہ بے اختیار اسے پکار بیٹھی اور وہ جو کروٹ دوسری طرف کیے نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا بری طرح جھنجھلا گیا۔

''آپ سونے دیں گی تو سوؤں گا۔ فرمائیے اب کیا تکلیف ہے۔'' منہ بدستور دوسری طرف کیے وہ خاصا جل کر بولا تھا۔ وہ اس کا لہجہ نظر انداز کر کے اپنی پریشانی بیان کرنے لگی۔

''ہم لوگ یہاں محفوظ تو ہیں ناں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ ہم بے خبر سو رہے ہوں اور کوئی جانور اندر گھس آئے یا پھر کوئی سانپ، بچھو ہی اندر آ جائے۔'' جواب میں وہ بڑی استہزائیہ مسکراہٹ چہرے پر لاتا ہوا اس کی طرف رخ کر کے بولا۔

''جانور وغیرہ اندر کیوں آئیں گے۔ انہیں کیا اپنی زندگی عزیز نہیں ہے۔ آخر کو ملکہ عالیہ یہاں خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں اور وہ یہاں آ کر ان کے آرام میں خلل ڈال دیں۔ میڈم آپ کے اس عالی شان محل کو جو چاروں طرف سے مسلح فوجی دستوں کی نگرانی میں ہے کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ آرام فرمائیے۔'' اس کے اتنے طنزیہ انداز پر وہ بری طرح تپ گئی۔ جبکہ وہ اپنا منہ دوبارہ دوسری طرف کر چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے جتنی بھی سورتیں یاد تھیں سب کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ تمام سورتیں پڑھ کر خود پر اچھی طرح دم کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت اس کا دھیان لیلیٰ اور دانش کی طرف چلا گیا۔ تمام دن اپنی الجھن اور پریشانی میں مبتلا رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں کا خیال بھی اسے برابر پریشان کرتا رہا تھا۔ پتا نہیں ان کا کیا بنا ہو گا۔ ''یا اللہ ان دونوں کی حفاظت فرما۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں ان دونوں کے لیے دعائیں کرنے لگی۔ کتنے خوش باش ہم لوگ گھر سے چلے تھے۔ کیا پتا تھا کہ ہماری یہ تفریح کتنے سنگین نتائج کی حامل ہو گی۔ وہ کل رات کے تمام خوشگوار مناظر یاد کر کے نئے سرے سے خوف زدہ ہو گئی۔

لیلیٰ اس کی چچازاد بہن اور بہترین دوست تھی۔ جس کی پرزور دعوت پر وہ ان دنوں کینیا آئی ہوئی تھی۔ چچا میاں شروع سے ہی نیروبی میں مقیم تھے۔ لیلیٰ ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ بیٹی بھی کیا تھی

ں کے بقول لیلیٰ تو میرا بیٹا ہے۔ وہ تھی بھی تام بوائے ٹائپ۔ مست ملنگ اور اپنے آپ سے لاپروا ۔ بہت ذہین بہت پڑھاکو اور ساتھ ہی ساتھ ایڈونچرز کی از حد شوقین۔ اس کے نزدیک ایسی زندگی ئی زندگی ہی نہیں جس میں ایڈونچر نہ ہو کوئی تھرل اور تیز رفتاری نہ ہو۔ اپنی افتادِ طبع کے باعث وہ وڑے سے لے کر جہاز تک سب کچھ چلا لیتی تھی۔ صرف ایک چچی جان کے علاوہ اس کی ان حرکتوں ے ہر کوئی خوش رہتا تھا۔ چچی جان اس کے مردمار انداز سے اور بے تکی حرکتوں سے ہر وقت شاکی رہتی یں۔ بلکہ اٹھتے بیٹھتے اسے آملہ کی مثالیں دیا کرتی تھیں۔

''ارے لڑکیوں کو لڑکیوں والے کام کرنے چاہئیں۔ یہ آملہ کو دیکھو کوکنگ کتنی اچھی کرتی ہے۔ ن کتنا آہستہ ہے۔ تمہاری طرح کانوں میں صور اسرافیل نہیں پھونکتی اور دیکھو ذرا اس کے انداز میں کتنا یما پن اور شائستگی ہے۔'' مگر وہ لیلیٰ ہی کیا جس پر کوئی بات اثر کر جائے۔ چچی جان کی تمام ڈانٹ ٹکار وہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی۔ دونوں کی شخصیتوں میں موجود اتنے واضح تضاد ے باوجود وہ دونوں آپس میں بہت گہری دوستیں تھیں۔ ہر سال چھٹیوں میں وہ لوگ پاکستان آتے تو وہ نوں سال بھر کی جمع شدہ تمام باتیں ایک دوسرے سے کرنے بیٹھ جاتیں۔ سارے خاندان میں ان کی ستی کو حیرت سے دیکھا جاتا تھا۔ کہاں لیلیٰ جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ یا کرتا پہن کر اوپر سے سکارف گلے میں ڈالنے والی۔ منچلی اور منہ پھٹ قسم کی لڑکی اور کہاں آملہ شلوار قمیص کے اوپر لمبا دو گز کا دپٹا خوب پھیلا کر اوڑھنے والی، خاموش طبع اور سنجیدہ سی لڑکی۔ سب کی حیرت سے قطع نظر وہ بچپن سے لے کر آج تک بیسٹ فرینڈ تھیں۔

پچھلے سال جب لیلیٰ چھٹیوں میں کراچی رہ کر گئی تو جاتے وقت کہہ گئی کہ اب اگلے سال تم کینیا آؤ ی۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ ہمیشہ میں ہی آؤں۔ اب جبکہ وہ پڑھائی سے بھی فارغ ہو گئی تھی۔ لیلیٰ ر دوسرے روز فون کھڑکاتی اور اسے آنے کے لیے اکساتی۔ وہ تو خیر جانے کے لیے بہت بری طرح بے چین تھی۔ مگر اصل مسئلہ تو اجازت ملنے کا تھا۔ ابو تو خیر مان بھی جاتے مگر اصل مسئلہ امی اور بھابھی کو منانے کا تھا۔ جن کے خیال سے اس کے جانے سے گھر سونا ہو جائے گا۔

''ہمارے گھر میں افراد ہی کتنے ہیں اگر تم بھی چلی گئیں تو مجھے اور امی کو تو گھر کاٹنے کو دوڑے گا۔'' بھابھی شاہی فرمان جاری فرماتیں جس کی امی مکمل تائید فرماتیں اور وہ جل کلس کر رہ جاتی۔ مقدمہ ابو اور بھیا کی عدالت میں جانے سے پہلے ہی خارج کر دیا جاتا۔ اس نے لیلیٰ کے مسلسل اصرار سے تنگ آ کر اسے تمام صورت حال بتائی اور کہا کہ وہ اگر اس کا کوئی حل نکال سکتی ہے تو نکالے ورنہ چپ چاپ بیٹھ جائے۔ دل تو خیر اس کا بھی بہت چاہ رہا تھا جانے کو مگر کیا کرتی۔

''میرے اکلوتے چچا اور میں نے آج تک ان کا گھر بھی نہیں دیکھا۔'' وہ خود اپنے آپ سے افسوس کرتی۔ لیلیٰ بھی اپنے وقت کی ایک ہی تھی۔ پتا نہیں اس نے کس طرح اور کن الفاظ میں چچا میاں کو تمام داستان سنائی کہ انہوں نے کراچی فون کھڑکا دیا اور امی اور ابو سے بات کر کے کہا انہیں آملہ بہت یاد آ رہی ہے۔ لہٰذا اسے ان کے پاس نیروبی بھیج دیا جائے۔ ٹکٹ اس کا وہ پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں۔ جو شاید کل تک وہ لوگ وصول کر لیں گے۔ چچا میاں کی خواہش کے آگے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ جواب تک اپنے وہاں جانے پر فاتحہ بھی پڑھ چکی تھی یک دم خوش ہو اٹھی۔

نیروبی پہنچنے پر چچا میاں، چچی جان اور سب سے بڑھ کر لیلیٰ نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ لیلیٰ نے ایک اچھے میزبان ہونے کا حق پوری طرح ادا کیا تھا اور ایک ماہ کے دوران اسے بھرپور کمپنی فراہم کی تھی۔ ان کی ہر آؤٹنگ پر دانش بھی ضرور موجود ہوتا تھا۔ لیلیٰ کا تو لگتا تھا کھانا بھی دانش کے بغیر ہضم نہیں ہوتا تھا۔

''دانی ہم لوگ فلاں پارک جا رہے ہیں تم بھی آجاؤ۔''

''دانی ہم چائنیز جا رہے ہیں تم بھی ہمیں جوائن کرلو۔'' اور دانش حکم کا غلام اپنے مریضوں کو چھوڑ چھاڑ فوراً حاضر ہوجاتا تھا۔ لیلیٰ کا دانش کے ساتھ پچھلے سال نکاح ہوگیا تھا۔ رخصتی یوں نہیں ہوئی تھی کہ دونوں فریق ابھی اس کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ لیلیٰ صاحبہ اپنا M.S کرنے میں مصروف تھیں اور دانش اپنا ذاتی ہاسپٹل اسٹیبلش کر رہا تھا۔ چچی کی طرح دانش کی فیملی بھی شروع ہی سے یہیں سیٹل تھی۔ دانش بھی لیلیٰ کی طرح یہیں پیدا ہوا تھا اور پلا بڑھا تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے اور دونوں میں بلا کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ کبھی کبھار تو ان دونوں کی اتنی زیادہ ذہنی ہم آہنگی آنلہ کو حیران کردیتی تھی۔ زندگی کے ہر معاملے میں دونوں کی پسند ناپسند سب کچھ ایک جیسا تھا۔ دونوں کو ایک سا موسم، ایک ہی رنگ، ایک جیسا میوزک، ایک ہی جیسا لباس، ایک جیسی کتابیں، ایک جیسی فلمیں اور ایک جیسا کھانا پسند تھا۔ شروع شروع میں آنلہ کو ان دونوں کے ساتھ باہر گھومنا پھرنا عجیب سا لگا۔ اسے لگتا کہ وہ ان دونوں کے بیچ خوامخواہ کباب میں ہڈی بننے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی لیے اس کی وجہ سے وہ دونوں بے چارے کبھی کسی کتاب پر کبھی کسی فلم پر یا کسی اور جنرل ٹوپک پر ڈسکشن کرتے رہتے ہیں۔ مگر جلد ہی اس کی یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔ ان دونوں کے درمیان عام جوڑوں کی طرح رومینٹک جملوں کا تبادلہ نہیں ہوتا تھا۔ نہ دانش کوئی رومانی جملے بولتا اور نہ وہ شرم سے سرخ پڑتی۔ اتنا نرالا کپل آنلہ نے اپنی زندگی میں پہلا دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں کہ آخر وہ لیلیٰ کی بچپن کی سہیلی تھی۔ مگر شاید ان لوگوں کی محبت کا انداز دوسرے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مگر اس طرح جیسے یہ کوئی معمول کی بات ہے۔

لیلیٰ ایم ایس میں Environmental Studies کر رہی تھی۔ ان دنوں وہ اپنے تھیسس میں مصروف تھی۔ اپنی مصروفیت کے باوجود وہ آنلہ کو ٹائم دینا نہ بھولتی تھی۔ اس کے تھیسس کا موضوع تھا ''جنگلی حیات کا تحفظ'' اپنی بے چین طبیعت کے عین مطابق اس نے ایک نیا شوشا چھوڑ کر چچی جان کے غصے کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ اس کے اوپر خوب چیخی چلائی تھیں۔ اسے اور اس کے خبطی پروفیسروں کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آنلہ کو بھی نصیحت کی تھی۔

''بیٹا تم بھی اس سے ذرا دور ہی رہا کرو۔ کہیں تمہارے اوپر اس کا سایا نہ پڑ جائے۔'' جبکہ لیلیٰ اپنے ارادوں میں اٹل تھی۔ دونوں ماں بیٹی میں زبردست ٹھنی ہوئی تھی اور آنلہ بے چاری پریشان کہ کس کی حمایت کرے کس کی مخالفت جبکہ دونوں فریق اسے اپنا حلیف سمجھتے ہوئے اپنے اپنے دل کا بوجھ اسی کے سامنے ہلکا کرتے۔ چچا میاں خاموش تماشائی کہ بیٹی کی ذرا سی حمایت کرنے پر چچی جان نے ان کو خوب کھری کھری سنائی تھیں۔

''آپ تو رہنے ہی دیں۔ آپ ہی کی شہ پر یہ اتنی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔ کل کو اسے اپنا گھر ہے۔ آخر یہ کرے گی کیا۔ اس کی ساس اس بات پر اسے میڈل نہیں دیں گی کہ میری بہو گھوڑا بہت ڑاتی ہے یا میری بہو دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائکلنگ بہت اچھی کرتی ہے۔ شریف گھروں کی بہو کے یہ چھن نہیں ہوتے۔ مگر یہاں میری سنتا ہی کون ہے۔''

اور چچا میاں بے چارے اس دن سے بیٹی کی حمایت میں ایک لفظ نہ بولے تھے۔ جب منت ، پیار محبت یہاں تک کہ دھمکیاں بھی ہر حربہ ناکام ہوگیا تو آخر میں لیلیٰ بھوک ہڑتال کر کے ے میں بند ہوگئی۔ پہلے دن تو چچی جان نے کچھ خاص پروا نہ کی۔ مگر دوسرے روز فکر مند ہوئیں۔ مگر ں اپنی ضد کی پکی اس وقت تک کمرے سے باہر نہ نکلی جب تک چچی جان نے اسے اجازت نہ دے جازت ملنے کی دیر تھی وہ خوشی خوشی کمرے سے نکل کر چچی جان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کا ادا کرنے لگی۔ جبکہ چچی جان بیٹی کے ہاتھوں اپنی شکست پر کچھ منہ پھیلائے بیٹھی رہیں۔ پھر اس ضے میں لیلیٰ نے ایک نیا جھگڑا نکالا۔

''آنلہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔'' چچی جان جو اسے ہی بمشکل اجازت دے کر ابھی تک خوش نہ یہ بات سن کر خوب ناراض ہوئیں۔

''اوفو ممی! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی ناراضگی بالکل فضول ہے۔ میں کوئی تفریح کرنے نہیں ہوں اپنا ریسرچ ورک کرنے جا رہی ہوں۔ جنگلی حیات کا تحفظ میرا موضوع ہے اور میں گھر بیٹھے خالی کتابیں پڑھ کر اور دوسروں کی سنی سنائی لکھ کر اپنا تھیسس کمپلیٹ نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کے لیے ریسرچ ورک کرنا ہے اور ریسرچ کرنے کا مطلب یہی ہے کہ میں کسی جنگل کا قریب سے مشاہدہ ں۔ دیکھوں کہ کس طرح ہم انسانوں کی لاپروائی کے نتیجے میں جنگل تباہ ہو رہے ہیں اور جنگلی حیات آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ یہ ایک بہت ہی حساس اور سنجیدہ موضوع ہے اور میرے پروجیکٹ ایڈوائزر ال ہے کہ اتنے اہم اور سیریس سبجیکٹ پر مجھ سے بہتر کوئی ریسرچ نہیں کر سکتا۔ ذرا سوچیں میری کی ریسرچ اور میری تیار کردہ رپورٹ کی پوری دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔ آپ کو تو فخر کرنا چاہیے کہ خدا پ کو اتنی ذہین اور ٹیلنٹڈ بیٹی سے نوازا ہے اور ایک آپ ہیں ہر وقت مجھ سے بدگمان اور ناراض رہتی ور جہاں تک آنلہ کے ساتھ جانے کا تعلق ہے تو ایسا میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں تو دو دن تک اپنا ریسرچ ورک کرتی رہوں گی۔ اس کی بھی اس بہانے کچھ تفریح ہوجائے گی۔ یہ اور دانش گھوم پھر گے۔ افریقہ کے جنگلات کی تو پوری دنیا میں شہرت ہے۔ کیا حرج ہے اگر یہ بھی ساتھ چلی جائے اور آنکھوں سے ان تمام جگہوں کو دیکھ لے۔'' لیلیٰ کے تفصیلی خطاب سے وہ متاثر ہوئی تھیں یا نہیں مگر اجازت بہرحال دینی پڑی تھی کہ لیلیٰ کے ساتھ ساتھ دانش بھی انہیں قائل کرنے چلا آیا تھا اور ان تمام خدشات کو بے بنیاد قرار دیتا ہوا اس بات پر مصر رہا تھا کہ انہیں لیلیٰ کو بغیر کسی فکر اور پریشانی کے نے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ کیونکہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہوگی۔ وہ خود بھی ساتھ ہوگا اور یہ کہ وہ کسی اک قسم کے جنگل کا دورہ کرنے نہیں جا رہے۔ بلکہ جہاں وہ جا رہے ہیں وہاں خرگوشوں، جنگلی ں، چوہوں، بٹیروں اور پرندوں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ ہرن ہی ہوں گے اور یہ کہ وہاں ان ں کو ہر ہر قسم کی گائیڈنس فراہم کرنے کے لیے دانش کا دوست جو کہ وہیں فورسٹ آفیسر ہے بھی

موجود ہوگا اور اسی کے ریسٹ ہاؤس میں وہ لوگ ٹھہریں گے۔ چچی جان اپنے اکلوتے داماد کو کیسے ناراض کر سکتی تھیں لہٰذا چہرے پر سے ناراضگی کے تمام آثار مٹا کر انہوں نے آنیلہ اور لیلیٰ کو بخوشی دانش کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ تو خود پہلے ہی سے لیلیٰ کے ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔ مگر چچی جان کے خوف کے باعث اپنے شوق کا اظہار نہیں کر سکی تھی۔ اجازت ملنے کی دیر تھی اس نے بیگ میں دو عدد جوڑے ایک سوئیٹر اور شال رکھ کر خوشی خوشی اپنا سامان پیک کیا۔ سر شام ہی وہ لوگ گھر سے روانہ ہو گئے تھے۔

دانش اور لیلیٰ اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے جبکہ وہ پیچھے بیٹھی ان لوگوں کے ساتھ گفتگو میں شریک تھی۔ لیلیٰ سارا وقت ان لوگوں کو برا بھلا کہتی رہی تھی جو جنگلوں کو اجاڑ کر قدرت کے نظام میں خلل ڈالنے کی بے ہودہ کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ تمام شکاریوں اور تمام لکڑیوں کے سوداگروں کو سرعام پھانسی دلوا دیتی۔

''سوچو ذرا صرف اپنے شوق کی خاطر یا چند روپوں کے لالچ میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کر رہے ہیں۔ جنگل نہیں رہیں گے تو آلودگی کا کیا حال ہوگا ایک عام آدمی تو اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور جنگل بنے کس چیز سے ہیں۔ ظاہر ہے درخت، پہاڑ اور جانور مل کر جنگل بناتے ہیں۔ ہم شاید اپنے بچوں کو یہ بتایا کریں گے کہ بیٹا ہمارے زمانے میں ایک جانور ہوتا تھا جسے پانڈا کہتے تھے۔ یا ایک جانور ہوتا تھا جو چیتا کہلاتا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح آج ہم لوگ ڈائنوسارز کے بارے میں سنتے اور پڑھتے ہیں۔'' اسے آج کل جنگلوں اور جنگلی جانوروں کے علاوہ کسی ٹاپک پر بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا اور دانش اس کے من پسند موضوع پر پتا نہیں اس کا دل رکھنے کے لیے یا حقیقتاً بڑی دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ پوری رات وہ لوگ سفر کرتے رہے تھے۔ کبھی دانش ڈرائیو کرتا کبھی لیلیٰ۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے سو کر اپنی نیند پوری کر چکی تھی اور اب تازہ دم ہو کر ان دونوں کے ساتھ شریک گفتگو ہو گئی تھی۔ لیلیٰ کی کسی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہوئے اچانک اسے لگا جیسے گاڑی پوری طاقت کے ساتھ کسی چیز سے ٹکرائی ہے۔ لیلیٰ اور اس کے منہ سے بے اختیار بلند و بالا چیخ نکلی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ لوگ سنبھلتے گاڑی نے دو چار قلابازیں کھائی تھیں۔ ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ گاڑی کے قلابازی کھانے کے نتیجے میں اس کی طرف کا دروازہ ایک دم کھل گیا تھا اور گاڑی نے جب اگلی قلابازی کھائی تو وہ کسی فٹ بال کی طرح اچھل کر گاڑی سے زمین پر جا گری۔ جبکہ گاڑی مسلسل لڑھکتی چلی جا رہی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے جو آخری منظر اس نے دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ گاڑی کسی کھلونے کی طرح لڑھکتی ہوئی سامنے موجود گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ اس کا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

اسے ہوش آیا تو کتنی ہی دیر وہ یونہی پتھریلی زمین پر پڑی رہی۔ اس کے سر کے عین اوپر سورج اپنی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ دو دس پندرہ منٹ یونہی پڑی رہی۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا گزری تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں کس کی دعائیں لگی تھیں یا کوئی معجزہ رونما ہوا تھا کہ اتنی بری طرح گاڑی میں سے اچھل کر گرنے کے باوجود اسے کوئی بہت شدید قسم کی چوٹیں نہیں آئی تھیں صرف کہنیاں تھوڑی سی چھل گئی تھیں جن سے ابھی بھی خون رس رہا تھا اور گھٹنے معمولی زخمی ہوئے تھے۔

ان چوٹوں کو نظر انداز کرتی بھاگتی ہوئی اس کھائی کی طرف آئی جہاں اس نے گاڑی کو گرتے دیکھا تھا۔ نیچے جھک کر دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کھائی تو اس کے تصور سے بھی کہیں زیادہ گہری تھی۔ اچھی طرح نظریں دوڑانے کے باوجود اسے نہ تو گاڑی ہی کے کوئی آثار نظر آئے نہ ان لوگوں کا کوئی سراغ ملا۔ اسے بڑی فکرمندی کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں سوچتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ خود اس وقت کہاں موجود ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ یہاں سے واپسی کا راستہ کیسے ملے گا۔ ان تمام سوالات کا ذہن میں آنا تھا وہ ان لوگوں کو بھول بھال اپنی فکر میں پڑ گئی۔ ایک مہینے میں تو وہ نیروبی سے درست طور پر آگاہ نہ ہو پائی تھی۔ تو یہاں اس انجان جگہ خود کو پا کر فکرمند ہو جانا لازمی تھا۔ وہ کسی بھی طرح شہری آبادی کے آس پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اس وقت تمام رات سفر کرنے کے بعد کس شہر یا قصبے کے پاس سے گزر رہے تھے۔

یونہی اٹکل سے وہ چلتی رہی۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو گئے کوئی راستہ سجھائی نہ دیا۔ یہاں تک کہ شام کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ بری طرح بے بس سی ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ یونہی تمام زندگی اس جنگل میں بھٹکتی رہے گی اور اسے واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔ شاید اب کبھی اپنے گھر والوں سے نہ مل پاؤں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس ویران اور ہو حق جنگل میں جہاں آدم تھا نہ آدم زاد اسے یہ سوچ کر ہی وحشت ہو رہی تھی کہ وہ یہاں رات گزارے گی۔ رات جو اپنے ساتھ کتنے سارے خوف لے کر آتی ہے اور وہ تو تھی بھی بڑی عام سی اور ڈرپوک قسم کی۔ جو لال بیگ سے لے کر کتے بلی تک ہر جانور سے ڈرتی تھی۔ وہ تو اکیلے کمرے میں سونے سے ڈرتی تھی۔ کہاں اتنا گھنا، ڈراؤنا جنگل جس میں وہ اس وقت بالکل تنہا تھی۔ عین اسی وقت اس نے ایک آواز سنی تھی اور وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر چیخ پڑی تھی اور پھر اسے وہ مل گیا تھا جو کم از کم ایک انسان تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ جس نے اس ویرانے میں اسے ایک جیتے جاگتے انسان سے ملوا دیا۔

تمام رات اس نے عجیب سوتی جاگتی کیفیت میں گزاری۔ کبھی اس کی آنکھ لگ جاتی اور کبھی خوفزدہ ہو کر وہ اٹھ بیٹھتی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب اس کی آنکھ جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سے کھل گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں جانب دیکھا وہ وہاں کہیں نہ تھا۔ چہار سو پھیلا اندھیرا رات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ وہ ایک دم کچھ بدحواس سی ہو کر بغیر دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں خیمے سے باہر نکل آئی۔ سناٹے کو چیرتی ہوئی جیپ کی آواز لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی۔ وہ تیز رفتار سے جیپ کے پیچھے بھاگی۔

''سنیں پلیز رک جائیں۔ میری بات سن لیں پلیز۔'' وہ چیخ چیخ کر اسے آواز دینے لگی۔ اس وقت پورا جنگل سویا ہوا تھا، کہیں کوئی آواز کوئی آہٹ نہ تھی اس کی آواز کی بازگشت دور دور تک پھیل گئی۔ اس نے جیپ روک دی تھی۔ مگر ریورس کر کے واپس اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ وہ خود ہی بھاگتی دوڑتی اس تک پہنچی۔

''آپ اتنی رات کو مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پاس کھڑی اس

سے مخاطب تھی۔ جو اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے بڑا بے زار سا بیٹھا تھا۔

”محترمہ صبح کے چار بجنے والے ہیں۔ رات کب کی ختم ہو چکی ہے اور جہاں تک آپ کو اکیلا چھ جانے کا سوال ہے تو میرا نہیں خیال کہ میں نے آپ سے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا کہ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑو گا۔ اتنی بزدل اور کم ہمت تھیں تو اس جنگل بیابان میں کرنے کیا آئی تھیں۔“ وہ اس پر بڑی ملامتی نظر ڈالتا ہوا بولا۔ کپڑے بدلے، نکھرا نکھرا وہ کل کے مقابلے میں خاصا فریش محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں، بجے نکلنے کے لیے وہ خود کس وقت جاگا تھا۔

”آپ میری مدد کریں۔ پلیز بس مجھے یہاں کے کسی بھی شہر یا قصبے تک پہنچا دیں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔“ وہ منت بھرے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تو وہ لہجے کا اکھڑپن کم کرتا ہوا بولا۔

”اس وقت تو مجھے جانا ہے۔ واپس آؤں گا تو تمہارے اس مسئلے پر بات کریں گے۔“ وہ جی اسٹارٹ کرنے لگا اور وہ اپنی منت سماجت ضائع دیکھ کر کچھ دل گرفتہ سی ہو گئی۔ اس کے اداس چہر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”کچھ کھا پی لینا۔ وہاں اندر بلیک کلر کا بیگ رکھا ہے۔ اس میں کھانے پینے کا سامان ہے۔ جو چاہے کھا لینا۔ مگر اس کے علاوہ میری کسی چیز کو چھیڑنے کی یا کسی سامان میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہ ہے اور اگر منہ ہاتھ دھونا ہوا تو وہ رہا تمہارا شاہی حمام۔“ اس نے اشارے سے دور سے نظر آتی ایک جھ دکھائی اور جیپ اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔ کچھ دیر کھڑی جیپ کو جاتا دیکھتی رہی اور جب وہ نظروں اوجھل ہو گئی تھی وہ تھکی تھکی سی واپس خیمے میں آ گئی۔ کچھ دیر یونہی پریشان سی بیٹھی رہی۔

”اس نے کہا تو ہے وہ میری مدد کرے گا۔ یوں خوامخواہ بیٹھ کر پریشان ہونے سے میرا پرابلم نہیں ہو جائے گا۔ اس طرح بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا ہی لوں۔“ خود کو سمجھاتی وہ کھڑی ہوئی اور باہر نکل کر جھیل کی طرف آ گئی۔ صبح کا اجالا ہلکا ہلکا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ چڑیوں چہچہاتی ہوئی آوازیں اور ٹھنڈی پرسکون نرم ہوا کے جھونکے اسے کچھ دیر کو تمام فکروں سے غافل گئے۔ وہ خدا کی قدرت کاملہ کا دیدار کرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کتنی خوب صورتی پیدا ہے۔ یہ درخت، پھل، پھول اور یہ بہتا صاف شفاف پانی وہ کتنی ہی دیر کھڑی مبہوت سی دیکھا حسن دیکھتی رہی۔ درختوں پر بیٹھی چڑیاں اور دوسرے چرند پرند، رب کائنات کی حمد و ثنا کرنے مصروف تھے۔ اس نے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ منہ دھویا تو طبیعت ایک دم ہشاش بشاش ہو گئی۔ پھر وضو کیا اور واپس خیمے میں آ گئی۔ نہ قبلے کا پتا تھا نہ یہ کہ نماز کا ٹائم ہوا ہے یا نہیں لیکن وہ اللہ حضور نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر اللہ سے اپنی اس پریشانی سے نجات کی رو رو کر دعا مانگیں۔ عجیب سا سکون اور طمانیت اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے لیے چائے بنانے کا سوچا چولہے کے پاس آ گئی۔ وہ شاید جلدی میں اپنے لیے چائے بنا کر گیا تھا۔ اس لیے چائے کا کپ کیتلی ویسے ہی پڑے تھے۔ برتن دھونے کا تو یہاں کوئی انتظام نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اس کے بنا ہوئے کالے رنگ کے بیگ کی طرف بڑھی تاکہ اس میں سے دوسرا کپ اور چائے کی پتی د نکال سکے۔ بیگ میں خشک خوراک خاصی مقدار میں موجود تھی۔ چائے کی پتی، چینی اور خشک دو

تھا۔ مگر کپ کوئی اور نہ تھا۔ مجبوراً وہ واپس جھیل تک گئی اور کپ وہاں سے دھو کر لائی۔ چائے کے تھ اس نے رات کا کھلا ہوا بسکٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔ چار بسکٹ اور ایک کپ چائے پی کر اس نے عالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے اس ویرانے میں بھی اس کی خوراک کا بندوبست کر دیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے برتن واپس دھو کر رکھے۔ اس کے بستر کی چادر جھاڑی، کمبل تہ کیا۔ اید اس کے بے آرام ہونے کے خیال سے تمام چیزیں ویسی ہی پھیلی ہوئی چھوڑ گیا تھا۔ تمام کام کر فارغ ہوئی تو گھڑی کی سوئیاں صرف آدھا گھنٹہ ہی اوپر گئی تھیں۔ وہ اگرچہ منع کر کے گیا تھا مگر یوں لے چپ چاپ وہ کب تک بیٹھ سکتی تھی اس لیے میز پر پڑی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔ شکاریات سے ق اس کتاب کو وہ بمشکل دس منٹ ہی پڑھ پائی۔ اس کے بعد ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر آن کر لیا۔ اس نے یو لگا لیا جس میں بولی جانے والی زبان سے وہ قطعاً ناآشنا تھی۔ باہر نکل کر آس پاس کی تفریح کا ے یوں نہیں لے سکتی تھی کہ اگر راستہ بھول گئی تو کیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ کوئی پکنک اسپاٹ نہیں ہے جنگل ہے اگر کوئی جانور ٹکرا گیا تو کیا ہوگا۔ جانوروں کا خیال آیا تو ایک دوسری دل ہلا دینے والی سوچ اس کے ذہن میں آ گئی۔ اگر اس وقت یہاں کوئی جانور اندر گھس آئے تو میں کیا کروں گی۔ اس سوچ نا تھا وہ نئے سرے سے خوف میں مبتلا ہو گئی۔ اگرچہ خود کو ہر طرح بہلانے کی کوشش کی تھی کہ آخر وہ شکاری ہے اسے یہاں کے ماحول اور جگہوں کے بارے میں مکمل طور پر پتا ہوگا۔ اس نے اپنا یہاں سوچ سمجھ کر ہی لگایا ہوگا۔ یہاں یقیناً کوئی خطرے کی بات نہیں ہے مگر دل کو جکڑ لینے لے اس خوف کو وہ زائل نہ کر سکی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بیٹھے بیٹھے درود شریف کا ہی ورد کرتی رہی۔ سے دوپہر ہوئی اور دوپہر سے شام وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ناشتے کے بعد سے اس نے ایک گلاس تک کا نہ پیا تھا۔ گھڑی نے چار بجائے تو اس نے شکر ادا کیا۔ بس اب وہ آنے والا ہوگا۔ کل بھی لوگ اس وقت آئے تھے۔ مگر چار تو کیا ساڑھے چھ ہو گئے اور وہ واپس نہ آیا تو اسے عجیب و یب وہم ستانے لگے۔

”وہ اسی شیر کا شکار کرنے گیا ہے یقیناً۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”اور اگر وہ خود اس شیر کا شکار بن گیا لیا ہوگا۔ میں یہاں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہوں گی اور وہ وہاں شیر کا ڈنر بنا پڑا ہوگا۔“ اس سوچ کے نے کی دیر تھی وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی خیر اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ دو ت نفل حاجات پڑھ کر وہ اس کے زندہ سلامت لوٹ آنے کی دعائیں مانگ ہی رہی تھی کہ جیپ رکنے آواز آئی۔

”شکر ہے خدایا۔“ اس نے فوراً ہی اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنی دعاؤں کی مقبولیت پر خوش ہوتی کھڑی ئی۔ وہ اندر آیا تو دوپٹہ سر پر نماز کے اسٹائل میں اوڑھے وہ اسی طرف نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”شکر ہے آپ واپس آ گئے۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔“ وہ بڑی خوشی اور مسرت سے بھرپور از میں اس سے مخاطب ہوئی تو وہ ایک آدھ سیکنڈ اس کی طرف گھورتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا اور جیکٹ اتار کر منے کارپٹ پر پھینک دی۔ اس کے بعد اپنے لانگ شوز بڑے بے رحمانہ انداز میں گھسیٹ کر اتارے انہیں بھی اچھال کر دور پھینک دیا۔ وہ جو اپنی بات کا کوئی بھی جواب نہ ملنے پر کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی ما کے غصے اور ناراضگی بھرے انداز میں سہم کر رہ گئی۔ شرٹ کے بٹن کھول کر وہ شاید شرٹ بھی اتار کر

چھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کی طرف دیکھ کر رک گیا اور بٹن واپس بند کرتا ہوا غرا کر بولا۔

''کیا مصیبت ہے۔ میرے سر پر کیوں کھڑی ہو۔ پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب تم جیسی بلا میرے پیچھے پڑی۔'' وہ اس بلاوجہ کی پھٹکار پر بری طرح کھول کر رہ گئی۔ مگر حالات اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ وہ اسے دو چار کھری کھری سنا سکتی۔ اس لیے چہرے کے تاثرات کو دوستانہ ہی رکھا یوں جیسے وہ اس کے بجائے کسی اور پر برس رہا ہے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ سگریٹ اور لائٹر ٹیبل پر سے اٹھا کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری سگریٹ پیتا وہ پتا نہیں کس ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے کھڑی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''اس وقت تو موصوف اتنے جلال میں لگ رہے ہیں ان سے بات کی کیسے جائے؟'' وہ اپنے آپ سے بولی اور پھر بڑی مشکلوں سے تھوک نگلتی اپنی ہمت بندھاتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''سنیں آپ نے کہا تھا آپ میری ہیلپ کریں گے۔ دیکھیں میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آپ یہاں قریب ترین جو بھی شہر ہو وہاں تک مجھے پہنچا دیں پلیز۔'' ڈرتے ڈرتے بڑی مشکلوں سے اس نے اپنی بات مکمل کی تو وہ جو اتنی دیر سے اس کے وجود سے یکسر بیگانہ اور بے نیاز نظر آرہا تھا اس کی طرف دیکھے بغیر بڑے غصے سے بولا۔

''میں نے کوئی تمہارا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔ کیا بات ہے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اکیلے جنگلوں کی سیر کرنے کے لیے بھیجتے ہوئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ لے کر مصیبت میرے سر ڈال دی۔ دیکھو بی بی تمہارے جہاں سینگ سمائیں چلی جاؤ۔ میں اس وقت سخت غصے میں ہوں۔ تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ مجھ سے بات نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' بات کے اختتام پر اس کی طرف سخت خار اور جھنجھلاہٹ سے دیکھا گیا۔

''میں اکیلی نہیں تھی۔ ہم لوگوں کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔۔۔ وہ تو۔۔۔'' وہ اپنی یہاں موجودگی کی وضاحت کرنا چاہ رہی تھی کہ اس نے بڑی بیزاری سے اسے ٹوکا۔

''مجھے تمہاری غم زدہ داستان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ برائے مہربانی مجھے معاف ہی رکھو۔ یہاں رہنا ہے تو خاموشی سے رہو ورنہ جہاں دل چاہے چلی جاؤ۔ میں جب تک اپنا ٹارگٹ اچیو نہیں کر لوں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔ تمہارے اوپر میرا یہی احسان کافی ہے کہ میں نے تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ توقع نہ رکھنا۔'' اور وہ جو اتنی دیر سے بلاوجہ کی ڈانٹ پھٹکار سن رہی تھی۔ اس کے اتنی بدتمیزی سے بات کرنے پر غصے سے پاگل ہو گئی۔

''بھاڑ میں گئی ساری مصلحت یہ جنگلی خود کو سمجھتا کیا ہے۔ اتنی باتیں تو میں نے آج تک کسی کی نہیں سنی ہیں۔''

''رکھیے اپنا یہ احسان اپنے پاس سنبھال کر۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ جیسے بدتمیز اور بے ہودہ انسان کا احسان لینے کی۔ جسے اس بات کا بھی کوئی لحاظ نہیں کہ میں ایک کمزور، بے بس اور پریشان لڑکی ہوں اور صرف لڑکی ہی نہیں ہوں آپ کی ہم وطن اور ہم مذہب بھی ہوں۔ آپ کے لیے وہ درندے انسانی جانوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جا رہی ہوں میں یہاں سے۔'' بھرائی ہوئی آواز میں بولتی وہ باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ وہ سامنے بیٹھا ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا

...وں میں کچھ حیرانی بھی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے تھے جنہیں وہ بڑی بے دردی سے ہاتھوں کی ...ت سے صاف کرتی اس سے بولی۔

''اب چاہے میں یہاں سسک سسک کر مر جاؤں مگر آپ سے مدد مانگنے نہیں آؤں گی۔ اتنی انا تو ...میں بھی ہے۔ مگر جاتے جاتے آپ کو بتا دوں کہ آپ ایک بدتمیز، جنگلی اور بداخلاق شخص ہیں۔ جو ...ائے لوگوں کو تکلیف پہنچانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا اور اگر میں مر گئی تو میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ ...لیے اپنے خزانے سنبھال کر۔ نہیں آؤں گی اب میں یہاں پر چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' آنکھوں کے ...گے آنسوؤں کی چادر سی تن گئی تھی۔ صاف دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ آنسو صاف کرتی وہ اس کی ...ف ایک آخری نگاہ ڈال کر خیمے سے باہر نکل آئی۔

اپنی یہ کمزوری اور رونا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر وہاں سے آ ہی رہی تھی تو رونے کیا ...یا ضرورت تھی۔ موصوف کے دماغ اچھی طرح درست کرنے چاہیے تھے۔ خود پر جھلاتی وہ کتنی دیر تک ...بر سمت کا تعین کیے چلتی رہی۔ غصے میں باہر نکل تو آئی تھی اب آس پاس سے آتی عجیب و غریب آوازیں ...سے ڈرا رہی تھیں۔ شام کے سات پونے سات بجے اس جنگل میں ویرانی کا عالم ایسا تھا۔ جیسے آدھی ...ت گزر چکی ہو۔

''ٹھیک ہے اگر میری قسمت میں یوں ہی مرنا لکھا ہے تو میں اسے بدل تو نہیں سکتی۔'' اپنی بے بسی ...آنسو بہاتی وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ چاروں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ عجیب سی وحشت اور ویرانی ...تھی۔ ایسا لگتا ابھی کہیں سے کوئی بھوت نکل آئے گا۔

''ایسی جگہوں پر تو بدروحیں بھی بسیرا کیے رکھتی ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''شاید ابھی کہیں سے کوئی ...ڑیل سامنے آجائے اور اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے مجھے نوچ کھسوٹ کر میرا خون پی جائے۔'' خوف ...ن گھری وہ گھٹنوں میں منہ دے کر بلک بلک کر رونے لگی۔ دیگر آوازوں میں اب اس کے رونے کی ...آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو۔ جیسے کہیں کا نواب ہے۔ اللہ کرے اسے تو وہ شیر ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے۔'' ...ور و شور سے روتی وہ اسے بددعائیں دے رہی تھیں۔

''پیٹھ پیچھے کسی کو بددعائیں دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔'' اس نے جانی پہچانی آواز سنی تو گھٹنوں پر سے منہ اٹھایا۔

اسے دیکھ کر آمنہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''چلو۔'' وہ اسے چلنے کا کہہ کر خود بھی آگے بڑھنے لگا۔ مڑ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ ...سے ٹس سے مس بھی نہ ہوئی تھی۔

''چلو بھئی۔ اچھا میری غلطی تھی۔ سوری۔ اب کیا تمہارے سامنے ہاتھ جوڑوں۔'' وہ منا بھی یوں رہا تھا جیسے اس کی دس نسلوں پر احسان کر رہا ہو۔

''نہیں جاؤں گی کبھی بھی نہیں جاؤں گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اتنی بے غیرت نہیں ہوں کہ مجھے اتنا ذلیل کیا جائے اور میں پھر بھی چلی جاؤں۔'' اتنی دیر سے چیخ چیخ کر رونے کی وجہ سے آواز بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ آنسو دوبارہ بہنے کے لیے تیار ہونے تھے۔

''سوچ لو۔ جہاں تم اس وقت بیٹھی ہو یہ جگہ سانپوں کا گڑھ ہے۔ رات کے وقت تو خصوصیت کے ساتھ درختوں پر سے اتر کر زمین پر چہل قدمی فرماتے ہیں اور سانپ بھی کون سا کوبرا۔ ویسے تو یہاں اڑنے والے سانپ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں خیر تمہاری مرضی۔'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا اور ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ جبکہ وہ سانپوں کی اس وادی میں بیٹھی ہی رہی آخر کو یہ اس کی انا کا مسئلہ تھا۔ اچانک وہ چیخا تھا۔

''ارے تمہارے پیچھے سانپ ہے۔ ہلنا نہیں۔'' جواب میں وہ اس سے بھی بلند و بالا چیخ مار کر ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور بھاگ کر اس کے پیچھے آ کر چھپ گئی۔ مضبوطی سے اس کی قمیص پکڑے وہ اس کے کندھے پر سے اچک کر سامنے اس پتھر کی طرف دیکھنے لگی جس پر کچھ دیر پہلے وہ آرام فرما تھی۔

''کک۔۔۔کہاں ہے سانپ مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔'' اس کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی تھی۔

''پتا نہیں کہاں گیا۔ ابھی تو یہیں تھا۔ خیر جانے دو ہمیں کیا۔ چلو چلیں۔'' وہ جواب میں بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔ آنلہ نے اس کی قمیص چھوڑ دی اور دوبارہ اسی طرف غور سے دیکھا۔ سانپ کیا وہاں تو کسی چھپکلی کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

''تمہیں چلنا ہے یا نہیں۔ اتنی التجائیں تو میں نے آج تک زندگی میں کسی کی نہیں کی ہیں۔ حالانکہ تم یہاں بیٹھی مجھے کوس رہی تھیں مگر میں پھر بھی تمہیں لینے کے لیے آ گیا ہوں۔'' وہ اس پر احسان جتاتا ہوا بولا۔ وہ بے چاری تو ابھی تک سانپوں کے غم میں [illegible]

''سنیں کیا ابھی واقعی میرے پیچھے سانپ تھا۔'' وہ نگاہیں اس [illegible] جمائے بولی۔

''اس وقت کیا ابھی بھی تمہارے پیچھے درخت کی شاخ پر ایک سانپ جھول رہا ہے۔'' وہ بڑی بے نیازی سے بولا۔ جواب میں وہ ایک زوردار چیخ مار کر اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔

''جلدی چلیں یہاں سے۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' چہرے پر خوف و وحشت طاری کیے وہ اسے چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل روکا اور دھیرے سے بڑبڑایا۔

''ایڈیٹ۔'' وہ اس کی بڑبڑاہٹ سنے بغیر آگے بڑھ گئی تو وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''اگر ابھی یہ نہ آتا، میں تو کب کی اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہوتی۔'' اچانک اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی تو وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

''تمہیں تکلیف کیا ہے آخر۔ بات بے بات چیخیں مارتی ہو۔ تمہارے گلے میں خراشیں نہیں پڑتیں۔ مجھے تو اپنے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔'' وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔

''ابھی ابھی کوئی چیز میرے پیروں میں سے گئی ہے۔ شاید سانپ یا بچھو۔'' وہ اسے مطلع کرنے لگی۔

''کوئی چوہا دوڑا ہوگا۔ سانپ رینگتے ہیں۔ اچھلتے کودتے سانپ تم نے کب دیکھے ہیں۔'' وہ اس کے چہرے کی سفید پڑتی رنگت سے متاثر ہو کر اسے اطمینان دلانے لگا۔ کیا پتا تھا محترمہ صرف سانپ کے

اتنا ڈرتی ہیں۔ اگر جو کہیں اصلی سانپ دیکھ لیا تو پتا نہیں کیا حشر ہوگا۔ پھر اس کے پیروں پر اس [illegible]ڑی تو حیران ہو کر بولا۔

''تم ننگے پاؤں کیوں ہو؟''

''آپ نے اتنی بدتمیزی کی تھی میرے ساتھ۔ غصے میں، میں ننگے پاؤں ہی نکل آئی۔'' وہ اپنے [illegible]ی طرف دیکھتی اسے اس کی بدسلوکی یاد دلانے لگی۔

''میں نے بدتمیزی کی تھی؟'' وہ حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ''لڑکی جھوٹ ذرا کم ہی بولا کرو خدا کو کیا [illegible]اد گی۔ الٹا تم مجھے جنگلی، بے ہودہ اور پتا نہیں کیا کیا کہہ کر آئی تھیں۔ یہ تو میری اعلیٰ ظرفی ہے کہ [illegible]ر بھی تمہیں بلانے آ گیا ہوں۔'' اس کی بات پر وہ نئے سرے سے تپ گئی۔

''اچھا مجھے منحوس، مصیبت اور بلا کس نے کہا تھا۔'' وہ باقاعدہ طعنے دینے کھڑی ہو گئی۔

''اچھا چلو حساب برابر ہو گیا۔ کسی کا کسی پر کوئی ادھار باقی نہیں رہا۔ میرا خیال ہے اب اس ٹاپک [illegible]ختم کر دینا چاہیے۔'' وہ جھگڑا ختم کرنے لگا۔

[illegible]خاموشی سے چلتے وہ خیمے تک پہنچ گئے تھے۔

''تشریف لائیے میری قابلِ احترام اور انتہائی محترم مہمان۔ اگر آپ اندر آ کر میرے غریب [illegible]ے کو رونق بخش دیں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔'' اس کے سامنے سر کو جھکائے وہ بڑی [illegible]ی سے بول رہا تھا۔ مگر چہرے اور آنکھوں کے تاثرات ایک دوسرے سے متصادم نظر آ رہے تھے۔ [illegible]طرف عاجزی اور انکساری تھی دوسری طرف مخاطب کو زچ کر دینے والی چمک۔ وہ خاموشی سے کھڑا [illegible]کے اندر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کے پیچھے وہ بھی اندر آ گیا۔

''میرا خیال ہے یوں بات بات پر چڑ کر ناراض ہو کر ہی تم نے اپنی صحت کا یہ حال کر لیا ہے۔ لڑکی [illegible]نا رہا کرو۔ اچھی صحت کے لیے خوش رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ کچھ عرصے بعد لوگ تمہارا نام [illegible]ڑمی، بدمزاج در خبطی رکھ دیں گے۔'' وہ چولہے کی طرف بڑھتا ہوا اس سے بولا۔ پھر چولہا جلا کر اس [illegible]پوچھنے لگا۔

''کچھ کھایا تھا دوپہر میں؟'' جواب میں اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔

''صبح چائے پی تھی اور بسکٹ کھائے تھے۔''

''دیکھو اگر تم بیمار و بیمار پڑیں تو مجھ سے یہ توقع مت رکھنا کہ میں تمہاری تیمارداری کروں گا۔ حد [illegible]ئی۔ چلو میں تو اپنے کام کی دھن میں کھانے پینے سے غافل رہا لیکن تم۔'' وہ اسے ڈانٹ رہا تھا جب کہ [illegible]خاموش کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

''چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ میں آج تمہیں زبردست قسم کا خوب مزے دار سا پاستا بنا کر کھلاتا [illegible]ں۔'' وہ اچانک ہی اس پر مہربان ہو گیا تھا اور وہ اس کا یا پلٹ پر حیران تھی۔ بیگ سے پاستا کا پیکٹ اور [illegible]ب عدد چھوٹی سی پتیلی نکال کر وہ دوبارہ چولہے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور وہیں کارنر پر رکھے کین میں [illegible]ے پانی ڈال کر چولہے پر ابلنے کے لیے رکھ دیا۔ پانی ابلنے لگا تو وہ پیکٹ کھول کر پاستا اس میں ڈالنے [illegible]۔ وہ اسے ٹوکنا چاہ رہی تھی کہ صرف دو لوگوں کے لیے پورا پیکٹ بہت زیادہ ہے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ [illegible]ئی۔ اس کے کام کرنے کا انداز بالکل اناڑیوں والا تھا اور وہ سگھڑ ابن سگھڑ اس کے پھوہڑ پن کو برداشت

نہ کرسکی تو اس کے پاس آ گئی اور بولی۔

''آپ رہنے دیں۔ میں بنالیتی ہوں۔'' جواب میں اس نے کندھے اچکائے اور بولا ''موسٹ ویلکم یہ کام تو ویسے بھی میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ابھی اگر عبداللہ یہاں ہوتا تو اس کے ہاتھ کا پکا مزے دار کھانا کھا کر آپ خوش ہو جاتیں مگر افسوس۔'' وہ چولہے کے آگے سے ہٹ گیا تھوڑے سے پانی میں اوپر تک پاستا بھرا ہوا تھا۔ بے چاروں کو ڈوبنے کے لیے چلو بھر پانی بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ جواب دیتی اوپر اوپر سے تھوڑا سا پاستا نکالنے لگی۔ پھر اس سے بولی۔

''اگر آپ کی پرمشن ہو تو میں آپ کے بیگ سے نمک لے سکتی ہوں۔''

''جو دل چاہے لے لو۔ بس جلدی سے کھانا کھلا دو تمہیں ثواب ملے گا۔ پورے دن کا بھوکا پیاسا ہوں۔ مزید کسر دو گھنٹے تم نے منتیں کروا کر پوری کر دی ہے۔'' اسے جواب دیتا وہ خود ہی بیگ سے نمک نکال کر لے آیا اور پوچھنے لگا۔

''اور کچھ چاہیے؟''

''ہاں ایسا کریں مچھلی کا ایک ڈبا اور مشرومز کا ایک ڈبا لے آئیں۔'' سامان کا تفصیلی جائزہ تو وہ صبح ہی لے چکی تھی۔ وہ بڑی سعادت مندی سے دونوں چیزیں نکال کر لے آیا اور خود ہی اوپنر سے کھول بھی دیا۔

''پاستا بوائل ہو گیا ہے۔ اب اس کا پانی کہاں پھینکوں؟'' وہ اس سے پوچھنے لگی۔ تو وہ بولا۔

''لاؤ میں باہر پھینک آؤں۔'' وہ بڑا ہی اچھا بچہ بنا ہوا تھا یا شاید بھوک بہت شدید لگ رہی تھی۔ وہ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں یہ پانی کے ساتھ سب کچھ نہ پھینک آئے خود ہی پتیلی اٹھا کر باہر لے گئی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ پھر جتنی دیر وہ مچھلی اور مشرومز کو نمک اور کالی مرچ ڈال کر فرائی کرتی رہی وہ اس کے پاس ہی کھڑا اسے بغور کام کرتے دیکھتا رہا۔ فرائی کی ہوئی چیزیں اس نے پتیلی میں ڈال کر مکس کیا اور پلیٹ میں نکالنے لگی تو وہ خوب گہری سانس لیتا ہوا بولا۔

''خوشبو تو زبردست آ رہی ہے۔'' پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر اس نے اپنے لیے فرائنگ پین میں ہی پاستا نکال لیا کہ یہاں کپ، گلاس، چمچہ پلیٹ وغیرہ سب ہی چیزیں ایک ایک تھیں۔ وہ اپنی پلیٹ پکڑے کارپٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے لیے چی کے ڈبے میں سے چمچہ نکال کر وہ بھی وہیں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

''بڑے دنوں بعد کچھ ڈھنگ کی چیز کھانے کو ملی ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ کے پکے کھانے کی تعریف کر رہا تھا۔ پلیٹ خالی ہوئی تو وہ اپنے لیے اور نکال کر لے آیا جب کہ وہ کھا کر فارغ ہو بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا تم اتنی جلدی کھا چکیں؟'' وہ حیران ہوا آخر اس کا کل ندیدہ پن اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''اور لو، کیا تکلف میں اتنا تھوڑا سا کھایا ہے؟'' وہ شاید خلوص میں ہی کہہ رہا تھا مگر آئلہ کو لگا کہ وہ کل کے حوالے سے طنز کر رہا ہے۔

''میں اتنا ہی کھاتی ہوں۔ شکریہ۔'' اس کے جواب پر وہ خاموش ہو کر کھانا کھانے لگا تو اس نے [illegible] اسے اپنے حالات تفصیل سے سنا دینے چاہئیں تا کہ اسے پتا چلے کہ وہ کوئی ایسی ویسی گئی گزری [illegible] ہے۔

''کل تو میں پورے دن ماری ماری جنگل میں بھوکی پیاسی بھٹکتی پھری تھی۔ لیلیٰ کی تھرلنگ نیچر نے [illegible] کو مروا دیا۔ ہم لوگ تو اصل میں۔'' وہ ابھی اپنی داستان کا ڈھنگ سے آغاز بھی نہیں کر پائی تھی [illegible] بڑی بوریت سے ٹوک گیا۔

''ظاہر ہے کوئی ایکسیڈنٹ ہی ہوا ہو گا۔ شوق میں تو آپ یہاں پھر نہیں رہی ہیں۔ لہٰذا اس ذکر کو [جانے د]یجیے۔'' وہ دوسری مرتبہ اسے اپنے اوپر گزرے حالات کی تفصیل سنانے سے روک گیا تو وہ کچھ [illegible] ہو گئی۔ اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور بولا۔

''دیکھو لڑکی اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میں بڑا رقیق القلب واقع ہوا [ہوں۔ کـ]سی کی بھی تکلیف دیکھ نہیں سکتا اور آپ کی داستانِ غم تو یقیناً آہوں اور سسکیوں سے عبارت [ہو گی۔ مـ]یرا اس وقت رونے دھونے کا کچھ خاص موڈ نہیں ہے اور جب وہ المناک واقعات آپ مجھے [سنائیں] گی تو لازماً خود بھی روئیں گی۔ جب کہ پہلی ہی بیس پچیس لیٹر پانی آپ اپنے آنسوؤں کے ذریعے [illegible] ہیں۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ، آپ کو میرے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہے؟ میں کون ہوں؟ کہاں [سے آئی] ہوں؟'' وہ چڑ کر بولی تو وہ پلیٹ رکھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''میں بلاوجہ کے تجسس نہیں پالا کرتا۔ اچھا لڑکی اب یہ بتاؤ کافی میں بناؤں یا تم بناؤ گی۔'' اس نے [بات] بدل دی تو وہ کھڑی ہو گئی اور کافی بنانے لگی۔

''میرے لیے بلیک کافی بغیر شکر کے۔'' وہ فلور کشن پر نیم دراز ہوتا ہوا بولا۔

[illegible] کپ اس کے ہاتھ سے لے کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنے لیے گلاس میں کافی لیے وہ دوسرا کشن [illegible] کر بیٹھ گئی۔ کافی کا پہلا گھونٹ لے کر وہ اس سے بولا۔

''لڑکی اس میں شک نہیں کہ تم کھانا اور کافی دونوں ہی بہت اچھے بناتی ہو۔''

''میرا نام لڑکی نہیں ہے۔ میں آئلہ ہوں۔ آئلہ اکرام۔'' وہ اس مسلسل لڑکی کی گردان سے تنگ [آ کر اـ]سے ٹوک گئی۔

''اوہ آئلہ اکرام۔ میں بھی کتنا بھلکڑ ہوں۔ حالانکہ اخبارات میں آئے دن آپ کا تذکرہ ہوتا ہے [ابھی پچھـ]لے ہی دنوں تو بی بی سی والوں نے آپ کی بائیوگرافی نشر کی ہے۔ بس میرے ذہن سے نکل گیا۔'' [illegible] پر سنجیدگی مگر آنکھوں سے جھانکتی شرارت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ آئلہ نے [اس کـ]ے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کافی پی کر گلاس اٹھا کر میز پر جا کر رکھا اور واپس کارپٹ پر آ کر [بیٹھ گئی]۔ وہ جیسے اس کی خاموشی کو بھی انجوائے کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔'' وہ کھڑا ہوتا ہوا جماہی روک کر بولا۔ پھر اس کے [جواب] کا انتظار کیے بغیر وہ بیڈ پر لیٹ گیا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ بھی بند کر دی۔ ایمرجنسی لائٹ [کو] شاید ری چارجنگ کی شدید ضرورت تھی۔ اس کی مدھم سی روشنی گل ہوئی تو چاروں طرف گھپ

اندھیرا چھا گیا۔ اس نے کوئی چیز اس کی طرف اچھالی اور بولا۔

''یہ لے لو۔'' وہ جو ابھی تک ویسی ہی بیٹھی تھی ہاتھ لگا کر چھو کر دیکھا تو پتا چلا کہ اس نے کمبل اسے دیا ہے۔ دن میں تو موسم ٹھیک ٹھاک تھا۔ مگر رات کو بڑی شدید قسم کی سردی ہو جاتی تھی۔ کل رات بھی سارا وقت سردی سے ٹھٹھرتی رہی تھی۔ پہلے تو اس نے تکلف کے مارے انکار کرنا چاہا پھر خیال آیا یہ تکلف اسے ٹھنڈ میں مار ڈالے گا لہٰذا آرام سے فلور کشن پر دراز ہو کر اس نے کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اس کے کمبل میں سے بڑی پیاری اور سانسوں کو معطر کر دینے والی خوشبو آ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کوا سا پرفیوم استعمال کرتا تھا۔ مگر اس کی خوشبو لاجواب تھی۔ وہ اس خوشبو کو پوری شدتوں کے ساتھ محسو کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی تو اس کی آواز آئی۔

''میں تمہیں کل صبح ہی چھوڑ آتا، اپنے دوستوں سے لگائی ہوئی شرط اور اپنی شکست کو بھول کر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اس کا شکار اب صرف میری ضد کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ کئی انسانی جانوں کے تحفظ بھی سوال ہے۔ ہم لوگ تو صرف اس کی پھرتی اور چالاکی کا سن کر اس کا شکار کرنے چلے آئے تھے۔ ا کی عیاری اور مکاری سے تنگ آ کر میرے دوستوں نے سرنڈر کر دیا اور یہاں سے چلے گئے۔ مگر میں۔ کبھی ہار کا لفظ نہیں سنا، مجھے نفرت ہے ہارنے سے۔ چنانچہ ان کے جانے کے باوجود اپنے مشن پر رہا۔ یہاں پاس کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا تو پتا چلا کہ دو بچے اور ایک عورت اب تک اس کا لقمہ بن چکے ہیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لیے شدید قسم کا خطرہ بنا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا ختم کیا جانا انتہائی ضرو ہے۔ اس روز وہ میرے شکنجے میں آ ہی گیا تھا کہ تم نے چیخ کر معاملہ بگاڑ دیا۔ آج بھی تمام دن میں ا کی تلاش میں مارا مارا پھرا مگر سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔'' آ جواب میں خاموش لیٹی رہی تو وہ بولا۔

''کچھ تو فرمایئے آنسہ آئلہ اکرام صاحبہ۔'' اس کے نام پر خاصا زور ڈال کر بولا گیا تھا۔

''میں نے آپ کی تمام تقریر بغور سن لی ہے محترم ہارون وقار احمد صاحب۔'' وہ اپنے مخص چڑچڑے پن سے بولی تو وہ ہنس پڑا۔ گھپ اندھیرے میں اس کی شکل تو کیا نظر آتی لیکن ہنسی ہی دے رہی تھی۔

''بہت خوب ویسے تم نے میرا نام کہاں سے معلوم کیا۔''

''ٹائمز نے اپنی تازہ ترین اشاعت میں آپ کا تفصیلی انٹرویو شائع کیا تھا۔ بس وہیں سے میں معلومات کے یہ انمول خزانے جمع کیے۔'' اسے ادھار رکھنے کا کوئی خاص شوق نہ تھا اس لیے بے نیازی سے جواب دیتی اسے چڑانے کی کوشش کی تو وہ بے ساختہ بولا۔

''تم نے پڑھا تھا میرا انٹرویو۔ تب ہی میں کہوں تم مجھ سے اتنی امپریس کیوں رہتی ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولا اور وہ اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر چڑ گئی۔

''ویسے تنک چڑھی، آپس کی بات ہے ٹائمز والوں نے تو پتا نہیں میرے بارے میں کچھ چھاپا نہیں مگر تم کبھی سڈنی آ کر دیکھو میں وہاں پورے آسٹریلیا میں کتنا مشہور و معروف ہوں۔ وہاں کے میگزینز میں اکثر میرے کالم اور انٹرویوز چھپتے رہتے ہیں۔ ٹی وی کے بہت سے پروگرامز کی کمپیئرنگ ہوں۔ بڑا پاپولر ہوں میں وہاں۔ پبلک فگر جس کے گرد لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔'' وہ اپنی قصیدہ خوانی

یا تھا۔

''آپ کو اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔'' وہ اس کی اپنی تعریفوں پر کچھ چڑ کر ا۔

''آئلہ خاتون یہ میاں مٹھو بننا نہیں کہلاتا بلکہ اسے خود شناسی اور اپنے آپ پر کونفیڈنس کہا جاتا ہے۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔

''صرف آئلہ ہوں میں۔'' وہ پھر چڑ گئی ''اور بائی دا وے اسے خود شناسی نہیں خود پسندی کہا جاتا ہے۔''

''صرف آئلہ اگر یہ خود پسندی ہی ہے تب بھی کچھ غلط تو نہیں۔ شب بخیر۔'' اپنی بات ختم کر کے اس نے کروٹ دوسری طرف کر لی تو وہ بولا۔

''شب بخیر۔'' اندھیرا اتنا تھا کہ وہ نہ تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتی تھی نہ یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کی طرف منہ کیے ہوئے لیٹا ہے یا دوسری طرف، آج دن بھر کے تمام واقعات سوچتے سوچتے اسے پتا نہیں کب نیند آ گئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ چولہے کے پاس کھڑا چائے پی رہا تھا۔ وہیں میز پر اس نے موم بتی جلا کر رکھ دی تھی۔ وہ یونہی لیٹے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی جو سلائس اور چائے جلدی جلدی حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔ گیلے بکھرے ہوئے بال بتا رہے تھے کہ صبح، صبح نہایا گیا ہے۔ گھڑی آج بھی کل کی طرح صبح کے پونے چار بجا رہی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی گھسی ہوئی جینز کے اوپر اس نے ہاف سلیوز کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پایا تو مسکرا کر بولا۔ ''سو جاؤ۔ ابھی بہت صبح ہے۔'' وہ جواب میں خاموش پڑی رہی۔ چائے کا کپ وہیں رکھ کر وہ اپنے بیگ میں سے رائفل اور ریوالور وغیرہ نکالنے لگا۔ اس کے بعد شوز پہنے۔ گھڑی باندھی اور جیکٹ پہن کر باہر نکلنے لگا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''اگر وہ ایک ہفتے تک آپ کے قابو نہ آیا تو کیا آپ ہفتہ بھر یہیں رہیں گے۔''

''ایک ہفتہ کیا۔ میں تو اگر وہ سال بھر ہاتھ نہ آئے تو پورا سال یہاں گزار دوں۔'' وہ جواب دیتا باہر جانے لگا تو وہ پریشان سی ہو کر بولی۔

''کچھ میرے حال پر رحم فرمایئے۔ میرا کیا ہو گا۔''

''تمہارا کیا ہو گا۔ رہنا یہاں آرام سے۔ مجھے مزے مزے کے کھانے پکا کر کھلانا اور ثواب دارین حاصل کرنا۔ اچھا باقی باتیں واپسی پر ہوں گی۔ خدا حافظ۔'' وہ اس کے پریشان حال چہرے پر تفصیلی نگاہیں ڈالتا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نیند تو کیا آنی تھی۔ جب تک وہ ہوتا تحفظ کا ایک عجیب سا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا اور اس کے جاتے ہی وہ احساس ختم ہو جاتا۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ ناشتا کیا۔ سارا پھیلاوا سمیٹا اور کارپٹ پر بیٹھ کر وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگی۔

''کتنا گندا حلیہ ہو رہا ہے میرا کاش کوئی دوسرے کپڑے ہوتے تو میں بدل لیتی۔'' اس کی نفاست

پسند طبیعت پر اپنا یہ میلا کچیلا حلیہ بڑا گراں گزر رہا تھا۔ دھول اور مٹی میں اٹے تین دن کے پہنے ہوئے کپڑے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔

''اسے کیا پتا چلے گا وہ تو شام گئے آئے گا۔ تب تک تو میرے کپڑے سوکھ بھی گئے ہوں گے اور میں اپنے اسی حلیے میں نظر آؤں گی۔'' اپنے آپ کو سمجھاتی وہ اپنے لیے شجر ممنوعہ بقیہ دونوں بیگز کی طرف بڑھی۔ پہلے والے بیگ میں تو اس کی ریوالور، کارتوس، خنجر، کیمرہ اور شکار سے متعلق دوسرا سامان رکھا تھا۔ دوسرے بیگ میں کپڑے رکھے دیکھ کر وہ ایکسائیٹڈ ہوگئی۔ ''کپڑے اس طرح نکالنے ہیں کہ اسے پتا نہ چلے کہ کوئی اس کے بیگ میں گھسا تھا۔'' بڑی احتیاط سے اس نے سب سے اوپر رکھی ہوئی گرے کلر کی جینز اور ڈارک بلیو شرٹ نکالی۔ وہیں کپڑوں کے پاس اس کا شیمپو اور صابن بھی رکھا ہوا تھا وہ بھی نکال لیا اور جھیل کی طرف آ گئی۔ خوب اچھی طرح گھٹنوں تک رگڑ رگڑ کر پیر دھوئے، کہنیوں تک ہاتھ دھوئے۔ دو مرتبہ بالوں میں شیمپو کیا۔ کہاں وہ روز نہانے والی اور کہاں یہ حال۔ خوب اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر وہ واپس خیمے میں آئی کپڑے بدلے۔ اس کے برش سے بال سلجھائے اور واپس جھیل پر آ کر جلدی سے اسی صابن سے اپنے کپڑے دھوئے۔ کپڑوں کو خوب اچھی طرح نچوڑا تا کہ جلد سے جلد سوکھ جائیں اور وہیں خیمے کے پاس ایستادہ ایک بڑے سے پتھر کے اوپر خوب پھیلا کر کپڑے ڈال دیے۔

''دھوپ خاصی تیز ہے۔ ابھی آدھا ایک گھنٹے میں کپڑے سوکھ جائیں گے۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ خیمے میں آ کر بیٹھ گئی اور کپڑے سوکھنے کا انتظار کرنے لگی۔ لاکھ وہ یہاں موجود نہیں۔ مگر اس کی اجازت کے بغیر اس کی چیزیں استعمال کرنے اور کپڑے پہننے پر وہ خود کو چور سا محسوس کر رہی تھی۔ عین اسی وقت جیپ رکنے کی آواز سنائی دی تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کا دل چاہا وہ کہیں چھپ جائے یا غائب ہو جائے اسے بھی آج ہی اتنی جلدی واپس آنا تھا۔ وہ ایک دم کھڑی ہو کر جیسے اپنے چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگی اسی وقت وہ اندر داخل ہوا۔ فطری سی بات تھی۔ اس چھوٹے سے خیمے میں اس کی سب سے پہلے نظر اسی پر پڑنی تھی۔ جبکہ وہ بالکل اس کے سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتے ہوئے قد کے مالک مضبوط و توانا مرد کے کپڑے اس کے دھان پان سے وجود پر کیسے سما سکتے تھے۔ جینز کے پائنچوں کو پتا نہیں کتنی دفعہ فولڈ کر کے اپنے ناپ کا بنایا تھا۔ شرٹ کے کندھے پتا نہیں کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ہاف سلیوز فل محسوس ہو رہی تھیں اور ٹی شرٹ کی لمبائی گھٹنوں کے قریب قریب ہی تھی۔ وہ اتنی بری طرح اب تک کی زندگی میں کبھی شرمندہ نہ ہوئی تھی جتنا آج ہونا پڑ رہا تھا۔

اندر گھستے ہی اس نے بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا جو شرمندگی سے سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ اس میں تو اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اس کی طرف ایک نظر ہی اٹھا کر دیکھ لیتی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھا اور بیگ میں سے اپنا ریوالور اور کچھ دوسرا سامان نکالنے لگا۔ دو تین منٹ میں اس کام سے فارغ ہو کر پلٹا تو وہ ہنوز اسی طرح کسی بت کی مانند کھڑی تھی۔

''تمہیں کسی نے سزا میں کھڑا کیا ہے۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔ یہ میرا ریوالور تنگ کر رہا تھا تو میں دوسرا لینے کے لیے آیا تھا۔'' اس پر ایک نظر ڈالتا وہ باہر نکلنے لگا پھر کچھ خیال آنے پر رک گیا اور اس سے بولا۔

''کل کی طرح بھوکی مت بیٹھی رہنا۔ کچھ کھا لینا ٹھیک ہے۔'' اس نے بمشکل سر اٹھا کر اس کی ـ دیکھا تو وہ اسی کو دیکھ رہا تھا بڑے عام سے انداز میں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں۔ بڑی ں سے سر ہلایا کہ وہ جواب کا منتظر تھا۔ ہارون خدا حافظ کہتا جا چکا تھا اور وہ خود کو کوستی کارپٹ پر گر پڑی ی۔

''کیا سوچا ہوگا اس نے میرے بارے میں۔'' اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا ییں اس سے پوچھ کر اس کے کپڑے لے لیتی وہ منع تو نہیں کرتا کم از کم اس شرمندگی سے تو وہی بات ں تھی۔ مگر اتنی عقل ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔'' اس کی ہدایت کے برعکس وہ بھوکی بیٹھی رہی۔ خود پر ۔ اتنا آ رہا تھا کہ کھانا کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اس کے کپڑے سوکھ گئے تو اس نے جلدی سے ، کے کپڑے ایسے اتارے جیسے بہت بڑا گناہ کر رہی تھی۔ اپنا ریڈ اور بلیک پرنٹڈ کاٹن کا سوٹ پہن کر ، کی جان میں جان آئی۔ اس کے کپڑے اگرچہ آملہ نے تھوڑی دیر ہی پہنے تھے۔ مگر اخلاق کا تقاضا یہ کہ انہیں دھو کر رکھا جائے اس لیے کپڑے دھو کر سکھائے اور پھر اس طرح طے کر کے انہیں بیگ میں ، دیا۔ آج کا تمام دن اسی مصروفیت کی نذر ہو گیا تھا۔ کبھی ایک جوڑا دھل رہا ہے کبھی دوسرا سوکھ رہا ے۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو سکون کا سانس لیا۔ جیسے کسی مصیبت سے چھٹکارا مل گیا ہو۔ کپڑوں کے ئلے سے نجات ملی تو اس کی بے توجہی کی شکایت کرتے بالوں کی آخر کار قسمت جاگ گئی۔ بالوں کو سلیقے ے بینڈ میں جکڑا اور کارپٹ پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

چھ بجے کے قریب اس کی واپسی ہوئی تو وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے بڑی بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ آملہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی گہری اہوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

''کیا حال چال ہیں صرف آملہ آپ کے۔ آج کا دن کیسا گزرا؟'' وہ اس کی بات پر اپنے مخصوص راز میں چڑ کر کچھ بھی نہ بولی۔ ویسے ہی چپ بیٹھی رہی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر شوز اتارنے لگا پھر اچانک وئی بات یاد آنے پر جیسے خود پر افسوس کرنے لگا۔

''میں بھی کتنا پاگل ہوں۔'' اس نے واپس شوز پہننے شروع کیے تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''بڑے زبردست قسم کے تیتروں کا شکار کر کے لایا ہوں۔ انہیں بھون کر کھائیں گے۔ میں نے وچا تم کو کنگ میں ایکسپرٹ ہو تم سے پوچھ لوں انہیں تیار کرنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہاں پاس ہی چھوٹا سا دیہات ہے۔ ویسے تو وہاں کسی قسم کی کوئی سہولتیں نہیں ہیں۔ مگر کھانے پینے ا سامان مل جاتا ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آملہ نے دو چار یزوں کے نام بتائے تو وہ ''میں ابھی آدھا ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔'' کہہ کر چلا گیا۔

وہ واپس آیا اور چیزیں اس کے ہاتھ میں پکڑا کر خود دوبارہ باہر نکل گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے باہر ائی۔ سامنے ہی بیٹھا وہ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے خنجر سے تیتروں کا تیا پانچا کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر

بولا۔

''اندر سے کوئی برتن لے آؤ۔ تاکہ انہیں دھولیا جائے۔'' اس نے حکم کی تعمیل کی۔

''میرا خیال ہے اس کام میں تم مجھ سے زیادہ ماہر ہوگی۔ لہٰذا انہیں دھونے کی زحمت تم ہی کرلو۔''

اس نے برتن اسے پکڑایا تو وہ خاموشی سے جھیل کی طرف جانے لگی۔ اس سے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ رات کے وقت وہاں جاتے مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ یقیناً مذاق اڑاتا کہ وہ دو قدم کے فاصلے پر جانے سے ڈر رہی ہے۔ دن بھر میں وہ اس جگہ کتنی دفعہ آئی تھی۔ مگر اب عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ شاید اندر خیمے میں چلا گیا تھا۔ اس کا خوف دو چند ہوگیا۔ اس کی موجودگی سے جو تھوڑی بہت ڈھارس تھی وہ بھی جاتی رہی۔

''وہاں کہاں دیکھ رہی ہو؟ میں یہاں ہوں۔'' اپنے بالکل قریب اس کی سرگوشی سنائی دی تو وہ خوف سے چیخ پڑی۔

''آئندہ اگر تم میرے سامنے چیخیں نا تو میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔'' وہ اسے دھمکی دینے لگا۔

''آپ کہاں سے آگئے میں نے آپ کو آتا دیکھا ہی نہیں'' وہ ابھی تک حیران تھی۔

''انہیں پتھروں پر چل کر آیا ہوں کہ آپ کے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔ آپ کو ڈرنے سے فرصت ملتی تو کہیں اور دیکھتیں۔'' وہ بڑے آرام سے شعر کا بے محل استعمال کر کے مسکرا رہا تھا۔

''مجھے پتا تھا ڈر کے مارے تمہاری حالت خراب ہے۔ اسی لیے آگیا۔ اب جلدی سے کچھ ہاتھ بھی چلاؤ۔ بھوک لگ رہی ہے۔'' اس کی بات پر وہ تیز رفتاری سے کام کرنے لگی جبکہ وہ اس کے برابر میں بیٹھ کر کنکر اٹھا اٹھا کر جھیل میں پھینکتا رہا۔ دھلائی کا کام تمام ہوا تو وہ واپس خیمے میں آگئے اور آنکہ نے جلدی سے تیتروں پر مسالا لگانا شروع کر دیا وہ پتا نہیں دوبارہ کہاں چلا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو وہ فارغ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے بے ساختہ بڑی فکرمندی سے پوچھا تو وہ پتا نہیں کس بات پر ہنس پڑا۔ اپنی بات کے جواب میں اس کی ہنسی آنکہ کو سخت زہر لگی۔

''ایسا میں نے کون سا لطیفہ سنا دیا ہے جو موصوف کو اتنی ہنسی آرہی ہے۔'' وہ اس کے ناراض چہرے پر ایک تفصیلی نظر ڈالتا ہوا بولا۔

''ایک مرتبہ اپنے ایک انڈین دوست کے اصرار پر کہ ہمارے ہاں کی فلمیں بڑی زبردست ہوتی ہیں ایک انڈین مووی دیکھی تھی۔ زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ۔'' وہ دوبارہ کچھ سوچ کر ہنس پڑا پھر اس کے سامنے ہی کارپٹ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''اس فلم میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے بڑی شدید محبت کرتے ہیں مگر ظالم سماج ان کے راستے میں روڑے اٹکا دیتا ہے۔ آخر کار تنگ آکر دونوں اپنا اپنا گھر چھوڑ دیتے ہیں اور ایک ویران بیابان مگر بے حد حسین اور پر فضا جنگل میں آجاتے ہیں۔ اب کیونکہ وہ ہیرو ہیروئن تھے اور ڈائریکٹر ان پر بے حد مہربان تھا اس لیے تمام حالات ان کے حق میں ہوتے ہیں۔ ہیرو صاحب جو کالج میں لا پڑھ رہے تھے اچانک ایک بہترین آرکیٹیکٹ بن جاتے ہیں اور درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر نہایت شاندار سا گھر تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سمیت سب خاموش ہیں

کہ دیگر بلڈنگ میٹریل انہیں کہاں سے دستیاب ہوا۔ خیر جناب گھر بن گیا اور دونوں نے وہاں رہنا شروع کر دیا۔ ہیرو صاحب صبح سویرے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے چلے جاتے اور ہیروئن بے چاری ان کے انتظار میں ایک آدھ غمگین گانا گاتی ان کے لیے مزے مزے کے پکوان تیار کرتی ہے۔ اس بارے میں بھی تمام متعلقہ افراد خاموش ہیں کہ کھانے پینے کا سامان مہیا کہاں سے ہوتا تھا بھئی کہیں نہ کہیں سے آہی جاتا ہوگا۔ ہم آپ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔ اس وقت میں نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ اتنی بے تکی اور فضول فلمیں اسی کو مبارک ہوں جن کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر، ایک جنگل میں خوش و خرم رہ رہے ہیں باقی نہ کوئی بندہ ہے نہ بندے کی ذات۔''

اس نے اپنی بات ختم کی تو آنکہ کو اپنا چہرہ کچھ تپتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اتنا آؤٹ اسپوکن ہوگا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

''گوشت تو میرینیٹ ہوگیا ہے۔ کیا چولہے پر ہی تل لوں۔'' وہ اس کے سامنے سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی تو وہ اس کے بات بدل دینے پر ہنس پڑا اور خود بھی کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''تم ان فلموں کی اس قسم کی باتوں پر یقین کرتی ہو؟''

''میں فلمیں نہیں دیکھتی۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی اور خوامخواہ تیتروں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

''ابھی جب تم یہاں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں، مجھے برسوں پہلے کی دیکھی وہ فلم اچانک ہی یاد آگئی۔''

''میں آپ کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ وہ بری طرح چڑ گئی۔

''حد ہوتی ہے خوش فہمی کی بھی۔'' وہ اس کی بات پر ہنس پڑا اور بولا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ ہم دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ان فلمی ہیرو ہیروئن کی طرح رہ رہے ہیں۔''

وہ اس کی اس بات پر جل کر بولی۔

''لگتا ہے آج آپ بہت خوش ہیں۔''

''ارے تمہیں کیسے پتا چلا'' وہ حیران ہوا۔ وہ اس کی حیرت نظرانداز کر کے سنجیدگی سے بولی۔

''عام طور پر لوگ بے تحاشا خوش ہو کر فضول اور بے تکی باتیں کرنے لگتے ہیں اس لیے۔'' وہ اس کی بات کا برا مانے بغیر بدستور مسکراتا ہوا بولا۔

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ اب جلدی سے اپنی ذہانت کو کنفرم کراؤ۔ یہ بتا کر کہ میں اتنا خوش کس بات پر ہوں۔''

''آپ کی خوشی کا دائرہ غالباً ان چیتوں اور شیروں تک ہی محدود ہے۔ چنانچہ انہیں سے متعلق کوئی بات ہوگی۔'' وہ اس طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مان گئے بھئی تمہاری ذہانت کو۔ جلدی سے یہ اٹھا کر باہر لے چلو۔ وہاں میں نے تمہاری دعوت کا سارا ارینجمنٹ کیا ہوا ہے۔'' وہ اسے سراہتا ہوا برتن کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ تو وہ مسالا لگے تیتروں کو اٹھا کر اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئی۔ خیمے سے کچھ فاصلے پر اس نے لکڑیاں جلائی ہوئی تھیں۔ سیخوں سے ملتی جلتی وہ عجیب و غریب شے وہ پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔

’’کبھی تم نے اس قسم کا ڈنر کیا ہے۔‘‘ وہ سیخوں پر بوٹیاں چڑھاتا ہوا بولا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر خود بھی اس کی مدد کرانے لگی۔ گوشت کے بھوننے کی خوشبو اور لکڑیوں کے جلنے کی مخصوص مہک نے ماحول کو بڑا خوب صورت بنا دیا تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے وہ دونوں جیسے کوئی پکنک منا رہے تھے۔ کچھ دیر کو تو وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کن پریشان کن حالات کا شکار ہے اور یہ کہ اس کے گھر والے اس کے لیے کس قدر فکر مند ہوں گے۔ چودھویں کے چاند نے اپنی تمام تر روشنی جیسے یہیں نچھاور کر دی تھی۔ ماحول کا اثر تھا یا وہ تیتر واقعی بہت مزے دار تھے وہ فیصلہ نہ کر پائی اور اس سے بولی۔

’’اتنا شاندار ڈنر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ یہ ڈنر تو مجھے ساری زندگی یاد رہے گا۔‘‘ گرما گرم بوٹی منہ میں رکھتے ہوئے وہ اس سے بولی تو وہ سیخوں پر سے بوٹیاں اتارتا ہوا بولا۔

’’ہمارے ساتھ رہو گی تو ایسے ہی مزے آئیں گے۔‘‘ پھر کچھ سوچ کر اس سے بولا۔

’’تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ دعوت ہے کس خوشی میں؟‘‘ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولا۔

’’آج میں نے اس کا کام تمام کر دیا ہے۔ بڑا چالاک بنتا تھا۔ تمہیں تو شاید پتا نہ ہو بڑے بڑے سورما ابھی تک اس کے شکار کی خاطر یہاں آ کر مایوس لوٹ چکے تھے۔ یہ میرا اب تک کی زندگی کا شاندار ترین کارنامہ ہے۔ جس کام کو بڑے بڑے پروفیشنلز نہیں کر سکے وہ میں نے کر دکھایا۔ میرے دوست تو خوشی سے پاگل ہو جائیں گے جب انہیں میری کارکردگی کا پتا چلے گا۔‘‘ وہ بے حد خوش تھا۔ مسرت کے بے پایاں احساس سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس کی بات پر وہ بھی خوشی سے اچھل پڑی اور بولی۔

’’اس کا مطلب ہے اب آپ مجھے چھوڑ آئیں گے۔‘‘ وہ اس کے چہرے پر ایک تفصیلی نظر ڈالتا ہوا بولا۔

’’تمہیں چھوڑنے کا کیا مطلب ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں ابھی یہاں مزید قیام کروں گا۔‘‘ پھر کچھ دیر وہ کوئی بات سوچتا رہا اور اس سے بولا۔

’’میں تو ابھی رات ہی میں یہاں سے جانا چاہ رہا ہوں۔ مگر مسئلہ تمہارا ہے۔‘‘

’’کیوں میرا کیا مسئلہ ہے۔‘‘ وہ اس کی بات سمجھے بغیر بولی۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تو وہ مزید بولی۔

’’ابھی چلیں ناں۔ میری وجہ سے آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں آپ کو بالکل بھی پریشان نہیں کروں گی۔‘‘ وہ اسے چلنے کے لیے اکسانے لگی تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

’’پاگل ہو تم۔ پتا نہیں تمہارے گھر والوں نے اپنی اتنی کوڑھ مغز بیٹی کو اتنے خطرناک جنگل میں بھیج کیسے دیا۔‘‘ اس کی بات پر وہ حسب عادت چڑچڑے پن سے بولی۔

’’پھر میں اگر ساری بات سنانے کی کوشش کروں گی تو سنیں گے نہیں۔ لیکن میرے بارے میں اس طرح کی فضول الزام تراشیاں کرنے سے برائے مہربانی گریز فرمائیں۔‘‘ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بولا۔

’’اچھا تم دل چھوٹا نہ کرو۔ چلو سناؤ اپنی الم ناک داستان میں تمہاری پوری بات مکمل خاموشی سے سنوں گا۔‘‘ اس کا شرارتی لہجہ اس کا خون کھولانے لگا تو وہ وہاں سے کھڑی ہو گئی۔ پیچھے سے اس کی آواز

آئی۔

’’دیکھو ابھی میں نے تمہیں اتنا مزے دار ڈنر کروایا ہے۔ یوں جل کلس کر کھایا پیا ضائع نہ کرو۔ ورنہ تمہارے گھر والے مجھے الزام دیں گے کہ کیسا بداخلاق میزبان تھا ہماری بیٹی کو ڈھنگ سے کھلایا پلایا بھی نہیں۔ بے چاروں کو یہ نہیں پتا ہو گا کہ اس میں میزبان بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ خاتون ہی چڑچڑے پن کی پرانی مریضہ ہیں۔‘‘ وہ بنا کوئی جواب دیے اندر خیمے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اندر آ گیا۔ آنکہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔

’’اٹھو یہاں سے۔‘‘ اسے اٹھنے کے لیے کہا گیا تو وہ خاموشی سے بیڈ پر سے اٹھ گئی۔ اس کے ہٹتے ہی اس نے اپنے سنگل بیڈ کو جو بوقت ضرورت صوفے کا کام بھی دے سکتا تھا فولڈ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے پائے فولڈ کیے۔ میٹرس اسی میں جوائن تھا۔ بیڈ فولڈ ہونے کے بعد کسی چھوٹے سے سوٹ کیس جتنا ہو گیا تھا۔ وہ سامنے کھڑی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

’’میرا خیال ہے اگر تم یہاں مہمان بن کر کھڑی ہونے کے بجائے کچھ تھوڑا بہت میرا ہاتھ بٹا دو تو ہم جلدی روانہ ہو سکیں گے۔‘‘ کرسی فولڈ کرتا وہ اس سے بولا تو آنکہ ’’کچن‘‘ کی طرف آ گئی اور برتن وغیرہ سمیٹنے لگی۔ کھانے پینے کا تمام سامان اور برتن اس نے بیگ میں بھر کر بیگ بند کر دیا اور ٹیبل کے پاس آ کر اس کی کتابیں اور دوسرا سامان اٹھائی اس سے پوچھنے لگی ’’یہ چیزیں کہاں رکھوں؟‘‘

’’یہ سامنے والے بیگ میں ڈال دو۔‘‘ اس نے کام کرنے کے دوران جواب دینے کی فرصت نکالی۔ وہاں موجود سارا ہی سامان پورٹیبل تھا اس لیے ہر چیز چھوٹے چھوٹے سائز میں کنورٹ ہو گئی تھی۔ وہ چیزیں اٹھا کر جیپ میں رکھ کر آنے لگا۔ تیسرا چکر لگا کر واپس آیا تو وہ ہاتھ میں اس کی جیکٹ اور شرٹ لیے کھڑی تھی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ اسے یوں کھڑا دیکھ کر وہ بولا۔ تو اس نے جواب دینے کے بجائے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔

’’یہ رکھ لیں۔‘‘ اسے خاموش کھڑا دیکھ کر وہ بولی۔

’’تم خود ہی رکھ دو۔‘‘ اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو وہ کچھ جھجکتی اس کے بیگ میں دونوں چیزیں رکھنے لگی۔

تمام چیزیں رکھ دی گئی تھیں۔ وہ اب آخر میں خیمہ اکھاڑ رہا تھا۔ آنکہ باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے موجود اس گھنے اور اونچے درخت کو دیکھ کر وہ اس کی طرف آ گئی۔ وہ خیمہ اکھاڑ کر جیپ میں رکھ چکا تو اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ سامنے درخت کے پاس کھڑی پتا نہیں کیا کر رہی تھی۔ ہارون اس کے پاس چلا آیا وہ اس کی آمد سے بے خبر درخت پر اپنا نام کھود رہی تھی۔

’’تمہارا کیا دوبارہ بھی کبھی یہاں آنے کا ارادہ ہے۔‘‘ وہ اس کی پشت پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

’’پتا نہیں۔ لیکن میرا دل چاہ رہا ہے کہ بہت سالوں بعد جب کوئی یہاں سے گزرے تو اس درخت پر میرا نام دیکھ کر ایک لمحے کو میرے بارے میں سوچے ضرور۔‘‘ وہ ’’A‘‘ کو گہرا کرتے ہوئے بولی۔

’’بڑے رومینٹک خیالات ہیں۔ میں نے تو آج تک کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ ورنہ اب تک

انڈیا، برازیل آسٹریلیا افریقہ اور پتا نہیں کہاں کہاں کے جنگلات میں مختلف درختوں پر میرا نام لکھا ہوتا۔ ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے لاؤ میں بھی اپنا نام لکھوں۔'' پھر اس کے نام کے نیچے ہی اس نے خوب بڑا بلاک لیٹرز میں اپنا نام لکھا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو ہاتھ جھاڑتا اس سے بولا۔

''چلیں اب؟''

''ہاں چلیں۔'' وہ جواب دیتی آگے بڑھ گئی۔ جیپ کے پاس پہنچی تو پچھلی سیٹ پر اس موٹے تازے صحت مند شیر کو پڑا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

''پھر چیخیں تم۔ میں نے منع کیا تھا نا۔'' وہ اس پر ناراض ہونے لگا۔

''یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ میں اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔'' وہ جیپ سے دو چار قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں جاؤ گی تو مت جاؤ۔ رہو یہیں۔ میں تو جا رہا ہوں۔'' وہ اپنے روایتی روڈ لہجے میں بولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر جیپ اسٹارٹ کرنے لگا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وہ بھی اس منحوس کی خاطر۔'' وہ وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔ نظریں بدستور اسی منحوس پر تھیں جو اپنے لحیم شحیم وجود سمیت پچھلی طرف پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا اسے بمشکل جیپ میں گھسایا گیا ہے کیونکہ اس کا آدھا دھڑ سیٹ پر آدھا سیٹ سے نیچے پڑا ہوا تھا۔

''تمہیں آنا ہے تو آؤ ورنہ میں جا رہا ہوں۔'' وہ سے وارننگ دینے لگا تو آئلہ نے بڑی دقتوں سے قدم جیپ کی طرف بڑھائے اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ایک نظر دوبارہ اس پر ڈالی اور ہارون کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ مر گیا ہے نا؟ آپ نے ٹھیک طرح چیک کر لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ مکاری کر رہا ہو۔'' جیپ کا دروازہ پکڑے وہ باقاعدہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ جیسے زچ سا ہو گیا۔ اپنے غصے کو دباتے وہ بڑی مشکلوں سے نرم آواز میں بولا۔

''آئلہ کیوں ٹائم ضائع کر رہی ہو۔ جلدی بیٹھو۔'' کوئی جائے فرار نظر نہیں آ رہی تھی پتا تھا وہ اپنے ''چہیتے'' کو کبھی اپنے سے جدا نہ کرے گا اس لیے خود کو گھسیٹتی جیپ میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھنے پر اس نے باآواز بلند خدا کا شکر ادا کیا۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' وہ اس کی بات سے بے نیاز ترچھی نگاہوں سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے دیکھنا بھی نہیں چاہ رہی اور دیکھ بھی رہی ہے۔ وہ اس کے اتنے زیادہ خوف زدہ ہونے پر بڑی قابل رحم نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''اب کیا میں حلف اٹھا کر کہوں کہ یہ مر چکا ہے۔ کیوں مرحوم کی روح کو گھور گھور کر تکلیف پہنچا رہی ہو۔'' وہ اس کی مسلسل ترچھی نگاہوں سے تنگ آ کر بولا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑے ناراض انداز میں بولی۔

''آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔ اسے میرے اوپر ترجیح دے کر آپ نے میری انسلٹ کی ہے۔''

''یہ بات اگر آپ نے اس بے چارے معصوم جانور کے بجائے کسی خاتون کی شان میں کہی ہوتی

آپ سے معذرت کر لیتا اور شاید آپ کی بات کو انجوائے بھی کرتا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بول رہا ئلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ پھر اس پر سے نظریں ہٹا کر ڑین پر مرکوز کرتا ہوا بولا۔

''مجھے اپنی منزل پر پہنچنے کی بڑی جلدی ہے۔ ویسے کچھ طریقے میں نے اس پر اپلائی کیے ہیں کہ لاش جلدی سڑے نہیں مگر پھر بھی مجھے جلد سے جلد اپنے دوستوں کو جوائن کرنا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟'' اس کی بات کے جواب میں وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولی۔

''ویسے تو مجھے نیروبی جانا ہے۔ مگر آپ کو جہاں سہولت ہو وہاں مجھے چھوڑ دیں۔'' وہ اس کے برتتے پر ہنس پڑا اور بولا۔

''اچھا تو آپ نیروبی میں رہتی ہیں۔'' وہ اس کی ہنسی پر کچھ حیران ہوئی اور بولی۔

''آپ کا سینس آف ہیومر بڑا عجیب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید لیلیٰ میری جگہ ہوتی تو ی کمپنی کو خوب انجوائے کرتی۔ وہ تو اگر یہاں آ جاتی تو سب گھر والوں کو بھول بھال آپ کے ساتھ ملنے نکل کھڑی ہوتی۔ ایسی ہی ہے وہ نڈر اور ایڈونچرز کی شائق۔'' لیلیٰ کے ذکر کے ساتھ ہی اسے ان ی فکر ستانے لگی۔

''یا اللہ وہ لوگ خیریت سے ہوں۔'' وہ بغور اس کے اداس اور فکر مند چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ے پل پل بدلتے موڈز کے تمام اسرار و رموز اس پر اچھی طرح واضح تھے اس لیے اس کا موڈ بدلنے طر بولا۔

''اتنی اچھی اور خوبیوں کی مالک لڑکی سے آپ کا کیا تعلق ہے۔ آپ کی دوستیں تو آپ کی طرح ف اور بزدل ہونی چاہئیں۔'' اپنے بارے میں اس کی کمنٹس کا برا منائے بغیر وہ اسے لیلیٰ کے میں بتانے لگی۔

''وہ ابھی اگر یہاں ہوتی تو اس شیر کے اوپر پاؤں رکھ کر سب سے پہلے تو اپنی ایک تصویر کھنچواتی ھ پھیر کر اس کا تفصیلی جائزہ لیتی۔ وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ بڑے بلند ارادے ہیں اس کے۔ ڑ وہ خلاباز بننا چاہتی تھی مگر چچی جان تھوڑی کنزرویٹو خیالات کی مالک ہیں، اس لیے اس کا یہ شوق ہو سکا۔'' وہ اپنی کامیاب کوشش پر مسکراتا ہوا بولا۔

''کہاں پائی جاتی ہیں یہ لیلیٰ۔ اصولاً تو اسے کسی جنگل میں ہی پایا جانا چاہیے۔ ویسے اس لیلیٰ کو اب پنا قیس مل چکا ہے یا نہیں۔ مجھے تو صرف سن کر ہی ان خاتون سے ملنے کا شدید شوق پیدا ہو گیا '' وہ برجستہ بول پڑی۔

''منہ دھو رکھیے اس کا نکاح ہو چکا ہے۔'' اس کے جواب پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور لہجے میں تھوڑا س شامل کرتا ہوا بولا۔

''افسوس میں لیٹ ہو گیا۔'' کچھ دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ باتوں میں لگ کر اس کا ے پیچھے پڑے شیر سے ہٹ چکا تھا وہ اس کی طرف ایک سرسری سی نظر ڈال کر بولا۔

''نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔'' اپنے لیے اس کے لہجے میں موجود خلوص پر اس کا دل خوش ہو گیا۔

''نہیں ابھی تو نیند نہیں آ رہی۔'' اس کی بات کا جواب دے کر وہ ایک آدھ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد

اس سے مخاطب ہوئی۔

''آپ کے گھر والے آپ کو اتنے خطرناک کاموں میں گھسنے کی اجازت کیسے دے دیتے ہیں۔ ایسا خوفناک شکار جس میں جان جانے کے اتنے زیادہ چانسز ہوں۔ وہ آپ کو روکتے نہیں۔ میرے تو بھیا نے جس دن آرمی جوائن کی تھی امی نے رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا جیسے ابھی جنگ چھڑنے والی ہے۔'' اس کی بات کے جواب میں وہ بڑے طنزیہ انداز میں بولا۔

''میرے پیچھے کوئی رونے والا نہیں ہے۔ اس لیے میں بڑے اطمینان کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہوں۔'' وہ اس کے لہجے کی تلخی پر متعجب ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''شاید میں نے کوئی غلط بات کر دی ہے۔ جس سے یہ ہرٹ ہوا ہے۔'' وہ قیاس آرائیاں کرتی چپ بیٹھی رہی۔

وہ بڑی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کی ذمہ داری سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا۔ اس کی طرف سے لاتعلق وہ راستے پر نظریں جمائے جیپ میں دوڑا رہا تھا۔ آملہ چاروں طرف پھیلے اس سناٹے اور وحشت بھرے ماحول سے نظریں چرائے اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ''کتنی ویرانی اور وحشت ہے اس جگہ پر۔ اگر یہ ساتھ نہ ہوتا تو میں تو کب کی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔'' وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی وقت گزارنے لگی۔

اسی وقت جیپ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رک گئی اس کا سر سامنے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اسے دروازہ کھول کر باہر اترتے دیکھ کر وہ اس سے پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا۔''

''شاید جیپ میں کچھ پرابلم ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ مکمل جواب دے جائے میں ذرا اتر کر چیک کر لوں۔'' وہ شاید جیپ کے مزاج دکھانے پر کچھ بےزار سا ہو گیا تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ پکڑے وہ انجن پر جھکا فالٹ تلاش کر رہا تھا۔ آملہ اس کی مدد کے خیال سے باہر نکل آئی اور بغیر کچھ کہے ٹارچ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ کیا کر رہا تھا کس چیز کو چیک کر رہا تھا اس کے بارے میں نہ وہ جانتی تھی نہ جاننے کا کوئی شوق تھا۔ اس کی دلچسپی تو بس اس بات میں تھی کہ کسی بھی طرح جیپ جلد از جلد ٹھیک ہو جائے اور وہ اس اجاڑ ویران جگہ سے رخصت ہوں۔ اپنے خیالات اس سے شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی ورنہ اسے بتاتی کہ اتنے اجڑے بیابانوں میں بدروحیں بسیرا کیے رکھتی ہیں اور آپ لاکھ بہادر ہوں مگر ایک بدروح کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ اپنے خیالات سے خائف ہوتی وہ اس کے کچھ اور قریب ہو گئی تو وہ چڑ کر بولا۔

''کہاں گھس رہی ہو۔ دور ہٹ کر کھڑی ہو۔'' اس کے ناراض لہجے سے ڈر کر وہ فوراً دور ہٹ گئی۔

دس پندرہ منٹ انجن کے ساتھ مغز ماری کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''فالٹ میں نے ٹھیک کر دیا ہے۔ اب کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بس اب صرف تھوڑا سا پانی چاہیے۔ چلتے وقت مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ چیک کر لوں۔ ویسے فکر کی کوئی بات نہیں ہے یہاں سامنے ہی ایک چشمہ ہے۔ میں وہاں سے پانی لے کر آتا ہوں تم جیپ میں بیٹھو۔'' وہ ہاتھ میں کین پکڑ کر جانے لگا تو وہ فوراً بولی۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ یہاں اکیلے مجھے ڈر لگے گا۔'' وہ اس کی بات پر جھلا گیا۔

''بےوقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں کہیں دور نہیں جا رہا ہوں۔ یہاں بالکل قریب ہی۔''

''نہیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔'' ضدی لہجے میں بولتی وہ اسے اس وقت زہر دکھائی دے رہی تھی۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ یہاں کا راستہ اتنا پرخطر اور ناہموار ہے۔ گر گرا جاؤ گی۔ اندھیرا ابھی اتنا ہے میں پانی لاؤں گا یا تمہیں سنبھالوں گا۔ اب کوئی آرگومنٹ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے منع کر دیا تو مطلب منع کر دیا سمجھیں۔ جیپ میں بیٹھو۔'' اس کے اتنے غصے اور ناراضگی بھرے انداز پر وہ سہم کر جیپ میں بیٹھ گئی تو وہ اس کے پاس آیا اور بولا۔

''دروازہ لاک کر کے اور شیشے چڑھا کر بیٹھو۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم نے باہر نہیں اترنا، کسی بھی صورت میں انڈر اسٹینڈ۔ آرام سے بیٹھو خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ سامنے جو ڈھلوانی راستہ نظر آ رہا ہے بس وہیں ذرا سا نیچے اتر کر چشمہ ہے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔'' وہ اسے ڈرا دھمکا کر اور تسلی دے کر آگے بڑھ گیا، تیز قدموں سے جیسے جلد سے جلد واپس آنا چاہتا ہو۔ آملہ نے ایک نظر پیچھے پڑے اس درندے پر ڈالی تو ایسا لگا وہ اپنی لال لال آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا ہے اور ابھی اچانک اس پر جھپٹ پڑے گا۔ اس کی طرف سے ذہن ہٹانا چاہا تو ایسا لگا جیسے ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بھوت آ کر بیٹھ گیا ہے اور اب اپنے پنجے اس کی طرف بڑھا رہا ہے۔ وہ بےاختیار اس کی ہدایات نظرانداز کرتی جیپ سے اتر گئی۔

''چاہے کچھ ہو جائے میں یہاں اکیلے نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ خود سے کہتی اسی طرف بڑھ گئی جس طرف اسے جاتا دیکھا تھا۔ دو چار قدم چل کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے ساتھ چلنے سے کیوں منع کر رہا تھا۔ اونچا نیچا خاصا پرخطر راستہ تھا۔ مزید یہ کہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ صرف چاند کی قدرتی روشنی ہی تھوڑی بہت رہنمائی کر رہی تھی۔ دو تین دفعہ وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔ خود کو کسی چوٹ لگنے سے بچانے کے لیے وہ وہیں اس چٹان نما پتھریلی زمین پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے لوگ چل رہے ہوں۔ اس نے خوفزدہ ہو کر مڑ کر دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ وہ چار لمبے چوڑے حبشی نما انسان تھے شاید کوئی افریقی تھے۔ ان کے لمبے مضبوط جسم اور ظاہری حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی شکاری ہیں۔ اس کی طرف لمحہ بہ لمحہ بڑھتے۔ وہ فوراً اس جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لال ٹین تھی۔ چاروں کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ ابھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک قدم بھی نہ بڑھا پائی تھی کہ ان میں سے ایک برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا جبکہ باقی پیچھے ہی کھڑے اس کی بےبسی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ ایسی کوئی بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ نہ ایک قدم آگے بڑھا سکتی ہے نہ چیخ کر اسے آواز دے سکتی ہے۔ وہ اس کے قریب آ کر پتا نہیں کس زبان میں اس سے کچھ بولا اور اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ اس کے شانوں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے اور اسے اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے ہوس اور بربریت کے شعلے سے لپک رہے تھے۔ اس نے پوری طاقت صرف کر کے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا مگر اس کی آہنی گرفت کے آگے اس کی کوشش کوئی معنی نہ رکھتی تھی پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آئی تھی وہ بےاختیار بلند آواز میں چیخی تھی۔

"ہارون، ہارون بچاؤ۔" دور دور تک اس کی چیخ گونجی تھی۔ ساتھ ساتھ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جو پانی بھر کر واپس آنے کے لیے مڑ رہا تھا۔ اس کی چیخ پر بری طرح بوکھلا گیا۔ پانی کا کین ہاتھ سے چھوڑ کر وہ بھاگتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ جاتے وقت جو راستہ اس نے پانچ منٹ میں طے کیا تھا اس وقت چند سیکنڈوں میں عبور کر کے وہ اوپر آیا تو یہاں کا منظر دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ تیز قدموں سے وہ اس طرف بڑھا تو اس حبشی نے آملہ کو چھوڑ دیا یوں جیسے تم سے ابھی بات کریں گے پہلے اس سے نبٹ لیں۔ اس کے ایک دم چھوڑ دینے سے وہ زمین پر گر پڑی تھی۔ مگر اس وقت افتاد ایسی پڑی تھی کہ اپنی چوٹ ووٹ کی طرف دھیان دیے بغیر وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ سامنے ہی وہ کھڑا نظر آیا تو وہ بھاگ کر اس کے پاس آ گئی اور اس کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چاروں اپنے لمبے مضبوط ڈیل ڈول کے ساتھ کھڑے جیسے اس کا مذاق اڑا رہے تھے کہ آؤ اگر ہمت ہے تو ہم سے مقابلہ کرو۔ اپنی قمیص مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی آملہ کو اس نے جھٹکے سے دور ہٹایا۔ اپنے اتنے بے دردی سے جھٹکے جانے پر اس کے سوئے ہوئے حواس جیسے جاگ اٹھے۔ اسے ایسا لگا ابھی وہ اسے ان لوگوں کے حوالے کر کے ہاتھ جھاڑتا یہاں سے چلا جائے گا۔ اسے آخر ضرورت کیا پڑی ہے اس کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی۔ ان کا آپس میں نہ کوئی خونی رشتہ ہے نہ جذباتی۔ ایک ایسی لڑکی جسے اس نے ترس کھا کر اپنے پاس پناہ دے دی تھی اس قابل تو نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی خاطر جان پر کھیل جائے۔ ہاں یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں ہے کہ ہیرو ہیروئن کو بچانے کی خاطر دس بیس غنڈوں کو جہنم واصل کر دے۔ وہ ان میں سے کسی کی بھی طرف نظر ڈالے بغیر اندھا دھند بھاگنے لگی۔

"اتنی بے وقعت نہیں ہوں کہ مالِ غنیمت کی طرح مجھے تقسیم کیا جائے۔" وہ اپنی تمام تر طاقت بروئے کار لا کر بھاگ رہی تھی۔ اس کے کان اس وقت کوئی آواز نہیں سن رہے تھے۔ اسے نہیں پتا تھا وہ لوگ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں یا نہیں اسے خود کو بچانا تھا ہر قیمت پر دو تین مرتبہ ٹھوکر کھا کر گری مگر اس نے پروا نہ کی، بھاگتے بھاگتے وہ پتا نہیں کتنی دور آ گئی تھی۔ اونچا نیچا پتھریلا راستہ اسے جگہ جگہ سے زخمی کر گیا تھا۔ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ سانس پھول گیا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ اب وہ مزید ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ بمشکل خود کو سنبھالتی وہ ایک اونچے سے ٹیلے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی اور بڑی شدتوں کے ساتھ اپنے رب کو پکارنے لگی۔

"یا اللہ عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے بچا لے ان درندوں سے۔ میرے گناہ معاف فرما دے۔" وہ سانس تک روک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سی انسانی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ دو چار فائر بھی ہوئے۔ سناٹے کو چیرتی تمام آوازیں وہ بخوبی سن رہی تھی۔

"کیا وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا۔ کیا وہ میری عزت و آبرو بچانے کے لیے رک گیا ہے۔" اس نے ایک لمحہ کو سوچا۔ مگر پھر مایوسی میں گھر گئی۔ اس بات کا فیصلہ کیسے ہو کہ کون فاتح رہا اور کون مفتوح اگر وہ رک بھی گیا ہے مگر ان سے ہار گیا تو کیا ہوگا۔ پھر کچھ چیخوں کی آواز آئی اور اس کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا یہاں اس ویرانے میں اس کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ کتنی عجیب بات تھی وہ کچھ دیر پہلے اس جگہ کی ویرانی سے ڈر رہی تھی اور اب یہ ویرانی اور سناٹا اسے بالکل بھی نہیں ڈرا رہے تھے۔ اس نے اپنے پاس قدموں کی آہٹ سنی تو پتا چلا کہ ابھی امتحان ختم نہیں ہوا۔

"نہیں میں اس کھائی میں کود کر اپنی جان دے دوں گی۔ مگر یہ رسوائی ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔" وہ ایک فیصلہ کر کے کھڑی ہو گئی اور آنے والے کی طرف دیکھے بغیر بھاگ کر آگے بڑھنا چاہا تو ہارون نے اس کا بازو دبوچ کر اسے روک لیا اور اگلے ہی لمحے بغیر اسے سنبھلنے کا موقع دیے ایک بھرپور اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"جب میں نے منع کیا تھا تو تم گاڑی سے اتریں کیوں؟ بولو جواب دو۔" وہ جیسے بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا تھا۔ اپنی سرخ شعلے برساتی نگاہوں سے اسے گھورتا وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"تمہاری سمجھ میں کسی کی بات نہیں آتی۔ صرف تمہاری وجہ سے رات کا سفر کرنے سے اس لیے ڈر رہا تھا کہ تم ایک بے حس لڑکی ہو جسے نہ اپنی جان کی کوئی پروا ہے نہ دوسرے کی۔" وہ بری طرح اس پر چیخ رہا تھا۔ اسے اتنے شدید غصے میں اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اتنی دیر کی اعصاب شکن صورت حال اسے بالکل نڈھال کر چکی تھی۔ وہ اس پر چیختا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی اور اس کے بازو پر سر ٹکاتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے نہ اسے تسلی دی نہ برا بھلا کہا نہ رونے سے منع کیا اور نہ اپنے بازو پر رکھا اس کا سر ہٹایا وہ بس خاموش کھڑا تھا۔ وہ پتا نہیں کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ رونے کی شدت میں کمی آئی اور صرف اس کی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں وہ تب بھی خاموش کھڑا رہا۔ اسے شاید خود ہی اپنی اس بے اختیاری کیفیت کا احساس ہوا تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ ایک نظر اس پر اور ایک اپنی بھیگی آستین پر ڈالتا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں سے واپس اسی راستے کی طرف جانے لگا۔ وہ اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔ اس کے وجود کا سارا بوجھ جیسے اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ صرف گھسٹ رہی تھی۔ پتھر میں اڑا دوپٹہ اس نے جھک کر اٹھایا اور بڑی ملامت کرتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو پکڑایا۔ وہ اس کی نظروں سے کٹ کر رہ گئی۔ سر جھکا کر دوپٹہ اس کے ہاتھ سے لیا اور اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔

کچھ اور آگے بڑھے تو سامنے وہ چاروں زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ تین شاید بے ہوش تھے اور ایک ہوش و حواس میں پڑا چیخ چلا کر اس سے مدد کی درخواست کر رہا تھا۔ ان چاروں پر ایک نظر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا جیپ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکا دیا اور خود واپس اس طرف چلا گیا۔ وہ سر جھکا کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

پتا نہیں یونہی بیٹھے کتنی دیر گزر گئی تھی جب جیپ اسٹارٹ ہونے پر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے جیپ چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگنے لگتا جیسے ابھی جیپ کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اچانک اس کی نظر ہارون کی خون میں بھیگی آستین پر پڑی تو وہ کچھ جھجک کر اس سے بولی۔

"آپ کا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ اس پر بینڈج کر لیں۔" اس نے شاید اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی اس لیے اسی رفتار سے جیپ دوڑاتا رہا چند سیکنڈ اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کے ہاتھ سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔ جیپ روک کر اس کی مرہم پٹی کر لیں۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹکتا ہوا پھنکارا۔

"تم اگر مجھ سے بات نہ کرو تو تمہارا بہت احسان ہوگا۔" وہ اس ردعمل پر چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ مگر

نظریں بدستور اس کے خون میں لت پت ہاتھ پر تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں اس کے پیروں کے پاس پڑے اس بیگ میں دیگر سامان کے ساتھ ہی ایک فرسٹ ایڈ باکس بھی رکھا ہے۔ وہ تیزی سے جھکی اور بیگ کھول کر اس میں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لیا۔ وہ اس کی اس تمام کارروائی سے لاتعلق ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ باکس سے کاٹن نکال کر اس نے ہارون کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے جیپ روک کر اس سے بولا۔

''اگر اب تم نے مجھ سے بات کی یا میرے قریب آئیں تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' وہ غرا رہا تھا۔ جواب میں وہ رو پڑی اور بولی۔

''میرے ہاتھ سے نہیں تو خود ہی بینڈیج کر لیں۔ اتنا سارا خون بہہ گیا ہے۔'' اس کی گود میں دھرے فرسٹ ایڈ باکس کو اس نے بڑے غصے سے اٹھایا اور اپنے ہاتھ کی ڈریسنگ کرنے لگا۔ وہ آنسو برساتی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بازو پر پٹی باندھ کر اس نے جیپ دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔ بلا کا اسٹیمنا تھا اس میں، اپنے زخمی ہاتھ پر پٹی باندھے وہ بغیر کسی تکلیف کا اظہار کیے جیپ معمول کے مطابق چلا رہا تھا۔ آئلہ نے دو چار بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ شاید اس وقت اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی طرف نظریں جما کر بیٹھ گئی۔

کافی دیر بعد اس نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا تو عجیب سا ملال اور تاسف اسے اپنی لپیٹ میں لے گیا۔ وہ سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ بائیں گال پر ابھی تک اس کی انگلیوں کے نشان موجود تھے۔ ہاتھوں اور چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں جن سے اب خون رسنا بند ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو صاف کر دے اور کوئی ایسی بات کرے کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑے اپنے مخصوص سادہ انداز میں۔ دل کی اس خواہش کو رد کرتا وہ اس سے نظریں چرا کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔ اپنے آس پاس کچھ گاڑیوں کا شور اور دوسری آوازیں سنائی دیں تو اس نے سر اٹھا کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ جنگلوں سے نکل کر شہری حدود میں پہنچ گئے تھے۔ آئلہ نے ایک طویل پرسکون سانس لی اور اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

پتا نہیں کیا وقت ہو رہا تھا شاید ابھی رات ہی تھی کہ وہ پورا شہر سویا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ مگر ان ویرانوں کے مقابلے میں یہ اکا دکا گاڑیاں اور ان کا معمولی سا شور بھی اسے بہت بارونق محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں پہنچی ہے۔ جیپ ایک ہوٹل کے سامنے روک کر وہ اس سے کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا وہ بیٹھی اس سمت دیکھتی رہی جہاں وہ گیا تھا۔ وہ ایک بڑا اور شاندار سا ہوٹل تھا۔ خوب جگمگ کرتا روشنیوں میں نہایا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آتا دکھائی دیا تو اکیلا نہیں تھا۔ وہ دونوں بڑے پرجوش انداز میں آپس میں کچھ باتیں کرتے اس طرف آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ چلتا وہ شخص چہرے پر خوشی اور ایکسائٹمنٹ کے تاثرات لیے اس سے آگے بڑھ گیا۔ جیسے اسے کوئی چیز دیکھنے کی بہت جلدی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھاتا جیپ کی طرف آیا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ چہرے پر حیرانی اور بے یقینی کے تاثرات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ اس کے پیچھے چلتا وہ بھی جیپ کے پاس آ گیا اور اس کا متعجب انداز بھانپ کر بولا۔

''یہ آئلہ ہیں۔'' ہاں وہ اتنی ہی مشہور و معروف شخصیت تھی۔ اس کے تعارف میں اتنا کہہ دینا کافی

آگے صفحہ "217" پر

یا۔

''اچھی بات ہے۔ لڑکیوں کو بھی اس طرف آنا چاہیے۔ جب لڑکیاں دنیا کے ہر پروفیشن میں چلی ہیں تو شکار میں کیا مضائقہ ہے۔ لڑکیوں کو بہادر ہونا چاہیے۔'' وہ اسے تردید کرنے کا موقع دیے بغیر لے چلا گیا۔ پھر اپنے دوستوں کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

''تم لوگوں کو وہ انڈیا والا قصہ یاد ہے۔'' وہ شاید کسی پرانی بات کا حوالہ دے رہا تھا جواب میں وہ ،ہی کچھ یاد کر کے ہنس پڑے۔ وہ اپنے آپ کو ان دوستوں کی محفل میں کچھ مس فٹ سا محسوس کرنے ۔عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''آئلہ شاید بور ہو رہی ہیں۔'' ہارون نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر مائیکل کے ساتھ اپنی بات ی رکھی جو موجودہ شاندار کارنامے سے متعلق تھی۔ وہ اس کی بات پر مسکرا کر بولی۔

''نہیں میں بور نہیں ہو رہی۔''

''چلیں اگر آپ بور نہیں ہو رہیں تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ویسے آپ کی دلچسپی کی خاطر میں پ کو وہ قصہ سنا سکتا ہوں جس کا ابھی مائیکل ذکر کر رہا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ دو سال پہلے ہم لوگ شکار کے انڈیا گئے تھے۔ شکار سے واپسی پر ہمیں تین امریکی لڑکیاں ملیں جو شاید وہاں تفریح کی غرض سے آئی ں اور کسی وجہ سے راستہ بھٹک کر وہاں پہنچ گئی تھیں۔ تینوں کی تینوں ایک نمبر کی ڈرپوک۔ ہم نے انہیں ، دے دی۔ وہاں خوب ہی تماشے ہوئے تھے۔ یہ ہارون صاحب تو ان بے چاریوں کے جانی دشمن گئے تھے۔ ہم لوگوں سے الگ ناراض کہ انہیں لفٹ دینے کی ضرورت کیا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک زیادہ ہی بزدل تھی۔ اسی کے ساتھ سب سے زیادہ حادثات بھی ہوتے تھے۔ ایک دفعہ تو اس کے ں پر بچھو چڑھ گیا اور بجائے اس کی مدد کرنے کے یہ آرام سے دور بیٹھا تماشا دیکھتا رہا وہ تو میں وہاں گیا۔ اصل میں اسے ڈرپوک اور بزدل لڑکیاں بڑی بری لگتی ہیں۔ دوسری دفعہ بے چاری کی شامت اس نے غلطی سے اس کے کیمرہ کو ہاتھ لگا لیا تو یہ اس پر چڑھ دوڑا مجھ سے پوچھے بغیر میری چیزوں کو لگایا کیسے۔'' اس کے برابر بیٹھے بندے نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ عبداللہ بڑے مزے سے تمام قصہ سنا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سنانے کے ساتھ ساتھ وہ تمام باتیں یاد کر کے خود بھی انجوائے رہا ہے۔ پیٹر بھی مسکرا رہا تھا۔ وہ ابھی شاید کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ ہارون نے مائیکل سے توجہ ہٹا کر سے اردو میں کہا۔

''تمہیں چلنا نہیں ہے کیا۔ جلدی ناشتا ختم کرو۔'' اور اس کے بلاوجہ ناراض ہونے پر حیران رہ گئی ناشتا تو وہ کب کا کر چکی تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے اردو میں بولنے پر وہ تینوں احتجاجاً چیخ ے تھے۔

''یہ فاؤل ہے۔ ہمیں بتاؤ ابھی تم نے کیا کہا ہے۔'' وہ جواب میں بے نیازی سے کندھے اچکا کر ا۔

''تم لوگوں کے مطلب کی بات نہیں تھی۔''

''دیکھا اس غدار کو۔'' عبداللہ نے دانت پیسے۔

''اپنا ہم وطن ملا تو کیسے ہم لوگوں سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔'' پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آئلہ آپ بتائیں ابھی اس نے کیا کہا تھا۔ مجھے شک ہے اس نے ہماری کوئی برائی ہی کی ہوگی۔'' اسے خوامخواہ گھسیٹا گیا تو وہ کچھ پریشان سی ہوگئی اور بولی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔'' اس نے جھگڑا ختم کروانے کی کوشش کی۔ پھر وہ چاروں آپس میں آئندہ کا پروگرام طے کرنے لگے وہ خاموش بیٹھی دیواروں کو تکتی رہی۔ ان لوگوں کے مذاکرات ختم ہوئے اور وہ چاروں کھڑے ہوئے تو آئلہ بھی کھڑی ہوگئی۔ ان لوگوں سے قصداً تھوڑا پیچھے چلتے ہوئے وہ ان لوگوں کی باتیں سنتی خاموشی سے چل پڑی تھی۔ جب اس نے پیٹر کی آواز سنی۔ وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''میں آپ سے کچھ ہوں اگر آپ میری بے تکلفی کا برا نہ منائیں تو۔'' وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا جس کے لیے اجازت طلب کر رہا تھا۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''جی کہیے۔''

''آپ کو شاید خود بھی نہیں معلوم کہ آپ بغیر کسی ہتھیار کے بہت بڑی اور مشکل جنگ جیت چکی ہیں۔'' وہ ان نہ سمجھ میں آنے والے فقروں پر رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ بھی رک گیا اور بولا۔

''یہ جو میرا دوست ہے ناں اسے فتح کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے لوگ اس محاذ پر شکست کھا چکے ہیں۔'' اس کی بات پر وہ کچھ پزل سی ہوگئی اور خوامخواہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ وہ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا۔

''میں یہ بات آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہے وہ یہ بات آپ سے کبھی نہیں کہے گا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت گہرا اور مشکل پسند ہے۔ اسے سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ تو شاید کبھی میرے سامنے بھی نہیں کھلے گا۔ حالانکہ اسے پتا ہے کہ میں سب جان چکا ہوں مگر منہ سے قبولے گا نہیں۔''

اس سے سر اٹھا کر پیٹر کی طرف دیکھا بھی نہیں جا سکا بمشکل جھکے سر سے بولی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتا بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''آپ ایک بہت اچھی لڑکی ہیں اور اگر آپ اسے میری جانب داری نہ سمجھیں تو میں کہوں گا کہ میرے دوست کی پسند بری ہو ہی نہیں سکتی۔ جو لڑکی بڑی خاموشی سے اس کا خیال رکھتی ہو اس سے پوچھے بغیر اسے بغیر چینی کی چائے پیش کرتی ہو وہ یقیناً بہت اچھی ہوگی۔'' اس کا شرم سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

''میرا دوست بہت اچھا ہے بہت محبت کرنے والا۔ جو ایک دفعہ اسے سمجھ لے اسی کا ہو جاتا ہے اچھی لڑکی اس بات کو انا کا مسئلہ بنا کر اپنے اور اس کے لیے پریشانیاں مت کھڑی کرنا کہ وہ اظہار کرے۔ ابھی وہ تمہیں چھوڑنے جائے گا تو صرف میری خاطر ہی تم پہل کر دینا پلیز۔'' وہ اس کی تمام باتوں کی تردید کر دینا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بالکل غلط سمجھ رہا ہے۔ وہ اس کے تاثرات کو سمجھ کر بولا۔

میں صرف اس کا ہی نہیں تمہارا بھی دوست ہوں لہٰذا مجھ سے جھوٹ مت بولو۔''

وہ لوگ جو مرکزی دروازے تک پہنچ چکے تھے ان دونوں کو سست قدموں سے آتا دیکھ کر وہیں رک ... قریب پہنچے تو مائیکل بولا۔

''کیا ہوا کہاں رہ گئے تھے۔'' جواب میں پیٹر مسکرایا اور بولا۔

''میں آئلہ کو یہاں کا تاریخی پس منظر بتا رہا تھا۔''

''لو یہ بھی کوئی موقع ہے تاریخ کھنگالنے کا۔'' عبداللہ چڑ کر بولا۔ پھر ہارون سے مخاطب ہوا جو ... خاموشی سے ایک نظر پیٹر پر اور ایک آئلہ پر ڈال کر اب بڑی لاپروائی سے کھڑا تھا۔

''ہارون جلدی واپس آنا۔ میں اس سڑے ہوئے ہوٹل میں پڑے پڑے بری طرح بور ہو گیا ...۔'' وہ اس کی بات پر سر ہلاتا جیپ میں سوار ہوا تو آئلہ نے بھی ان لوگوں سے الوداعی کلمات کہے اور ... میں بیٹھ گئی۔ پیٹر کی طرف دیکھنے سے اس نے گریز کیا تھا۔ وہ لوگ ہاتھ ہلا کر گرم جوشی اسے اسے ...داع کہہ رہے تھے۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی تو اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا وہ لوگ ابھی بھی وہیں کھڑے ...

وہ اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھا اور وہ کھڑکی سے شہر کی رونق اور چہل پہل دیکھ ... تھی۔ یونہی ڈرائیو کرتے کتنا ہی وقت گزر گیا مگر دونوں میں کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ وہ اپنی منزل کے ...یب پہنچ گئی تھی۔

''ایڈریس بتاؤ۔'' بڑی دیر بعد خاموشی کا پردہ چاک کرتی اس کی آواز سنائی دی تو وہ اسے ایڈریس ...نے لگی۔ گھر پہنچنے کی خوشی میں وہ دیگر تمام باتیں بھول گئی۔ زندگی کے کتنے ہی عجیب و غریب تجربات ...ے گزر کر وہ واپس اپنے اصل کی طرف لوٹ رہی تھی۔

جیپ اس کے بتائے مطلوبہ مکان کے سامنے رکی تو وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر اتر آئی اور ... گتے ہوئے بیل پر جو ہاتھ رکھا تو ہٹانا ہی بھول گئی۔ وہ جیپ میں بیٹھا اس کا والہانہ انداز دیکھ رہا تھا۔ ...ٹ کھول کر رحمت نے اسے دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑا۔

''بیٹا آپ آ گئیں۔ شکر ہے خدایا، سب لوگ کس قدر پریشان تھے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔'' وہ ایک ...نس میں کتنی ہی باتیں کر گیا وہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جس پر کسی انتہائی شدید ...دثے کے گزر جانے کے تاثرات نظر نہ آئے تو اس کے سکون کا سانس لیا اور بولی۔

''جی میں ٹھیک ہوں۔ لیلیٰ اور دانش کیسے ہیں؟'' اس کے چہرے کے تاثرات نے حوصلہ بخشا تھا ... وہ ان دونوں کے متعلق پوچھنے لگی۔

''وہ دونوں ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ بی بی اور صاحب دونوں ہی ہاسپٹل گئے ہوئے ہیں۔ ...یسے وہ دونوں ٹھیک ہیں۔'' وہ اسے ہاسپٹل کے نام پر پریشان ہوتا دیکھ کر فوراً وضاحت کرنے لگا۔ ...ہاں سے حوصلہ افزا خبر سننے کو ملی تو اسے اچانک اس کا خیال آیا جو جیپ میں بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ...ے اپنی بدتمیزی پر سخت افسوس ہوا کیا سوچا ہوگا اس نے میرے بارے میں کتنی احسان فراموش اور ...طلب پرست لڑکی ہوں۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آئی اور بولی۔

''آپ اندر آیئے نا۔''

''تمہیں پتا تو ہے وہاں وہ لوگ بیٹھے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔'' وہ دوستانہ انداز میں

مسکرا کر بولا اور آنلہ نے اس کی مسکراہٹ کو بغور دیکھا۔ وہ کتنی دیر بعد اس سے معمول کے مطابق بات
رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر خدا حافظ۔'' وہ جیپ اسٹارٹ کرنے لگا تو وہ اسے روکنے لگی۔
''اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آپ بغیر کسی ریسٹ کے فوراً واپس جا رہے ہیں تھوڑی دیر تو اندر آجا
پلیز۔'' وہ اس کے اصرار کے جواب میں نفی میں سر ہلاتا بولا۔
''ابھی مجھے واپس جا کر بہت سے کام نبٹانے ہیں۔ تمہیں سب پتا تو ہے۔'' وہ اندر آنے پر آ
نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالتا بولا۔
''تم میری بنائی اس مہم کی ویڈیو اور اس کی تفصیلی رپورٹ نیشنل جیوگرافک پر ضرور دیکھنا اور با
دے یہ ٹائمز کے انٹرویو کی طرح کا کوئی قصہ نہیں ہے۔ میں نے بڑی ہی زبردست ویڈیو بنائی ہے
ابھی مجھے واپس جا کر اس کی رپورٹ تیار کرنا ہے۔'' ایک ناگوار خاطر بوجھ اور زبردستی گلے پڑی ذ
داری سے نجات حاصل کرنے پر وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھ
چپ کھڑی رہ گئی۔ وہ اس کی خاموشی سے لاتعلق بڑی خوشی اور طمانیت سے مسکرا کر بولا۔
''تمہارے لیے میں دعا کروں گا ایک دن تم ٹیکسٹائل کے شعبے میں اتنا اونچا مقام حاصل کر
کہ بی بی سی پر تمہاری بائیوگرافی نشر ہو سکے۔''

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اب آئندہ اس سے کبھی بھی کہیں ملنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ ا
کے مابین آخری ملاقات ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ا
اپنے آنکھوں میں کچھ چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ خود کو سنبھالتی وہ بمشکل مسکرا سکی اور بولی۔
''میں نے اتنے دن آپ کو بہت ستایا بہت پریشان کیا اور آپ نے مجھے برداشت کیا میرا ا
خیال رکھا۔'' وہ خود کو کمپوز کرتی رسمی فقرے ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔
''اگر تم فارمیلٹی نبھانے کی کوشش کر رہی ہو تو آئم سوری میں جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تو م
فرض تھا یا اٹس مائی پلیور، کیوں کہ یہ سب کچھ اتنا Pleasant بھی نہیں تھا۔'' وہ اپنے مخصوص منہ پھ
انداز میں ہنستے ہوئے بول رہا تھا۔
''اپنا خیال رکھنا اور آئندہ تفریحی دوروں پر نکلتے وقت جگہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا۔ خدا حافظ۔
اس کا جواب سنے بغیر وہ جیپ اسٹارٹ کرتا تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ وہ پیچھے کھڑی اپنے سے لمحہ
لمحہ دور ہوتی اس جیپ کو دیکھ رہی تھی۔
''تو پھر یہ طے ہے کہ یہ چہرہ اب مجھے عمر بھر کبھی نظر نہ آئے گا۔ ہر چہرے میں، میں اس چہرے کا
شبیہ ڈھونڈوں گی اور وہ چہرہ دنیا کے ہجوم میں کھو جائے گا میں اسے کبھی تلاش نہیں کر پاؤں گی۔'' وہ تھکے
تھکے قدموں سے اندر چلی آئی۔

☆☆☆

اس کا صدقہ اتارا گیا۔ شکرانے کے نوافل ادا کیے گئے اس کی زندہ سلامت بخیر و عافیت واپسی

آگے صفحہ "221" پر

تھا کہ وہ آنلہ ہے۔ مگر مقابل بھی اس کا دوست تھا چہرے پر سے حیرانی کے تاثرات ہٹاتا بغیر کوئی اور
سوال کیے یا کسی قسم کے تجسس کا اظہار کیے وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑی رواداری اور شائستگی سے مسکرایا اور
بولا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' جواب میں اسے بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔ اس کی طرف سے توجہ
ہٹائے اب وہ دونوں پچھلی نشست کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اس کے دوست کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ
بڑے بھاری قسم کے تعریفی الفاظ میں اپنے دوست کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا اس کی بہادری اور مستقل
مزاجی کو سراہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں جیپ سے کچھ دور ہٹ کر آپس میں کوئی بات کرنے لگے۔ آنلہ نے سنا
وہ کہہ رہا تھا۔

''تم اس کا انتظام کرو۔ مجھے ابھی نیروبی جانا ہے۔ آگے کا پروگرام بعد میں طے کریں گے۔'' وہ
بڑی عجلت میں نظر آ رہا تھا۔
''پاگل ہو گئے ہو۔ اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آئے ہو۔ تھوڑا سا ریسٹ کر لو۔ کم از کم کچھ کھا پی ہی لو۔
کتنے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ کتنے بجے چلے تھے وہاں سے۔'' وہ شاید اس سے بہت محبت کرتا تھا۔
بالکل ماؤں کی طرح اس کے لیے فکرمند ہو رہا تھا۔ وہ اس کی بات پر مسکرایا اور بولا۔
''کھانے پینے کا بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔ مجھے جلد از جلد نیروبی پہنچنا ہے۔ ویسے گیارہ بجے چلے
تھے ہم لوگ وہاں سے۔'' ہم لوگ کے الفاظ پر اس شخص نے بڑی بے ساختگی سے اس کی طرف دیکھا اور
دوسرا ہی اس پر سے نظریں ہٹا کر بولا۔
''بہت دیر نہیں لگ گئی تمہیں پہنچنے میں۔ کس طرف سے آئے ہو۔'' وہ بدستور اس کے لیے فکرمند
تھا۔

''بس وہ جیپ راستے میں خراب ہو گئی تھی وہاں کافی دیر لگ گئی۔'' وہ بڑے لاپروا انداز میں بولا۔
''خیر جو بھی ہو۔ ایسے تو میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ نیروبی کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ کچھ کھا پی لو
پھر چلے جانا۔'' وہ بڑی قطعیت سے بولا تو وہ بڑی بے بس نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔
''پیٹر دیر ہو جائے گی۔''
''ہو جائے میری بلا سے۔ تم اندر چلو۔'' اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ آپس میں مصروف تھے۔
اس کا وجود کہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ شاید اس کے مجبور کرنے پر زبردستی وہاں رکنے پر رضامند
ہو گیا تھا۔
''آؤ اندر چلو۔'' وہ اس کے پاس آ گیا جبکہ اس کا دوست دور کھڑا ان دونوں کی طرف بغور دیکھ رہا
تھا۔

اس کے حکم پر بغیر کوئی چوں و چرا کیے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ان دونوں کے ساتھ اس
شاندار ہوٹل کے ریسپشن کے پاس سے گزرتے اسے اپنا حلیہ بڑا آکورڈ سا لگا۔ گرد و غبار میں اٹا چہرہ،
بالوں کی بکھری الجھی لٹیں اور زخمی ہاتھ پاؤں۔ اس نے خوامخواہ بالوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں سنوارنے کی
کوشش کی۔ وہ اس سے مسلسل شکار اور جنگل کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سے اس کارنامے کی
تفصیل سن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے برابر چلتے شخص کے جوتوں پر نظریں جمائی ہوئی تھی۔ جو بظاہر اس

وقت اس سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ اس کی رفتار سست پڑی تو وہ بھی آہستہ قدموں سے چلنے لگا اور اس کے برابر چلتا اس کا دوست بھی سست رفتاری سے چلنے لگا۔ لفٹ میں آ کر وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے تھے۔ اسے ایسا لگا کہ اس کا دوست بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہارون سے مخاطب تھا۔ ایک صاف ستھرے اور عمدہ فرنیچر سے آراستہ بڑے سے کمرے میں وہ لوگ داخل ہوئے تو پیٹر اس سے بولا۔

''تم لوگ بیٹھو۔ میں ان دونوں کو بلا کر لاتا ہوں۔ بلکہ بلا کر کیا جگا کر لاتا ہوں۔'' وہ ہنستا ہوا باہر نکلنے لگا تو ہارون فوراً بولا۔

''بھائی مروامت دینا۔ عبداللہ کو جگانا کسی مردے کو اٹھانے کے مترادف ہے۔ کبھی ہم یہیں بیٹھے رہ جائیں۔'' وہ بڑے اچھے موڈ کے ساتھ ہنستے ہوئے اس سے بولا تو وہ قہقہہ لگا کر باہر نکل گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس کی آواز پر آئلہ نے اس کی طرف دیکھا تو بڑے بے تکلفانہ انداز میں بستر پر نیم دراز وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر ٹک گئی تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر کھڑا ہو گیا اور وارڈروب کھول کر اس میں سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اسی وقت پیٹر دروازہ کھول کر اندر آیا اور اسے تنہا بیٹھا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''ہارون کہاں گیا۔''

''وہ شاید نہا رہے ہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دے کر دوبارہ کمرے کا انٹیریر دیکھنا شروع کر دیا تو وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''آپ بھی فریش ہو جایئے۔ ابھی آپ کو اپنے باقی دونوں دوستوں سے ملوائیں گے۔ ہمارا چار دوستوں کا گروپ ہے میں اور ہارون تو خیر بچپن کے دوست ہیں۔ عبداللہ اور مائیکل سے ہماری دوستی شکار کے حوالے سے اتفاقاً ایک جنگل میں ہوئی تھی۔ بڑی عجیب دوستی ہے ہماری، پورا سال ہم لوگ ایک دوسرے سے نہیں ملتے کہ سب الگ الگ دیسوں کے باسی ہیں مگر ہمارے درمیان یہ خاموش معاہدہ ہے کہ سال کے ان دنوں میں ہم آپس میں ملتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ باقی سال صرف ایک دوسرے سے فون پر یا انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ رہتا ہے۔'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔ انداز میں بے حد شائستگی اور مخاطب کے لیے احترام موجود تھا۔ وہ تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا تو پیٹر سے بولا۔

''اب اگر روک ہی لیا ہے تو جلدی سے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کرو۔ بڑی زبردست بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''بڑا احسان کیا ہے میرے اوپر رک کر۔ ایک تو تمہاری محبت میں بول رہا تھا۔ پوچھو ان دونوں سے، اتنے دنوں چرچ جا کر کتنی مرتبہ تمہاری زندہ سلامت واپسی کے لیے دعائیں مانگی ہیں۔'' جواب میں وہ بھی ہنسنے لگا۔ آئلہ خاموشی سے محبت کا یہ مظاہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ باہر نکل گیا تو ہارون ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ بھی مراقبے سے نکل آیئے اور منہ ہاتھ دھو لیجیے۔'' شیشے میں سے اسے دیکھتا وہ بولا، تو اسے بھی اپنے بے تکے حلیے کا خیال آیا۔ خاموشی سے کھڑی ہو کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھی۔ ایک عجیب سی جھجک اور دیوار سی دونوں کے بیچ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ جو اس سے بڑی بے تکلفی سے

باتیں کرنے لگی تھی اب اس سے بات کرتے ایک جھجک سی حائل ہو گئی تھی۔ بڑے سے اسٹائلش باتھ روم کے قد آدم آئینے میں خود کو پتا نہیں کتنے روز بعد دیکھا تو اپنی شکل اس سے خود ہی نہیں پہچانی گئی۔ وہ جو بڑی اپ ٹو ڈیٹ اور نک سک سے درست، تیار رہا کرتی تھی اس وقت عجیب و غریب سی کوئی مخلوق نظر آ رہی تھی۔

خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور اپنی اصلی شکل واپس لانے کی کوشش کی۔ وہیں رکھے برش سے بال بنائے۔ دس پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد چہرہ کچھ جانا پہچانا اور اپنا اپنا سا لگا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے دوستوں سے بھوت بن کر ملنے کا اسے کوئی شوق نہیں تھا۔ اتنے خوب صورت گہرے نیلے رنگ کے ٹائلوں اور بڑے سے ٹب والے باتھ روم میں اس کا نہانے کا دل چاہ رہا تھا اپنی اس خواہش کو دباتی باہر نکلی تو وہ آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹا نظر آیا۔ وہ خاموشی سے دوبارہ صوفے پر ٹک گئی۔ اس کی آمد سے بے نیاز وہ ویسے ہی پڑا رہا۔

اسی وقت ہلکی سی دستک دے کر پیٹر اور اس کے پیچھے دو اور افراد اندر داخل ہوئے تو وہ ساری بے نیازی بھول بھال اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دوستوں سے ملنے لگا۔ ملنے ملانے کا سلسلہ تمام ہوا تو ان دونوں کی نظریں اس پر پڑیں ان کی نگاہوں میں پیٹر کی طرح حیرانی نہیں تھی شاید وہ اس کے بارے میں انہیں بتا کر لایا تھا۔ پیٹر نے ایک اچھے میزبان کی طرح تعارف کروانے کی رسم ادا کی۔

''یہ عبداللہ ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے بہت مشہور و معروف کاروباری شخصیت، شکار بطور شوق اپنایا ہوا ہے شام ان کا وطن ہے اور آپس کی بات ہے۔ یہ بہت اچھے اور ماہر کک بھی ہیں۔ ہماری شکاری مہمات میں یہ ہم لوگوں کو مزے دار کھانے پکا کر کھلاتے ہیں۔'' وہ اس کے سامنے کھڑے بندے کی طرف اشارہ کر کے تعارف کروا رہا تھا۔ آئلہ نے اس بندے کی طرف دیکھا وہ بھی پیٹر ہی کی طرح شائستہ اور مہذب نظر آیا۔

''اور یہ جناب مائیکل ہیں۔ انگلینڈ کے رہنے والے۔ ہم سب میں صرف یہی پروفیشنل شکاری ہیں۔ باقاعدہ لائسنس یافتہ۔ اس لیے جنگلات اور شکاریات کے موضوع پر ان کا علم اور معلومات ہماری بہت رہنمائی کرتا ہے۔'' ہارون اس تعارفی پروگرام سے لاتعلق دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ جبکہ باقی افراد ابھی تک کھڑے ہوئے تھے۔ اسی وقت بیرا خوب لدا پھندا اندر چلا آیا اور ٹیبل پر انواع و اقسام کا کھانا سجانے لگا۔ وہ تینوں اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ بیرا مزید احکامات لے کر کمرے سے چلا گیا تو پیٹر اس سے بولا۔

''تم وہاں کہاں پڑے ہوئے ہو۔ ادھر آؤ۔'' اس کے بلانے پر وہ لمبی سی جماہی لیتا اٹھ کر یہیں آ گیا اور آئلہ سے کچھ فاصلے پر اسی صوفے پر بیٹھ گیا۔ درمیان میں رکھی ٹیبل پر ڈھیروں لوازمات سجے تھے۔ وہ کوئی شرم و حیا کی ماری دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی شروع سے کو ایجوکیشنز میں پڑھا تھا مگر اس وقت اتنے سارے مردوں کے درمیان اسے اپنا وجود بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اپنے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اس نے پیٹر کی آواز سنی۔

''آپ لیجیے نا۔'' وہ اس کے ہاتھ میں پلیٹ پکڑا رہا تھا۔ آئلہ نے شکریہ کے ساتھ پلیٹ تھام لی۔ ہارون بڑے بے تکلف انداز میں پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس نے تکلفاً تھوڑا آملیٹ اپنی پلیٹ میں

ڈالا اور کانٹے سے اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔ وہ تینوں بھی کھانے لگے تھے۔
''آپ نے میرے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔'' پیٹر نے اس سے کہا۔ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی عبداللہ بول پڑا۔
''تم کسی کو بولنے کا موقع دو تو کوئی بولے اور تمہارا تعارف تم سے بہتر میں کروا سکتا ہوں۔'' اسے جواب دیتا وہ آئلہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مس آئلہ یہ ہیں پیٹر، سوئٹزرلینڈ کے خاصے غیر معروف مکینیکل انجینئر۔ اپنے طور پہ خود کو بہت کچھ سمجھتے ہیں جس سے ہم لوگوں کا اتفاق کرنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ خیر سے ان کی منگنی ہو چکی ہے اور ان کی منگیتر جولی نے اس وقت تک شادی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے جب تک یہ شکار وغیرہ جیسے فضول کام کرنا چھوڑ نہ دیں۔ اس چکر میں تین سال سے ان کی شادی التوا میں پڑی ہوئی ہے۔'' وہ بڑا ہنس مکھ سا تھا۔ پیٹر کے گھورنے کے باوجود اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ اس وقت بیرا چائے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا۔ عبداللہ نے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر آئلہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ یہ کسی خاتون کا بنیادی حق ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی میں کوئی اور چائے نہ بنائے۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے بولتا شاید اس کی جھجک کم کرنا چاہ رہا تھا۔
اسے وہ سب ہی بہت اچھے لگے تھے۔ پڑھے لکھے مہذب اور شائستہ اطوار کے مالک وہ اپنی پلیٹ رکھ کر کپوں میں چائے ڈالنے لگی۔ عبداللہ اب پیٹر سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔
''ایک تو مجھے آدھی رات کو سوتے سے اٹھا دیا۔ اوپر سے برائی پھر بھی مجھے ہی ملنی تھی۔'' وہ پتا نہیں کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔
''ساڑھے چار بجے کو تم آدھی رات کہہ رہے ہو۔'' مائیکل نے اسے گھورا تو وہ آئلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔
''آپ کا کیا خیال ہے ساڑھے چار بجے صبح ہو جاتی ہے۔'' وہ شاید سونے کا بہت ہی شوقین تھا۔ جواب میں وہ صرف مسکرا ہی سکی اور سب سے پوچھ کر ان کے کپوں میں چینی ڈال کر سرو کرنے لگی۔ سب سے آخر میں اس نے اپنے برابر بیٹھے شخص کی طرف کپ سرکا دیا بغیر چینی ملائے اور پھر خود بھی کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔
''ہم سب کا تعارف تو ہو گیا آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' پیٹر نے جو کافی دیر سے اسے بغور دیکھ رہا تھا کہا تو باقی سب بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سوائے اس کے جو اسے اپنے ساتھ لا کر اب اس سے قطعاً لاتعلق ہو چکا تھا۔ بڑے اطمینان سے بیٹھا وہ سلائس کے اوپر مارملیڈ لگا رہا تھا۔
''میرا نام آئلہ ہے۔ پاکستانی ہوں۔ میں نے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہوئی تو گھومنے پھرنے اپنے چچا کے پاس کینیا آئی ہوئی ہوں۔'' وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اتنا طویل جملہ بولی تھی۔ وہ سب ہی بغور اسے سن رہے تھے۔
''اچھا تو شکار آپ کا شوق ہے۔'' مائیکل جو خاصا کم گو لگ رہا تھا پہلی مرتبہ اس سے مخاطب ہوا۔ ہارون نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے فوراً چائے کا کپ منہ سے لگا لیا۔ اسے بغیر دیکھے بھی پتا تھا کہ وہ اس بات پر مسکرایا ہے۔ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی مائیکل نے دوبارہ بولنا شروع

بقیہ صفحہ نمبر "213" پر

ب نے شکر ادا کیا تھا۔ خاص طور پر چچی جان جنہیں پرائی بچی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اپنی بیٹی اور داماد ے زیادہ انہیں اس کی فکر تھی۔
''وہ تو خیر گزری جو اتنے دنوں میں پاکستان سے کوئی فون ودن نہیں آیا۔ ورنہ تمہارے بارے میں ا کیا کہتی۔'' چچی جان گزرے واقعات پر ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھیں۔
لیلیٰ اور دانش کے کافی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ بیٹی کو اتنے برے حالوں میں پڑے دیکھ کر چچی ن نے فی الوقت ڈانٹ پھٹکار کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا مگر یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے یہ ت آئلہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اور اس کے خیالات کی تصدیق چچی جان نے اس روز ہاسپٹل سے گھر بں آتے وقت گاڑی میں کر دی۔
''بہت ہو گئیں اس لڑکی کی بے سر و پا حرکتیں۔ خود تو خودسری دکھاتی ہی ہے دوسروں کو بھی اپنے تھ مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ بس اب اس کی رخصتی کروا رہی ہوں میں۔ پھر یہ جانے اور اس ے سسرال والے۔ چاہے تو خلاؤں پر جائے یا سمندر کی تہ میں میری بلا سے۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں تمہارے چچا میاں تو بھابھی اور بھائی جان کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔'' وہ لیلیٰ کی حمایت میں ھ بول کر ان کے غصے کو دو آتشہ نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے چپ بیٹھی ان کا غصہ ملاحظہ کرتی رہی۔
پندرہ بیس روز ہاسپٹل میں رہ کر وہ لوگ گھر واپس آئے تو اس نے بھی رختِ سفر باندھا بھابھی نے ن کر کر کے ناک میں دم کر دیا تھا۔
''تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا جلدی سے واپس آ جاؤ۔ مونی کی برتھ ڈے آنے والی ہے آخر تم ب آ دگی۔'' اگرچہ کہ مونی کی برتھ ڈے میں ابھی پورے دو ماہ باقی تھے۔ اسے جانے کی تیاری کرتے یکھ کر لیلیٰ اس سے لڑنے لگی۔
''اتنی جلدی واپس جا رہی ہو۔ ابھی تو ہم لوگوں نے ساری باتیں بھی نہیں کیں۔ میں نے تم سے ہارے اوپر گزرے حالات بھی صحیح سے نہیں سنے۔'' وہ اسے اپنے اوپر گزرے حالات سنانا بھی نہیں ہتی تھی اس لیے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ جبکہ چچی جان نے اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد بیٹی کو سخت اہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔
''پہلے ہی تمہاری کرم نوازیوں کے مزے وہ اچھی طرح اٹھا چکی ہے۔ اسے جانے دو۔ میں اہتی بھی نہیں ہوں کہ اس کے اوپر تمہارا سایا بھی پڑے اور یہ تمہاری طرح خودسر اور ضدی بنے۔'' سا بار کیونکہ معاملہ زیادہ ہی سنگین ہو گیا تھا چنانچہ چچا میاں بھی چچی جان کے ہمنوا نظر آ رہے تھے اور لیلیٰ بے چاری کی عنقریب آنے والی شامت کا سوچ کر اسے ابھی سے ہنسی آ رہی تھی۔ روانگی سے قبل اکیلے ں چچی جان نے اسے سمجھایا تھا۔
''ہمارے ہاں کے لوگوں کی ذہنیت بہت خراب ہے۔ ان تمام باتوں کا ذکر لیلیٰ سمیت کسی سے ی مت کرنا۔ لڑکیوں کے لیے کہیں کوئی معافی نہیں ہوتی ذرا سی بات ان کے کردار پر دھبا بن جاتی ہے۔ بھابھی کو بتانا چاہو تو بتا دینا باقی نہ کسی دوست کو نہ کسی اور کو۔'' وہ چچی جان کو پہلے ہی روز اپنے جنگل ں قیام اور ہارون کے بارے میں مختصر لفظوں میں بتا چکی تھی۔ ان کی بات اس نے پلو سے باندھ لی اور کی اور سے تو کیا امی سے بھی ان تمام واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

وہ واپس آگئی تھی ایک بدلی ہوئی شخصیت میں ڈھل کر۔ لیلیٰ کی طرح جان محفل تو وہ پہلے بھی کبھ نہیں رہی تھی مگر اپنے قریب ترین لوگوں کے لیے وہ بے حد زندہ دل اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ اس کی اس تبدیلی کو سب ہی نے محسوس کیا تھا سب کے بارہا پوچھنے پر وہ یہ ہی کہہ پائی۔

''میرا خیال ہے میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ اس لیے اب تھوڑا سا سوبر اور میچیور ہو ہی جانا چاہیے۔''

اس کی واپسی کے محض دو ماہ بعد لیلیٰ کی رخصتی کر دی گئی تھی۔ اس بے چاری کے لاکھ واویلا مچانے پر بھی کسی نے اس پر رحم نہ کھایا تھا۔ وہ دلہن بنی لیلیٰ کی روتی بسورتی تصویریں دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ امی ابو کے ہاتھ اس نے ایک طویل ناراضگی سے بھرپور خط بھجوایا تھا جس میں شادی میں شرکت نہ کرنے پر اسے دھمکیوں اور گالیوں سے نوازا گیا تھا۔ بیٹی کو رخصت کر کے چچا میاں کو وہاں تنہائی کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان واپسی کی ٹھانی۔

''بہت رہ لیے دیار غیر میں۔ اپنا وطن پھر اپنا ہوتا ہے۔'' انہوں نے فون پر ابو سے کہا تھا اور پھر تمام کاروبار وائنڈ اپ کر کے وہ یہیں کراچی میں سیٹل ہو گئے تھے۔

دن بڑی سبک رفتاری سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ وہ شاید اسے کہیں خوابوں میں ملا تھا اور آنکھ کھلنے پر اس نے اسے کھو دیا تھا۔ رات کی تنہائی میں بے اختیار آنسو بہاتے اس نے اکثر سوچا تھا کہ وہ کسی اور ہی دنیا کا باسی تھا کچھ دیر کو اس کی زندگی میں آیا اور پھر واپس اپنی دنیا میں لوٹ گیا۔ کیا اس نے کبھی سوچا ہوگا کہ کہیں دور ایک پاگل لڑکی آج بھی اس کے لیے آنسو برساتی ہے۔ وہ تو شاید اسے بھول بھی گیا ہوگا اور اگر کبھی اتفاقاً دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر کسی بات پر وہ اسے یاد آئی بھی ہو گی تو اس نے بری لاپروائی سے سر جھٹک کر سوچا ہوگا بڑی ہی بیوقوف اور بزدل لڑکی تھی جو خوامخواہ میرے گلے پڑ گئی تھی۔ اور پیٹر وہ پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ وہ اکثر خود سے سوال کرتی۔

''تمہاری طرح مجھے بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ اس وقت دور کہیں ہماری اس سوچ پر شاید ہنس رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن سے آپ ساری زندگی بھی ملتے رہیں اور خود کو ان سے بہت قریب بھی محسوس کرتے ہوں مگر درحقیقت آپ کے اور ان کے درمیان روز اول جیسی اجنبیت ہمیشہ برقرار رہے۔ وہ اپنے اور اپنے آس پاس موجود لوگوں کے درمیان ایک نظر نہ آنے والی دیوار بڑے غیر محسوس انداز میں حائل کیے رکھتا تھا اور سامنے والے کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس دیوار کو پار کر جائے۔'' اپنی ان تمام سوچوں سے گھبرا کر وہ بڑی بے بسی سے سوچتی کاش میں چچا میاں کے پاس نہ گئی ہوتی اور اگر چلی ہی گئی تھی تو اس روز لیلیٰ کے ساتھ نہ جاتی تو یہ نارسائی کا دکھ ہم سفر نہ ہوتا۔

☆☆☆

امی صبح ہی سے بضد اسے چلنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں اور وہ نہ جانے کے لیے سو طرح کے بہانے بنا کر انہیں منع کر چکی تھی۔ مگر ان کا اصرار اپنی جگہ قائم تھا۔ اس کے پیہم انکار پر آخر وہ خفا ہو کر

ن کو منانے کی خاطر وہ تیار ہونے لگی۔ اس کی تیاری دیکھ کر وہ نئے سرے سے ناراض ہونے لگیں ا موڈ بھی آف ہو گیا۔

''وہاں کیا کوئی فینسی ڈریس شو ہے۔ کسی ڈنر میں جانے کے لیے یہ کپڑے مناسب ہیں۔'' وہ نے لگے کاٹن کے سوٹ اور ہلکے پھلکے میک اپ سے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

اس کی بات پر بھابھی ہنس پڑی تھیں ''میری جان آج وہاں فینسی ڈریس شو ہی ہے۔ آج تو وہاں ا پریاں جلوہ افروز ہو رہی ہیں ویسے یہ پریاں روبینہ، ڈپلیکس، بھابیز اور لیونگ ڈول وغیرہ کے ہاتھوں کا کارنامہ ہوں گی۔'' وہ بڑی شرارت سے ہنستے ہوئے بولیں تو اسے بھی ہنسی آ گئی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس ڈنر کی تیاریاں تو ہفتے بھر سے جاری ہیں۔ پرسوں فاخرہ کا فون آیا تو می میں آج ڈپلیکس گئی تو وہاں مومو فینسٹل، مینی کیور، پیڈی کیئر پتا نہیں کیا کیا ایسے کروا رہی تھی ، شادی میں جانا ہے۔''

بھابھی فاخرہ کے انداز میں بول کر اسے بتانے لگیں تو امی بھی مسکرا دیں۔ بھابھی اپنی بات جاری ہوئے بولیں۔

''میں بھی بن گئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی کہ فاخرہ تمہارا وہاں کیسے جانا ہوا تھا۔ تو بے ایک لمحے کو بوکھلا کر رہ گئی پھر کہنے لگی میں تو ہیئر کٹنگ وہیں سے کرواتی ہوں وہی کروانے گئی تھی۔''

بھابھی کی باتوں میں لگ کر امی کی توجہ اس کے حلیے پر سے ہٹی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ بغیر ے جا رہی تھی اس لیے زیادہ تیار ہونے کا اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا موڈ ف ہو گیا اپنی کزنز کی یہ سستی اور گھٹیا حرکتیں اسے بڑی ناگوار گزر رہی تھیں۔

''لڑکیوں کو کم از کم اپنی نسوانیت کا احترام تو کرنا چاہیے۔'' وہ سب سے الگ تھلگ ایک ٹیبل پر ۔ امی اور بھابھی سب لوگوں سے ملنے ملانے میں لگی ہوئی تھیں۔ ساحرہ پھوپھو جو ابو کی فرسٹ تھیں بڑے طویل عرصے بعد وطن آئیں تو پورا خاندان ان کی خدمت میں لگ گیا۔ جن جن لوگوں روں میں کنواری دوشیزائیں موجود تھیں سب الرٹ ہو گئے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے سبقت لے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس تمام مقابلے بازی کی اصل وجہ پھوپھو کا اکلوتا، خوبرو، جوان اور ، جائیداد بیٹا تیمور تھا۔ جو تمام زندگی لندن میں رہا تھا اور پہلی مرتبہ ماں کے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ ، کی بیٹے کے ساتھ آمد کے سب لوگوں نے یہی معنی نکالے تھے کہ وہ اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانا ہیں۔ آج انہوں نے سارے خاندان کو اور اپنے دیگر ملنے والوں کو پی سی میں ڈنر دیا تھا۔ جس میں ، کا اہتمام تمام لڑکیوں نے ایسے کر رکھا تھا جیسے مقابلہ حسن میں شریک ہو رہی ہوں۔ لڑکیاں ساری ری تیمور کے گرد منڈلا رہی تھیں اور ان کی امیاں پھوپھو کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔ جس کسی سے دیا تیمور ہنس کر بات کر لیتے وہ خود کو فاتح سمجھنے لگتا۔ ڈنر کے وقت اس نے سنا اس کے برابر والی ٹیبل پھو کی سسرالی لڑکیاں بیٹھی تیمور ہی کو ڈسکس کر رہی تھیں۔

''تیمور ٹام کروز سے کتنا resemble کرتا ہے۔'' ان میں سے ایک بن کر بولی تو دوسری نے یا۔

''خالی شکل ہی کی کیا بات کر رہی ہو تم نے اس کی انگلش نہیں سنی۔ مائی گوڈ کتنی زبردست انگلش بولتا

ہے تیمور۔ اس کے آگے تو مجھے بھی ڈکشنری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حالاں کہ کونوینٹ میں اپنی تمام کلاس
فیلوز میں میری انگلش سب سے اچھی تھی۔ اس کا accent کتنا اچھا ہے۔'' آئلہ نے سر گھما کر اس لڑ
کو دیکھا جو سلیولیس فٹنگ کی شرٹ اور چوڑی دار پائجامے کے ساتھ دورِ جدید کے فیشن کے مطابق دوپٹہ
پیچھے سے لا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر ایک اور لڑکی بے ساختہ بولی۔
''کیوں نہ ہو بھئی After all he is an oxford man"
ان لوگوں کی باتوں اور حلیوں سے بے زار وہ امی کے پاس آ کر چلنے کے لیے کہنے لگی تو وہ اُلٹا
میں سر ہلاتی بولیں۔
''کھانا کھاتے ہی چلے جانا کتنی بری بات ہے۔ ویسے بھی ابھی غزلوں کا پروگرام ہے۔ تھوڑا
سن لیتے ہیں پھر چلیں گے۔''
امی کا غزلوں کے لیے انٹرسٹ اس کے لیے حیرانی کا باعث تھا۔ شاید دل ہی دل میں دیگر ماؤ
کی طرح وہ بھی یہ چاہتی تھیں کہ یہ مقابلہ ان کی بیٹی جیت جائے اسے امی کی سوچ پر کچھ افسوس بھی ہوا
غصہ بھی آیا تو ناراضگی میں سب سے آخر میں رکھی الگ تھلگ کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ اس جگہ
اچھا خاصا اندھیرا تھا لوگوں کی نظروں سے دور وہ بے زاری سے بیٹھی وقت گزار رہی تھی جب کوئی اس
برابر والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔
''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' آئلہ نے اپنی کسی سوچ سے چونک کر برابر میں دیکھا تو وہ ا
کروز کا جانشین آکسفورڈ مین اور تمام لڑکیوں کا سورج جس کے گرد وہ کسی سیارے کی طرح گردش کر ر
تھیں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
بیٹھنے کے بعد اجازت مانگنے کا وہ کیا جواب دیتی اس لیے بغیر کوئی جواب دیے دوبارہ سا
دیکھنے لگی جہاں غزل گو اپنی سریلی آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

ہاتھ دیا اس نے میرے ہاتھ میں
میں تو ولی بن گیا اک رات میں

وہ غزل کے بولوں کی طرف توجہ مرکوز کر رہی تھی جب وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔
''آپ کو شاید غزلیں پسند نہیں۔ اس لیے بور ہو رہی ہیں۔'' اسے خوامخواہ اس سے چڑ ہونے لگی
بلاوجہ اس کے سر پر سوار ہو رہا تھا۔ محفل میں موجود تمام لوگوں کی توجہ غزلوں سے ہٹ کر اب ا
اندھیرے کونے پر تھی جہاں وہ محفل کی جان ایک بڑی معمولی اور عام سی لڑکی جو ہر گز کسی غیر ضروری ت
کے قابل نہ تھی کے برابر بیٹھ کر تمام لوگوں کی امیدوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ اس کے جواب نہ دینے کا برا مانے بغیر بولا۔
''مجھے بھی غزلیں پسند نہیں ہیں البتہ یہاں کا فوک میوزک اچھا لگتا ہے۔''
''فوک میوزک پسند ہے اس لیے غزلیں سن رہے ہیں، اگر غزلیں پسند ہوتیں تو شاید فو
سنتے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تو وہ بغیر برا منائے بڑی خوش دلی سے ہنس دیا اور بولا۔
''جتنی خوب صورت ہو اتنی ذہین بھی ہو اور مجھے ذہین لڑکیاں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔''
وہ جہاں سے آیا تھا وہاں یہ بے باکی بڑی عام سی بات تھی۔ مگر یہاں جس سے یہ بات کہی گئی

وہ ایک دم اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی اٹھ گیا اور اس کے چہرے کے غصے اور ناراضگی کو حیرت
سے دیکھتا ہوا کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ فوراً اگلی نشستوں کی طرف بڑھ گئی جہاں امی وغیرہ بیٹھے تھے۔ اس
نے تمام لوگوں کو بغور اپنی طرف دیکھتا پایا تو غصہ کچھ اور سوار ہو گیا۔ تمام لوگوں کے چہرے بجھے بجھے نظر
آ رہے تھے۔ وہ لڑکیاں جو کچھ دیر پہلے بہت چہک رہی تھیں۔ روانی سے اپنی تمام گفتگو انگلش میں کر رہی
تھیں اب جیسے اس جگہ سے بے زار ہو گئی تھیں۔ انگلش کی جگہ دوبارہ اردو نے لے لی۔ وہ امی سے
واپسی کے لیے بضد ہوئی تو انہیں اس کی مانتے ہی بنی۔

☆☆☆

اگلا دن پورے خاندان کی لڑکیوں کے لیے بہت بڑا صدمہ لے کر آیا تھا۔ پھوپھو اپنے لاڈلے
کے لیے اس کا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ امی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ لاڈلی بیٹی کے لیے جیسا
شریکِ سفر انہوں نے سوچا تھا وہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ بھابھی اسے گدگدا رہی تھیں، چھیڑ رہی تھیں۔
''اچھا تو جان کر اتنے سادے سے حلیے میں گئی تھیں تاکہ دوسروں سے منفرد نظر آسکو۔''
امی ابو نے رسمی طور پر سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا جس کے بارے میں سب ہی کو یقین تھا کہ
جواب ہاں ہی ہونا ہے۔
اس نے بھابھی کے سامنے اس رشتے سے انکار کیا تو وہ اسے ایسے دیکھنے لگیں جیسے اس کی دماغی
حالت پر شک ہو۔
''تم پاگل واگل تو نہیں ہو گئیں۔ ارے خوش قسمتی تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور تم
بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ ایسا شاندار بندہ تو کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ آکسفورڈ کا پڑھا ہوا
قابل اور ذہین شخص جو بے حد خوب صورت اور دولت مند بھی ہو اس کے لیے کوئی پاگل لڑکی ہی انکار کر
سکتی ہے۔ لندن کے میئر اور بڑے بڑے افسران تو اس کے ذاتی دوستوں میں سے ہیں۔ سرے محل سے
بھی زیادہ عالیشان اس کا اپنا پیلس ہے، جس میں تم راج کرو گی۔''
اس کے انکار کی وہاں کوئی حیثیت نہ تھی سب ہی خوش تھے۔ اس کے چہرے کی اداسی شاید بے
تحاشا خوشی میں کسی کو نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ ان ہی دنوں لیلیٰ اور دانش شادی کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان
آئے تو لیلیٰ یہ خبر سنتے ہی سب سے پہلے اس سے ملنے چلی آئی۔
وہ اپنے کمرے میں تکیے میں منہ دیے پڑی تھی جب وہ عادت کے مطابق چیختی چلاتی اندر آئی اور
آتے ہی اس کے منہ پر سے تکیہ گھسیٹتے ہوئے بولی۔
''بہت خوب ساری دنیا کو بے آرام کر کے خود آرام فرما رہی ہیں۔'' وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔
''تمہاری صلاحیتوں پر تو مجھے کبھی شک نہیں تھا تم خود ہی اپنے آپ کو Under estimate کیا کرتی
تھیں مجھے کہتی تھیں کہ میں آئے روز کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کیے رکھتی ہوں اور خود نے کیا زبردست کام کیا
ہے۔ پورے خاندان کی لڑکیوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ امیاں دوپٹے پھیلا پھیلا کر تمہیں
بددعائیں دے رہی ہیں۔'' وہ اپنی بات کو انجوائے کر کے خود ہی ہنسنے لگی پھر بولی۔

''آج کل تمہیں ہچکیاں تو خوب آتی ہوں گی؟'' اچانک اس کی نظر اس کے روئے روئے سے چہرے پر پڑی تو وہ چپ ہو کر غور سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے آملہ تم خوش نہیں ہو۔'' اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا کر بیٹھی رہی تو وہ اس کا سر اوپر اٹھا کر بولی۔

''تم روئی تھیں؟'' وہ اپنے آنسو اس وقت لیلیٰ سے بھی چھپانا چاہتی تھی اس لیے اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہونے لگی تو وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ جما کر بولی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے میں نے آج تک تمہیں اپنی سب سے اچھی دوست سمجھا اپنی ہر بات تم سے شیئر کی اور تم نے جواب میں میرے ساتھ کیا کیا۔ جلدی بتاؤ تم نے کون کون سے باتیں مجھ سے چھپائی ہوئی ہیں۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت میں بچپن کی اس دوستی پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

اور وہ پتا نہیں کب سے ایک کاندھے کی متلاشی تھی جس پر سر رکھ کر رو دیا جا سکے۔ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر وہ روتی ہوئی بولی۔

''لیلیٰ میں یہ منگنی نہیں کرنا چاہتی۔ پلیز اسے رکوا دو۔ تم تو کچھ بھی کر سکتی ہو۔'' اس نے اسے رونے دیا دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو وہ خاموشی سے ویسے ہی اس کے کندھے سے لگی بیٹھی رہی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی بڑے پیار سے بولی۔

''آملہ تم مجھ سے شیئر نہیں کرو گی۔ جو بھی تمہارے دل میں ہے وہ سب مجھ سے کہہ دو۔''

''لیلیٰ وہ بہت اچھا تھا۔ اس جیسا اچھا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ جیسے اس سے سرگوشی میں بول رہی تھی۔ جواب میں اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''ظاہر ہے وہ اچھا ہوگا۔ اچھا تھا تب ہی تو تمہیں پسند آیا۔''

''وہ شاید تیمور کی طرح ہینڈسم نہیں تھا، ہو سکتا ہے اس کی طرح qualified اور دولت مند بھی نہ ہو۔ مگر میرے لیے وہ دنیا کا سب سے اچھا انسان تھا۔ محبت یہ تو نہیں ہوتی کہ آپ کسی کی شکل صورت، دولت یا اسٹیٹس سے متاثر ہو جائیں محبت تو یہ ہوتی ہے کہ آپ ان تمام چیزوں کے بغیر کسی کو چاہیں۔'' وہ دھیرے دھیرے اپنی دوست کے آگے کھل رہی تھی اور وہ اسے بغور سن رہی تھی۔

''میں پورے تین دن اس کے ساتھ رہی، آج سوچوں تو ایسا لگتا ہے زندگی وہی تھی جس میں وہ ساتھ تھا یہ جو گزر رہی ہے یہ تو جیسے کوئی سزا ہے۔''

وہ جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ لیلیٰ نے اسے ٹوکا نہیں خود سے کچھ پوچھا بھی نہیں بس خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

''بظاہر بہت اکھڑ اور بے مہر مگر در حقیقت بہت حساس اور ہمدرد وہ عام لوگوں جیسا نہیں تھا۔ وہ شاید اس دنیا کا باسی ہی نہیں تھا۔ ایک ویران جنگل میں، میں تنہا اس کے ساتھ رہی۔ اس کی دسترس میں، کون تھا وہاں اسے روکنے والا وہ جو چاہے میرے ساتھ سلوک کرتا، مگر اس نے کبھی ایک مرتبہ بھی میری طرف آلودہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں میں نے اپنے لیے ہمیشہ احترام اور پاکیزگی دیکھی۔ کیا کوئی اور ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنا باکردار اور شریف النفس۔ کون لگتی تھی میں اس کی، کچھ بھی نہیں مگر وہ میری حفاظت یوں کرتا جیسے میں کوئی کانچ کی گڑیا ہوں جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے کرچی کرچی ہو جائے گی۔ کوئی کسی کے لیے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتا اس نے اپنی جان پر کھیل کر میری حفاظت کی اس طرح جیسے میں اس کی ذمہ داری ہوں۔ میرے لیے اس نے اپنا قیمتی لہو پانی کی طرح بہا دیا مگر مجھ پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو نکل آئے تو لیلیٰ نے اپنے کندھے پر دھرا اس کا سر اٹھایا اور ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر اس کے اشک صاف کرتی بولی۔

''جب وہ اتنا اچھا تھا تمہارا اتنا خیال بھی رکھتا تھا تو مسئلہ کیا تھا۔ کیا وہ اچانک بچھڑ گیا کہیں کھو گیا؟''

''بچھڑا تو تھا مگر اچانک نہیں۔ ہم نے باقاعدہ ایک دوسرے کو گڈ بائے کہا تھا۔'' وہ بڑے دکھ سے بولی تو لیلیٰ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ وہ تو صرف ہمدردی اور خلوص میں میرا خیال رکھتا تھا۔ اسے تو تمہاری طرح کی بہادر لڑکیاں پسند تھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کتنی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جسے اتنے اچھے آدمی کی رفاقت نصیب ہوگی، میں اس لڑکی کے مقدر پر رشک کرتی ہوں۔''

اور اس کی اس بات پر لیلیٰ نے اپنا سر پیٹ لیا ''یعنی تم یہاں بیٹھی یک طرفہ محبت کا سوگ منا رہی ہو۔ اسٹوپڈ یہ اکیسویں صدی ہے جس میں کوئی کسی کے لیے جوگ نہیں لیتا اور تم اپنی ون سائیڈڈ محبت کا غم منا رہی ہو۔''

لیلیٰ کی اس بات پر وہ جیسے بپھر گئی تھی ''کیا ہے یہ اکیسویں صدی۔ کیا اکیسویں صدی کے انسان کو چوٹ لگے تو درد نہیں ہوتا؟ کیا اکیسویں صدی کا انسان خوشی، دکھ، درد، غم، حسد، رشک، انتقام، محبت اور نفرت ان تمام جذبات سے دست بردار ہو گیا ہے؟ سائنسی ترقی کو انسانی جذبات سے منسلک مت کرو۔ انسان بھی وہی رہے گا اور اس کے جذبات بھی وہی رہیں گے چاہے وہ اکیسویں صدی ہو یا بائیسویں۔''

وہ اس کے مقررانہ انداز پر ہنس پڑی اور بولی۔

''او کے آئی ایگری، تمہاری بات درست ہے۔ مگر تم یہ تو کر سکتی تھیں کہ اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتیں۔''

''میں تھوڑا سا بولڈ ہو کر ایسا کہہ ہی دیتی اور اگر وہ جواب میں کہہ دیتا کہ میری ہمدردی کو آپ نے بڑے غلط انداز میں لیا ہے۔ میرے خلوص اور اخلاق کے جو معنی آپ نے نکالے ہیں اور جو امیدیں مجھ سے وابستہ کی ہیں آئم سوری میں وہ پوری نہیں کر سکتا تو میں اس کے سامنے جو اپنا بھرم کھوتی سو کھوتی خود اپنی نظروں سے بھی ہمیشہ کے لیے گر جاتی۔'' وہ اپنے آنسو صاف کر کے بڑی بوجھل سی آواز میں بولی تو لیلیٰ اس کے دکھ کو محسوس کرتی ہوئی قدرے افسردگی سے بولی۔

''ایک ایسا شخص جس کے بارے میں تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ تم سے محبت کرتا بھی تھا یا نہیں اور جو تم سے کھو بھی گیا ہے۔ کیا اس سے بہتر وہ نہیں جو بڑے خلوص سے تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ جس نے تم تک آنے کے لیے درست راستے کا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں زندگی میں بہت سی چیزیں اور بہت سے لوگ اچھے لگتے ہیں ضروری تو نہیں اچھی لگنے والی ہر چیز آپ کو مل بھی جائے۔ زندگی اس کا نام ہے۔ ہمیں اک وہ زندگی گزارنی پڑتی ہے جیسی ہم گزارنا چاہتے نہیں ہیں۔ تم تو بہت خوش قسمت ہو اس نے کتنی لڑکیوں

میں سے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تمہارا ساتھ مانگا ہے۔ یقین کرو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا احساس خوش کن ہوتا ہے۔

آپ کسی کے لیے بہت اہم ہیں اس کی خوشیاں اور غم آپ سے وابستہ ہیں یہ احساس کتنا روح پرور اور دل پذیر ہوتا ہے یہ بات جب تم جانو گی تو میری تمام باتیں تمہیں درست لگنے لگیں گی۔" وہ اس کی غمگساری اور رازدار بڑے پیار سے اسے سمجھا رہی تھی، بہلا رہی تھی۔ پھر کتنی ہی دیر وہ اسے سمجھاتی رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو ایسا لگا کہ دل کے دروازے تو شاید وہ اب بھی کسی کے لیے نہ کھول سکے مگر زندگی اگر اسی کا نام ہے تو یوں ہی سہی۔

☆☆☆

اس بے حد حسین، آکاش کی طرح بلند اور چاند کی طرح روشن شخص کے پہلو میں بیٹھی اپنی عزیز از جان دوست کے لیے لیلیٰ نے بڑے خلوص کے ساتھ دائمی خوشیوں کی دعا مانگتے اس کی پیشانی چومی تھی۔ شاید یہ اس کے برابر بیٹھے شخص کا اعجاز تھا کہ وہ ایک دم تمام لوگوں کو خود سے بہت بلند کوئی ماورائی مخلوق نظر آنے لگی تھی۔ گرے کلر کے خوب بھاری اور نفیس کام سے مزین خوب صورت گھاگرے میں وہ کوئی اپسرا نظر آ رہی تھی۔ ہر کوئی اس کی خوش بختی پر حیران تھا۔ کچھ چہروں پر حسد تھا، کچھ میں رشک اور کچھ میں محبت۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے برابر بیٹھا وہ یوں خوش نظر آ رہا تھا جیسے کوئی خزانہ اچانک ہی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اسے وہ بے حد قیمتی ڈائمنڈ رنگ پہناتے اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تھا اور جھک کر محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ رات میں وہ اسے فون پر کہہ رہا تھا۔

"آنلہ میں اتنا خوش ہوں کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ میں نے زندگی میں جو کچھ چاہا وہ ہمیشہ مجھے ملا۔ میں اتنا خوش نصیب ہوں اس بات کا احساس مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔" اور اس کے اندر جیسے کوئی بین کرنے لگا تھا زندگی نے اس کے ساتھ کتنا عجیب مذاق کیا تھا۔ یہی بات جن لبوں سے وہ سننا چاہتی تھی وہاں سے سن نہیں سکی تھی اور جہاں سے سن رہی تھی وہاں کی اس نے کبھی چاہ کی ہی نہیں تھی۔

"تم مجھے پہلی ہی نظر میں دوسروں سے مختلف اور منفرد لگی تھیں۔ تم اس روز وہاں ڈنر میں ایسے بیٹھی تھیں جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت پر بیٹھی رعایا کی طرف نظر کرم کر کے ان پر کوئی احسان کر دے۔ تمہارا وہ مغرور انداز مجھے اتنا متاثر کر گیا کہ میں کھنچتا ہوا تمہاری طرف چلا آیا۔ لیکن تم نے اپنے رویے سے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے زندگی میں اس سے پہلے کبھی کسی نے اگنور نہیں کیا تھا۔ میں ہمیشہ مرکز نگاہ رہا ہوں بے حد چاہا گیا ہوں مگر تم نے مجھے اس طرح نظر انداز کیا جیسے تمہاری نظر میں میری کوئی وقعت نہیں ہے۔ مجھے خاطر میں لائے بغیر تم آگے بڑھ گئیں اور میں نے اسی لمحے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر لیا۔ تم بالکل میری طرح ہو، مغرور، اپنی ذات سے پیار کرنے والی اور اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ کتنی لڑکیاں میرے آگے پیچھے پھرتی تھیں مگر مجھے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تم سب سے الگ ہو بہت خاص۔ لگتا ہے خدا نے تمہیں میرے لیے ہی بنا کر بھیجا ہے۔"

جہاں وہ بلا مقابلہ منتخب کر لی گئی تھی وہاں اس نے مقابلے میں حصہ لیا ہی نہیں تھا اور جس جگہ وہ پوری تیاریوں کے ساتھ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر میدان میں اتری تھی وہاں اسے شکست فاش ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے سنتی رہی تھی۔ جو اس کی رفاقت ملنے پر خوش تھا اپنے آپ نازاں تھا۔

جتنے دن وہ کراچی میں رہا روز اس سے ملتا۔ کبھی وہ ساتھ لنچ کرتے کبھی وہ اسے شاپنگ کرانے لے جاتا اور جو اگر وہ کبھی اس کا دیا ہوا کوئی تحفہ استعمال کر لیتی تو ایسے خوش ہوتا جیسے اس چیز کی اس سے پہلے کوئی قیمت نہ تھی محض اس کے استعمال کر لینے سے وہ چیز قیمتی ہوئی ہے۔ ان کی شادی ڈیڑھ دو سال سے پہلے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ تیمور جس کی فائیو اسٹارز ہوٹلز کی پورے یورپ میں چین تھی اب اس کا دائرہ وسیع کر کے اسے مڈل ایسٹ اور سینٹرل ایشین ممالک تک لانا چاہتا تھا اور اس کام میں وہ بے حد مصروف تھا۔

"میں چاہتا ہوں تم جب میری زندگی میں آؤ تو میرے اوپر کاموں کا اتنا لوڈ نہ ہو۔ ہم ورلڈ ٹور پر نکل جائیں خوب گھومیں اور پیچھے کاموں کی کوئی ٹینشن نہ ہو۔" جانے سے پہلے اسے نازک سا پرل کا نیکلس اپنے ہاتھوں سے پہناتے اس نے کہا تھا۔

اس نے تیمور سے اپنی جاب کرنے کا تذکرہ کیا تو اسے تو کوئی اعتراض نہ تھا مگر پھوپھو اس پر بری طرح ناراض ہونے لگیں۔

"میری ہونے والی بہو ٹکے ٹکے کے لوگوں کی نوکریاں کرے گی۔ مائی فٹ، ارے جتنی تنخواہ تمہیں ملے گی اس سے دوگنی تنخواہیں تو میں اپنے ملازموں کو دیا کرتی ہوں۔ پیسوں کی ضرورت ہے تو جتنے چاہئیں تیمور تمہیں ویسے ہی دے دیا کرے گا۔" اپنی ماں کی اس گھٹیا بات پر تیمور نے بعد میں اس سے بہت معافی مانگی تھی۔

"پلیز میری خاطر تم ممی کی ان فضول باتوں کو اگنور کر دو۔ وہ شاید اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں ہیں اس لیے اس طرح بی ہیو کر رہی ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں شادی کے بعد تم جو کام کرنا چاہو گی تمہارا پورا ساتھ دوں گا، تمہیں سپورٹ کروں گا۔" وہ ہرٹ ہوئی تھی یا نہیں مگر اپنے لیے اس شخص کا والہانہ انداز دیکھ کر اسے خود پر سخت تاسف ہوا تھا اپنے آپ پر شرمندگی ہوئی تھی جو اتنے اچھے انسان کو دھوکا دے رہی تھی اس کے ساتھ منافقت برت رہی تھی۔

اسے پتا تھا پھوپھو کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ بری طرح اسٹیٹس کے زعم میں مبتلا تھیں۔ انہیں آنلہ کا گلشن اقبال میں بنا وہ خوب صورت چھ سو گز کا ویل ڈیکوریٹڈ گھر کسی ڈربے کی طرح نظر آتا اور اس کے پورچ میں کھڑی وہ اکورڈ اور نسان پیٹرول انہیں اپنے محل میں کھڑی دس عالی شان گاڑیوں کے مقابلے میں انتہائی گھٹیا لگتیں۔ جب تک وہ واپس لندن نہیں چلی گئیں آنلہ کی جان عذاب میں گرفتار رہی۔ یہ کپڑے کیوں پہنے ہیں۔ جیولری اتنی چیپ اور ہلکی کیوں استعمال کرتی ہو۔ اپنے آپ کو ہمارے اسٹیٹس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو فلانے کے ساتھ اردو میں کیوں بات کی وغیرہ وغیرہ۔ وہ شاید بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی تھیں ورنہ اس عام سے لڑکی میں ان کے نزدیک ایسی کوئی بات نہ تھی کہ وہ ان کے گھرانے کی اکلوتی بہو ہونے کا اعزاز پاتی۔

لندن جا کر بھی تیمور کی وارفتگی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ وہ ویسے ہی اسے فون کرتا موقع بے موقع

مختلف تحائف بھیجتا۔ اب تو اس نے بھی خود کو سمجھا لیا تھا اس لیے وہ بھی جواب میں اسے تحفے بھیجتی۔ کسی وجہ سے اس کا فون نہ آتا تو خود کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی۔

چھ ماہ بعد اس کی سالگرہ آئی تو وہ بطور خاص صرف اس کی سالگرہ سیلیبریٹ کرنے اچانک آکر اسے حیران کر گیا۔ لیلیٰ اور دانش جو چچی جان کی بیماری کا سن کر ان دنوں کراچی آئے ہوئے تھے تیمور کے اس طرح آنے پر اسے چھیڑنے لگے۔

''تم نے ایسا کون سا تعویذ اسے گھول کر پلایا ہے، مجھے بھی بتاؤ یہ دانش کا بچہ تو ساتھ رہ کر بھی ہمیشہ میری برتھ ڈے بھول جاتا ہے۔ کبھی ہفتے بعد اور کبھی کبھار ایک آدھ مہینے بعد اگر اتفاق سے یاد آجائے تو میرے اوپر احسان کرتے ہوئے گفٹ سے نواز دیا جاتا ہے ورنہ اللہ اللہ خیر صلا۔'' لیلیٰ، دانش اور تیمور کے سامنے ہی اس سے بول پڑی تو وہ کچھ پزل سی ہوتی اسے گھور کر رہ گئی۔

شیرٹن میں پاکستان کے جی۔8 ممالک کے ساتھ تعلقات کے موضوع پر سیمینار ہو رہا تھا وہ تینوں انٹیلیکچوئلز اس میں شرکت کے لیے بری طرح بے تاب ہو گئے۔ تیمور صرف تین دن کے لیے آیا تھا اور آج اسے واپس چلے جانا تھا۔ اس کا اس قسم کا سیمینارز میں کبھی دل نہیں لگتا تھا مگر وہ مجبوراً تیمور کی خاطر ان لوگوں کے ساتھ چلی آئی تھی۔ جب وہ اس کا اتنا خیال رکھتا تھا تو اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ اس کی خواہشات کا احترام کرے۔ ان لوگوں کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر وہاں آدھا گھنٹہ بیٹھ کر ہی اس کا دل گھبرانے لگا اتنی ثقیل اور خوفناک گفتگو اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تیمور کے کان میں منمنائی۔

''تیمور مجھے سخت ڈپریشن ہو رہا ہے۔ تم لوگ یہ عالمانہ گفتگو سنو، میں ذرا باہر کا ایک راؤنڈ لگا کر آتی ہوں۔'' اس کی بات پر وہ مسکرا دیا تھا۔ اتنی دیر بھی وہ صرف اس کی خاطر بیٹھی رہی ہے اس لیے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے کی دیر تھی وہ سر پر پاؤں رکھ کر اس گھٹن زدہ ماحول سے باہر نکل آئی اور اِدھر اُدھر تفریحاً گھومنے لگی۔

سامنے سے آتے اس شخص کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی پھر اگلے ہی لمحے وہ اس سے کترا کر اسے نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی مگر اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا تھا وہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھ پائی اور نہ پیچھے آ پائی اور وہ اسے دیکھ کر صرف ایک لمحے کو حیرت سے منجمد ہوا تھا اگلے ہی پل وہ تیز قدموں سے درمیانی فاصلہ مٹاتا اس کے روبرو تھا۔

''اپنے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق اصولاً تو تمہیں مجھے پہچاننے سے انکار کر دینا چاہیے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا بغور اسے دیکھتا بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ ''صرف تمہاری وجہ سے روز بی بی سی دیکھتا ہوں کہ شاید تم نے کوئی تیر مار ہی لیا ہو مگر افسوس صد افسوس۔'' وہ اتنا خوش پتا نہیں کس بات پر تھا۔

''کچھ تو بولو۔ یہی کہہ دو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔'' وہ اس کی مسلسل چپ سے عاجز آ کر بولا تو وہ کسی شاک کی کیفیت سے نکل کر بمشکل بول پائی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' لہجہ بڑا نارمل سا تھا۔ وہ اس کے نارمل سے انداز اور اجنبی رویے پر اپنی حیرت چھپاتا ہوا بولا۔

''میں تو خیر ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ کیسی ہو کیا کر رہی ہو۔'' پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

''میرا خیال ہے کہیں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' اور چلنے کے لیے قدم یوں آگے ھائے جیسے یقین تھا کہ وہ بھی کہیں بیٹھنے کے لیے بے چین بیٹھی ہے۔ وہ اپنے آپ تو اس کے ساتھ نے سے روکنا چاہتی تھی مگر اس کے قدم خود بخود اس کے پیچھے اٹھ رہے تھے۔ اسے سست رفتاری سے چلتا یکھ کر وہ بھی آہستہ چلنے لگا۔ پھر ایک میز منتخب کر کے وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا اسے بھی بیٹھنے کی آفر کرنے لگا وہ بیٹھ گئی۔

ترنگ میں وہ میز پر انگلیاں بجاتا وہ بڑا ایکسائیٹڈ نظر آ رہا تھا۔ اس کے میز کی سطح کو گھورتے ہوئے رے کو بڑی فرصت سے جانچتا جیسے اس کا ایکسپریشن پڑھ لینا چاہتا ہو۔

''آج مجھے یقین آگیا ہے کہ دنیا اتنی وسیع بھی نہیں کہ اس میں جو ایک بار کھو جائے دوبارہ کبھی مل ی نہ سکے، تمہیں یقین تھا کیا کہ ہم آئندہ کبھی ملیں گے۔'' وہ اس سے عجیب لایعنی باتیں کر رہا تھا۔ اپنے ملنے پر اس کا اتنا خوش ہونا اس کے لیے بڑا تعجب خیز تھا۔ کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کر کے وہ خود ہی لا۔

''تمہیں نہیں لگتا ہم ہمیشہ فلمی انداز میں اچانک اتفاقاً ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ میں نے تو بھی ابھی بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کبھی فلموں کا مذاق نہیں اڑایا کروں گا۔ بھلے سے ہیرو آرکیٹکٹ بنے یا پائلٹ۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا اور وہ جواب میں مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

اسے اتنا سنجیدہ اور خاموش دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''دو سال اتنا طویل عرصہ تو نہیں ہوتا کہ کوئی پورا کا پورا چینج ہو جائے۔ مگر تم مجھے بہت بدلی ہوئی محسوس ہو رہی ہو۔ لڑکی کچھ تو بولو۔ اتنی دیر سے میں ہی بولے چلا جا رہا ہوں۔'' بات کے اختتام پر وہ شگفتگی سے مسکرایا تھا۔ اور وہ بدقت خود کو سمجھاتی، سنبھالتی اس سے بولی۔

''آپ یہاں کیسے آئے کیا کسی مہم کے سلسلے میں۔'' وہ جو اس انتظار میں تھا کہ ابھی وہ لڑکی کہے جانے پر اپنے سابقہ انداز میں روٹھے لہجے میں بولے گی ''میرا نام لڑکی نہیں ہے۔ میں آنکہ ہوں۔ آنکہ اکرام۔'' اس کے غیر متوقع جواب پر وہ کتنی ہی دیر چپ بیٹھا رہا۔

''مہم ہی سمجھ لو۔'' کافی دیر بعد اس نے جواب دیا تو لہجہ بڑا گم صم سا تھا۔ وہ ایکسائٹمنٹ اور جوش و خروش کچھ سرد پڑ گیا تھا۔

''آنکہ تمہیں مجھ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔'' وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جیسے وہ خوش ہونا بھی چاہتی ہے اور ہو بھی نہیں پا رہی یوں جیسے کوئی بات، کوئی چیز اسے ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ اس چہرے پر موجود ہر تاثر کو وہ بڑی آسانی سے پڑھ لیا کرتا تھا کہ یہ چہرہ سچا کھرا اور منافقت سے پاک تھا۔ مگر آج وہ اسے حیران کر رہی تھی اپنے عجیب و غریب رویوں سے۔

''میں آپ سے مل کر خوش کیوں نہیں ہوں گی۔ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کے بڑے احسانات ہیں مجھ پر۔'' بڑی دیر سے میز کو گھورتی سر اوپر اٹھا کر وہ بڑی ہمت کر کے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور فوراً ہی اپنی نظریں دوبارہ میز پر مرکوز کر دیں کہ ان آنکھوں کو وہ اپنا کوئی بھید نہیں دینا چاہتی تھی۔

''تم مجھ سے ناراض ہونا، مجھے پتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ناراضگی میں تم حق بجانب بھی ہو۔ کتنا سمجھایا تھا مجھے پیٹر نے وہ دوست میرا تھا مگر فیور تمہیں کرتا تھا۔'' اس کی اس بات پر اس نے سر اٹھا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی بے بسی سے مسکرا دیا۔ پتا نہیں وہ اپنی کس غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''آنلہ مجھے اپنی خوش قسمتی پر کوئی یقین نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم دوبارہ کبھی مجھے ملو گی۔ اپنے خیال سے تو میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ اس روز جب میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا تو تمہاری وہ ناراض اور شکایت کرتی نظریں میرے ساتھ ہی تھیں اور پھر ان نظروں نے ہمیشہ میرا پیچھا کیا۔'' وہ پتا نہیں کون سی زبان بول رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی مگر اچانک اسے محسوس ہوا کہ ہاتھ میں پہنی وہ قیمتی انگوٹھی اسے چبھنے لگی ہے۔ اپنی اس کیفیت سے گھبرا کر وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''کچھ مت کہو۔ صرف مجھے سنو۔ میں تم سے سچ بولنا چاہتا ہوں۔ صرف تمہارے ساتھ میں وہی بولنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ مجھے یہ بات قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ تم وہ پہلی اور آخری لڑکی ہو جو میرے دل کے دروازے پر لگا ''داخلہ منع ہے'' کا بورڈ نظر انداز کرتی بڑے آرام سے اندر آ گئیں اس طرح کہ میں تمہیں وہاں سے کبھی نکال بھی نہیں سکا۔ میں جو لڑکیوں میں بہت بدتمیز بہت روڈ اور ال مینرڈ مشہور تھا ایک کمزور سی لڑکی سے ہار گیا۔ تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں بتایا تھا مجھے ہارنے سے نفرت ہے۔ مگر میں یہ بات بھول گیا تھا کہ ہر نپولین کے لیے ایک واٹرلو بھی تو ہوتا ہے اور تم میرے لیے واٹرلو ہی ثابت ہوئیں میں تم سے ہار گیا۔ مجھے نہیں معلوم تم مجھے پہلی بار کب اچھی لگی تھیں شاید اس وقت جب تم بڑی بے چینی سے میرا انتظار کرتی مجھے دیکھ کر بولی تھیں ''شکر ہے آپ واپس آ گئے۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔'' یا شاید اس وقت جب مجھ سے لڑ جھگڑ کر خیمے سے باہر چلی گئی تھیں یا پھر جب پتھر پر بیٹھی مجھے بددعائیں دے رہی تھیں۔ مگر اتنا تو مجھے اس وقت بھی پتا تھا کہ میں تم سے اپنی عادت کے برخلاف بہت رعایت برت رہا ہوں مگر اپنے آپ سے بھی یہ بات قبول کرنے کے لیے میں ہرگز آمادہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب وقتی کیفیت ہے یا شاید ماحول کا اثر ہے جو میں تم میں اتنی دلچسپی لے رہا ہوں۔'' اس کے منہ سے یہ باتیں سن کر کچھ دیر کو وہ سب کچھ بھول گئی۔ اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی بھی سے یاد نہ رہی۔ بس سر جھکائے اسے سنتی رہی۔

''اپنی اس کیفیت کو میں نے اس وقت تک کوئی اہمیت نہ دی تھی جب تک وہ واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اس روز اپنا دہ اشتعال اور بے تحاشا غصہ مجھے خود حیران کر گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے خود پر ضبط کیا تھا ورنہ دل تو میرا یہ چاہ رہا تھا کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ ٹھیک ہے تمہاری حفاظت کی میں نے ذمہ داری قبول کی تھی مگر میرا رویہ محض ذمہ داری بھگتانے والا نہیں تھا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود سے ہی ناراض ہو گیا تھا اور جلد سے جلد تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا کر ان کیفیات سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا یہ وقتی ابال ہے جو وقت گزرنے پر خود ہی ختم ہو جائے گا مگر تم سے دور جا کر میں نے جانا کہ وہ کمزور بزدل اور ڈرپوک لڑکی جو میرے ہاتھ سے تھپڑ کھا کر میرے ہی گلے لگ کر آنسو بہاتی ہے اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

خود سے لڑتا جھگڑتا جب میں ہار مان گیا اور تمہاری تلاش میں واپس نیروبی آیا تو پتا چلا کہ میں نے
بن واقعتاً کھو دیا ہے اپنی کوتاہ اندیشی کے سبب۔ پھر میں جوان حرکتوں کو چیپ رومینٹزم کہا کرتا تھا اس
ے میں کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ تم نے کتنی مرتبہ مجھے اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی اور
نے سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم پاکستان میں کہاں رہتی ہو۔ اس درخت کو
نے گھنٹوں بیٹھ کر تکا ہے جس پر تمہارا اور میرا نام لکھا ہوا تھا۔ آنلہ کیا وہ دن زندگی میں دوبارہ آ سکتے
۔ تم میرے لیے کافی بنا کر لا رہی ہو، ہم ایک ساتھ جھیل کنارے بیٹھے ہیں۔ وہ وقت کتنا خوب
رت تھا۔''

وہ جیسے کہیں کھو گیا تھا اور وہ اچانک کسی خواب سے جاگ گئی تھی ایک دم کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی
، یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔

''پلیز بیٹھ جاؤ آنلہ۔ میری ساری بات سن لو۔ میں تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر رہا۔
کم از کم تم میری بات سن تو سکتی ہو۔ میں نے آج تک اپنا آپ کسی کے سامنے نہیں کھولا۔ آج تم سے
ر رہا ہوں پلیز میری بات سن لو۔'' وہ بڑی عاجزی سے بول رہا تھا اور وہ دو متضاد کیفیتوں کا شکار دوبارہ
ئی۔

''محبتوں پر سے میرا یقین اٹھ گیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ محبت وحبت سب بکواس باتیں ہیں ان کا
میں کوئی وجود نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نے محبتوں پر سے میرا ایمان اٹھوا دیا تھا۔ انہوں نے
رے زمانے سے ٹکر لے کر ایک دوسرے سے محبت کی شادی کی تھی۔ مگر میں نے جب ہوش سنبھالا تو
ے ان کے درمیان کہیں کوئی محبت نظر نہیں آئی وہ ایک دوسرے سے بے زار ہمیشہ جاہلوں کی طرح
تے نظر آئے۔ پھر جب میں سولہ سال کا تھا تو انہوں نے بڑے آرام سے ایک دوسرے سے علیحدگی
یار کر لی۔ میں بھی ان کے اس فیصلے کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔ اور کچھ ہی عرصے بعد دونوں نے
ں اپنی نئی دنیا میں آباد کر لیں۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میرے ماں باپ کو میری ضرورت نہیں تھی۔ پاپا امریکہ
ں میری پڑھائی کے پیسے بھیج کر اپنی نئی بیگم اور بچوں کے ساتھ مصروف اور ماما کے پاس تو اس کے لیے
ں وقت نہ تھا۔ میں بھری دنیا میں تنہا تھا پھر آہستہ آہستہ میں بدلتا چلا گیا۔ میں کسی بھی قسم کی محبت پر یقین
رنے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے تمہیں اتنی شدت سے رد کر کے اپنی بے کار ضد لیے بیٹھا رہا۔ مگر آج
ب قدرت نے مجھے میری غلطی کے ازالے کا موقع فراہم کر ہی دیا ہے تو میں تم سے کہوں گا آنلہ میری
دگی میں آ جاؤ۔ ہم ایک ساتھ بہت خوش رہیں گے۔ میں کوئی بہت بڑا لارڈ نہیں ہوں۔ سڈنی میں
ری اپنی چھوٹی سی فرم ہے۔ میں لوگوں کو گھر بنا کر دیا کرتا ہوں اور تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے مکان
د گھر بنا دو۔''

''اتنی سی بات کہنے میں اتنی دیر لگا دی۔ اب جب سب کچھ ختم ہو گیا ہے اب آئے ہو۔'' وہ اس کی
ت کے جواب میں سوچ رہی تھی اور وہ چپ اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اسے دو
ک انداز میں سب کچھ بتانے کا سوچ کر آنکھیں خشک کرتی اس سے کچھ کہنے والی تھی کہ تیمور اسے اس
رف آتا نظر آیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہاں وہ غلطی پر ہے کس جگہ اس سے بھول ہوئی مگر اس وقت وہ خود کو
زم محسوس کر رہی تھی۔ ان دونوں کی مجرم۔

اور وہ بڑی غیر یقینی کیفیت میں اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو بڑے استحقاق سے اس کی حیات کے برابر والی کرسی پر بیٹھا اس سے بولا تھا۔

''تمہاری فکر میں مجھ سے تو وہاں تقریریں بھی ڈھنگ سے نہیں سنی گئیں۔'' وہ اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھتا بول رہا تھا اچانک اس کی نظر سامنے بیٹھے بندے پر پڑی جسے وہ آئلہ کی فکر میں دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ یہ سوچ کر کہ آئلہ کا کوئی دوست یا کلاس فیلو ہوگا خوش دلی سے مصافحہ کرنے لگا تو اس نے بھی جواب میں ہاتھ ملا کر ہیلو کہہ دیا۔ اس وقت لیلیٰ اور دانش بھی آگئے اور لیلیٰ کرسی پر بیٹھتے ہی شروع ہوگئی۔

''تمہاری وجہ سے ہم لوگ بھی اچھی طرح سے کچھ سن نہیں سکے کہ محترمہ بور ہو رہی ہوں گی۔'' جبکہ دانش خاموشی سے سامنے بیٹھے اس اجنبی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں لیلیٰ نے بھی اس طرف دیکھا۔

''تو قیامت کی گھڑی آخر آگئی ہے۔'' وہ خود کو حوصلہ دیتی بڑی دقت سے مسکرائی اور بولی۔

''یہ ہارون ہیں۔ اور ہارون یہ میری کزن ہے لیلیٰ، یہ ان کے شوہر دانش اور یہ میرے فیانسی تیمور۔'' لیلیٰ نے بڑی بے ساختگی میں پہلے اس شخص کو دیکھا جس کا روشن چہرہ یک دم بجھ گیا تھا اور پھر اس کے سامنے بیٹھی اس لڑکی کو جو اس کی پیاری دوست تھی۔

''کون کہتا ہے یہ لڑکی بزدل ہے۔ آؤ دیکھو اس سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی اس وقت اس کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ بظاہر بڑے پر اعتماد انداز سے مسکراتی اس لڑکی کا دل اس وقت دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو شاید میں بھی اس لمحے حوصلہ ہار جاتی، میں جو سب کی نظروں میں بہت بولڈ ایکسٹرا اورڈنری ہوں میں بھی ہار جاتی۔ آئلہ میری جان زندگی کے اس دوراہے پہ کھڑی تم اس وقت پل صراط کا سفر طے کر رہی ہو، میں جانتی ہوں۔'' لیلیٰ نے اپنی بے اختیار چھلکنے والی آنکھوں کو رگڑ کر توجہ تیمور کی جانب مبذول کر دی جو بڑی خوش مزاجی کے ساتھ ہارون سے مخاطب تھا۔

''اور ہارون صاحب آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔'' اگر وہ کمزور لڑکی بہادری کا مظاہرہ کر سکتی تو پھر اسے تو اپنے مضبوط اعصاب اور بہادر ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس لیے بڑی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''مصروفیات کیا بس لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بخشتے ہیں۔ سڈنی میں ایک چھوٹی سی فرم چلا رہا ہوں۔ آرٹسٹ آدمی ہوں جیسا گھر لوگوں کے خوابوں میں ہوتا ہے میں اسے آن پیپر لے آتا ہوں۔'' اس کے جواب پر دانش اور تیمور دونوں ہنس پڑے تھے۔

''یعنی سیدھے سادھے لفظوں میں آپ آرکیٹیکٹ ہیں۔'' دانش نے مسکرا کر کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ آئلہ کے فرینڈ ہیں تو ہمارے بھی دوست ہی ہوئے۔ بس یہ بات ابھی طے ہوگئی ہے کہ ہم لوگ شادی کے بعد آپ کے پاس سڈنی آئیں گے۔ سڈنی کا ساحل مجھے یوں بھی بہت پسند ہے

ہیں ہم اپنا ایک گھر بنائیں گے جس کا نقشہ آپ بنائیں گے۔ کہیے آپ کو منظور ہے؟'' تیمور بڑی ی سے بولا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل منظور ہے جناب اور آپ کے ساتھ تو میں کچھ کنسیشن بھی ضرور کروں گا۔ ورنہ پیسوں کے میں تعلقات کا لحاظ کیا نہیں کرتا۔'' وہ بھی بے تکلفی سے مسکرایا تھا۔

لیلیٰ اس شخص کے صبر و ضبط پر تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ آئلہ بڑے آرام سے مسکرا کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔

کچھ دیر اور ان لوگوں کے ساتھ باتیں کر کے وہ بڑی گرم جوشی سے خدا حافظ کہتا کھڑا ہوا ایک نگاہ اس چہرے پر ڈالی جو شاید اس کا تھا ہی نہیں اور وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اسے جاتا دیکھنے کی گوارا کیے بغیر اپنی پوری توجہ تیمور سے باتوں پر لگا دی تھی۔ لیلیٰ کو اچانک ہی کوئی کام یاد آ گیا تو وہ ں سے ایکسکیوز کرتی وہاں سے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ واپس آئی تو وہ تینوں کسی بات پر گا کر ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

رات تیمور کو ایئر پورٹ چھوڑ کر آنے کے بعد لیلیٰ اس کے ساتھ ہی آگئی تھی اور اس کے کمرے میں ہ اس سے جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

''لیلیٰ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔'' وہ آخر کار تنگ آ کر بول پڑی تھی۔

''آئلہ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہاری سچی اور بے لوث محبت دیکھی اسے مایوس مت لوٹاؤ۔ اسے روک لو۔'' لیلیٰ کی اس بات پر وہ آپے سے باہر ہوگئی۔

''وہ مجھے بہت چاہتا ہے اس لیے میں اسے روک لوں اور کل کوئی اور میری محبت کا دعوے دار پیدا ئے تو اسے چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لوں۔ لیلیٰ بیگم یہ خودسری اور خودغرضی کے جو سبق آپ مجھے نے کی کوشش کر رہی ہیں میں انہیں پڑھنا نہیں چاہتی۔'' وہ بڑے تنفر سے بولی تو لیلیٰ نے بڑی ی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''کیوں خود کو اذیت دے رہی ہو۔ تیمور بہت روشن خیال اور کھلے ذہن کا آدمی ہے۔ میں اسے کچھ بتا دوں گی۔ وہ انڈرسٹینڈ کر سکتا ہے۔ تمہارے اوپر کوئی آنچ نہیں آئے گی میں سب کچھ ہینڈل ں گی۔ دیکھو آئلہ یہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں جو ہم اسے ضائع کر دیں۔ وہ اتنی دور ہماری تلاش میں آیا تھا۔ اس وقت میں اس کے ہی پیچھے گئی تھی وہ کتنا تھکا ہوا اور نڈھال لگ رہا تھا۔ نے اس سے اس کا ایڈریس اور فون نمبر لے لیا ہے۔ تم دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' لیلیٰ کی اس پر اس نے بڑی نفرت سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

''تم اگر میری دوست نہ ہوتیں تو ابھی اس بات پر میں تمہارے منہ پر تھپڑ مار دیتی۔ لیکن میں تمہارا کر رہی ہوں۔ آج کے بعد یہ بے ہودہ بات کبھی مجھ سے مت کرنا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض دوں کہ اگر بات محبت کی ہے تو وہ تو تیمور بھی مجھ سے بہت کرتا ہے شاید اس شخص سے بھی زیادہ۔

تمہارے سمجھانے پر ہی میں اس راستے پر آئی تھی اور اب پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیلیٰ بیگم یورپ یا امریکہ نہیں جہاں شادیاں اور منگنیاں ایک مذاق ہوتی ہیں آج ایک سے کل دوسرے سے۔ پاکستان ہے اور میں ایک مشرقی لڑکی ہوں جو اپنی کمٹمنٹ مرتے دم تک نبھائے گی۔ جس کے ساتھ پیمان باندھا ہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک اس کی وفادار رہوں گی۔'' وہ ایک کڑی نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

ہم ہیں آوارہ سو بسو لوگو
جیسے جنگل میں رنگ و بو لوگو
ساعت چند کے مسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو
تھے تمہاری طرح کبھی ہم بھی
رنگ و نکہت کی آبرو لوگو
قریہ عاشقی، سراچۂ دل
گھر ہمارے بھی تھے کبھی لوگو
وقت ہوتا تو آرزو کرتے
جانے کس شے کی آرزو لوگو
تاب ہوتی تو جستجو کرتے
جانے کس کس کی جستجو کرتے
کوئی منزل نہیں روانہ ہیں
ہم مسافر ہیں بے ٹھکانہ ہیں

اپنے سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکاتے اس نے نم ہوتی آنکھوں سمیت سوچا۔
''تو آخر میں نے تمہیں کھو دیا۔ ہمیشہ کے لیے شاید مجھ جیسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے درست وقت پر درست بات نہ کر پائیں ان کے ساتھ زندگی کو بھی یہی سلوک کرنا چاہیے۔ کیوں میں نے ا زندگی کے سب سے اہم معاملے میں غفلت سے کام لیا۔ میرا خیال تھا کہ در دل پر دستک دیتی وہ لڑ میرے انتظار میں کھڑی تمام عمر بتا دے گی اور جب کبھی میں یہ در وا کروں گا تو وہ کھڑی میری راہ تک رہ ہوگی۔ یہ دربدری یہ بے سکونی تو میری اپنی خریدی ہوئی ہے۔ مگر آج سوچوں تو دل میں خیال آتا ہے میں ایسا تھا کیوں۔ کیوں میرا محبتوں پر یقین نہیں تھا۔ ماما اور پاپا آپ لوگ تو اپنی اپنی دنیاؤں میں گم کبھی یہ سوچتے بھی نہیں ہوں گے کہ آپ کے رویوں سے نالاں ہو کر میں رشتوں سے محبتوں سے ایسا بے زار ہوا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا۔ جب آپ نے اپنی سترہ سالہ رفاقت کا خاتمہ بڑ سکون سے کیا تو آپ لوگوں نے ایک لمحے کو بھی رک کر میرے بارے میں نہ سوچا میں جو آپ کا اکلوتا

سولہ سال کا کم عمر لڑکا۔ آپ دونوں نے بڑے آرام سے اپنے لیے نئے ساتھی چن لیے اور اپنی میں مگن اس بچے کو بھول گئے جو اپنا گھر بکھر جانے پر ٹوٹ گیا تھا۔ جو اپنے ماں باپ کے سائے خوب صورت سے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ جسے اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ لیکن میرے ساتھ میں تنہا رہ گیا۔ ساری محبتیں دم توڑ گئیں۔ ہوسٹلوں میں رہ کر آپ دونوں کی طرف سے پیسے اور ول کرتے کرتے آخر کار میں ہر رشتے سے بے زار ہو گیا۔ میرا ایمان اٹھ گیا ہر رشتے پر سے تمام پر سے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب آپ دونوں کو میری ضرورت پیش آئی مگر میں اس تمام ضرورتوں اور محبتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ گھر کا تصور مجھے پاگل کر دیتا تھا میں جو لوگوں کو کر دیا کرتا تھا تمام عمر اپنے مکان کو گھر نہ بنا سکا۔ میں یہی سوچتا کہ اگر کبھی زندگی میں شادی کرنی تو وہ شخص ضرورت کا رشتہ ہوگا وہاں کسی محبت کا کوئی گزر نہ ہوگا۔ اس لیے اس اچھی سی لڑکی کو بڑی سے رد کرتا رہا۔ کیا پتا تھا ایسا کر کے میں اپنے لیے دکھوں کا ایک کوہ گراں خود خرید رہا ہوں۔ اور وہ ایک شخص تیمور، خوش بختی کا تاج جس کے سر پر سجا ہے خدا کرے کہ تمہیں اتنا سکھ دے، اتنی دے کہ تمہارے دل میں کبھی بھولے سے بھی میری یاد نہ آئے۔ تم بھول جاؤ کہ اس دنیا میں کہیں دن وقار احمد بھی رہتا ہے جو تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہے شاید اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر۔

اپنے معمول کے مطابق ہم
آج بھی روز کی طرح یونہی
دن کے ہمراہ بے خیالی میں
وادی شام سے گزرتے ہوئے
رات کی سرحدوں کو چھو لیں گے
نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے
کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے

☆☆☆

تیمور اور وہ جیولری کے ڈیزائن پسند کر کے ڈنر کرنے آ گئے۔ تیمور بے حد خوش تھا اور بہت سی باتیں کے موڈ میں بھی تھا۔ اسی لیے وہاں اچھی خاصی دیر ہو گئی۔ سردیوں کے دنوں میں رات کے دس کی رات لگ رہی تھی۔ اس نے ہی اسے وقت کا احساس دلایا تو وہ کھڑا ہوا۔ ان لوگوں کی شادی کی طے ہو گئی تھی اور پھوپھو اور تیمور ان دنوں اسے اس کی پسند کی جیولری اور ملبوسات خرید وانے میں ئے تھے۔ پھوپھو آج طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ساتھ نہیں آ سکیں تو تیمور اور وہ اکیلے ہی چلے ۔ گو شادی میں ابھی تین مہینے باقی تھے مگر پھوپھو اپنی اسٹیٹس کانشس طبیعت سے مجبور ابھی سے سا میں مصروف ہو گئی تھیں۔ زیور وہاں سے لینا ہے اور عروسی جوڑا فلاں سے لینا ہے وہ اسی ادھیڑ

بن میں تھیں۔

سردیوں کے دن اوپر سے برستی ہوئی موسلا دھار بارش روڈوں پر اچھا خاصا سناٹا تھا۔ گاڑی میں ہلکا سا میوزک لگائے تیمور اسے مستقبل کے خوش آئند خواب دکھا رہا تھا۔ اسے اپنی وفاؤں کا اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ مسکراتی اس کی بے تابیاں دیکھ رہی تھی۔

اچانک ہی گاڑی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رکی تو اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ تین مسلح نقاب پوش تھے جنھوں نے روڈ پر شاید کوئی رکاوٹ کھڑی کر کے انہیں گاڑی روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہاتھوں میں ٹی ٹی تھامے وہ بڑے سفاک لہجے میں ان سے گاڑی سے اترنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کوئی جائے فرار نہ پا کر وہ دونوں گاڑی سے اتر آئے۔ تیمور کے ہاتھ سے اس کی بلیک مرسڈیز کار کی چابیاں ان میں سے ایک نے چھین لیں اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"چلو جلدی سے بیٹھو۔" اس کا لہجہ بڑا سرد تھا۔ اس کی بات کے جواب میں ان میں سے ایک آگے بڑھ کر اس کی طرف آیا جو تیمور کے ساتھ لگی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کچھ دیر کھڑا اس کو بڑی جانچتی نظروں سے دیکھ کر اپنے ساتھی سے بولا۔

"یار خالی خولی گاڑی لے جانے میں کچھ مزا نہیں آ رہا۔ ایک تو یہ آسامی کچھ زیادہ ہی تگڑی لگ رہی ہے۔ پھر یہ چیز بھی اتنی بری نہیں ہے۔ کیا خیال ہے ذرا تاوان واوان کا ہی کوئی چکر چلا لیں گے" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولا۔ پھر اس کا چہرہ چھوڑ کر اس کی پسلی پر ٹی ٹی رکھ کر بولا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے مدد کے لیے تیمور کی طرف دیکھا جو لاشعوری طور پر اس سے ہٹ گیا تھا۔ وہ اونچا پورا مرد پسینوں میں نہایا خوف سے کانپ رہا تھا۔ آنلہ کے دل پر جیسے کوئی بجلی پڑی۔ اس نے بڑی ہمت کر کے تیمور کی طرف بھاگ کر جانا چاہا تو اس آدمی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اسے زوردار دھکا دے کر گاڑی میں دھکیلنا چاہا وہ پوری قوت سے چلائی۔

"تیمور ہیلپ می۔" وہ آدمی اسے گاڑی میں دھکا دے کر بٹھا رہا تھا اور وہ مچل مچل کر خود کو چھڑا رہی تھی اور تیمور دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا ان میں سے ایک نے ایک زوردار ہاتھ تیمور کو لگایا تو وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔

"اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ اور اگر مرنے کا زیادہ ہی شوق ہے تو۔" اس آدمی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر تیمور کو دوبارہ ایک تھپڑ مارا تو وہ جو بمشکل کھڑا ہوا تھا دوبارہ گر پڑا۔ وہ شخص بدستور تیمور کو گن پوائنٹ پر لیے کھڑا تھا۔

پھر آنلہ نے جو کچھ بقائمی ہوش و حواس دیکھا وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا وہ اس کی عزت کا رکھوالا اسے چھوڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر اندھا دھند وہاں سے بھاگتا چلا جا رہا تھا اور وہ جو کچھ دیر پہلے خوف سے کانپ رہی تھی مگر یہ بھی پتا تھا کہ میرا محافظ میرے ساتھ ہے جو مجھ پر کوئی آنچ آنے نہیں دے گا اسے جاتا دیکھ کر صرف ایک لمحے کو گنگ سی ہوئی تھی۔ اگلے ہی پل پتا نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی اور وہ پوری قوت سے اس آدمی کو دھکا دے کر اس کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ وہ شاید اس کے نازک سراپے سے اس بہادری کی توقع نہیں کر رہا تھا یا یہ خیال ہوگا کہ جس کا مرد اتنا کمزور ہو وہ عورت کیا طاقتور

ہوگی۔ اپنی اس غفلت سے وہ مار کھا گیا اور وہ اپنی پوری طاقت تمام تر ہمت یکجا کر کے وہاں سے بھاگنے لگی۔ وہ شاید اسے مارنا نہیں چاہتے تھے، آخر انہیں اس کی جان کے عوض کروڑ دو کروڑ وصول کرنے تھے اس لیے اس پر فائر کرنے کے بجائے گاڑی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے آنے لگے۔ اپنے پیچھے گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں تو وہ اس تنگ سی گلی میں مڑ گئی۔ قدرت اس پر شاید مہربان تھی جو اس وقت وہ تمام علاقہ بجلی چلے جانے کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا اور وہ اسے اس گلی میں مڑتا نہیں دیکھ سکے تھے۔ یا خدا نے اس لمحے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا اور وہ گاڑی آگے بڑھا کر لے گئے تھے۔ اس تنگ سی اندھیری گلی میں ایک گھنے سے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔

پتا نہیں اسے اس طرح درخت کے پیچھے چھپ کر کتنی دیر گزر گئی۔ مگر وہ احتیاطاً وہاں سے نکلی نہیں کیا پتا وہ باہر گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ وہ لٹیرے ہو سکتا ہے ابھی بھی یہیں کہیں ہوں۔ مگر وہ شاید اس کی تلاش میں اس طرف آئے ہی نہیں تھے یا انہوں نے اس کی جان بخشی کا سوچ کر خالی گاڑی پر اکتفا کرنا منظور کر لیا تھا کہ اس نے دوبارہ اپنے آس پاس کسی گاڑی کے رکنے کی آواز نہیں سنی۔

بہت دیر بعد جب اس کے دل کو یہ اطمینان ہوا کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں تو وہ ڈرتے ڈرتے اس گلی سے باہر نکلی۔ وہ پورا علاقہ لوڈ شیڈنگ کے زیر اثر ہنوز اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ طویل اور اندھیری سڑک اس وقت بالکل ویران تھی۔ اچانک بجلی زور سے چمکی تو ڈر کے مارے اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ پھر اس نے دیکھا اس اندھیرے میں ایک شخص آگے بڑھ کر اس کی طرف آیا اور بڑے پیار سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کا آنچل اس کے سر پر ڈالتا بولا۔

"بڑی مشکلوں سے میں نے خود پر ضبط کیا تھا ورنہ دل تو میرا یہ چاہ رہا تھا کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔" اور وہ اس سنسان سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆☆☆

رات کے بارہ بج رہے تھے اور بھابھی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اب تو کچھ پریشان بھی ہوگئی تھیں کہ وہ اب تک واپس کیوں نہیں آئی۔ اس وقت گیٹ پر بجنے والی بیل نے انہیں اطمینان دلایا۔ آنلہ اور تیمور کو سخت سست سنانے کے خیال سے جلدی سے گیٹ کھول کر باہر دیکھا تو وہ اکیلی بارش میں بھیگتی خاموش کھڑی تھی۔

"کیا ہوا۔ تم اکیلی آئی ہو؟ تیمور کہاں گیا؟" وہ اس کے لٹے لٹے سے انداز پر سخت خوف زدہ ہوتی پوچھ رہی تھیں اور وہ ان کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر اندر داخل ہوگئی تھی۔

"آنلہ کیا ہوا؟ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو تیمور کہاں ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئے تھے میرا تو پریشانی کے مارے برا حال ہوگیا تھا وہ تو شکر ہوا کہ امی ابو کی آنکھ نہیں کھلی ورنہ تمہارے اب تک واپس نہ آنے پر وہ لوگ مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہو جاتے۔" وہ اسے جھنجھوڑ کر پوچھنے لگیں۔ مگر وہ کسی بت کی طرح خاموش تھی۔ بھابھی پتا نہیں کیا کیا پوچھ رہی تھیں۔ اسے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پھر اس نے انہیں چیختے سنا۔

''آملہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ خدا کے لیے بتا دو ورنہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔''
ان کی چیخ پر وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی اور بڑے سکون سے اپنے ہاتھ سے وہ قیمتی ہیرے کی انگوٹھی اتار کر بھابھی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولی۔
''بھابھی اسے پھوپھو کو واپس بھجوا دیں۔''
پھر ان کے مزید کچھ اور پوچھنے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔ وہ اس کی ان حرکتوں کا مطلب سمجھے بغیر کچھ دیر تو وہیں گم سم سی کھڑی رہیں۔ پھر بڑے دوٹوک انداز میں اس سے بات کرنے کا سوچ کر اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے انہوں نے سنا وہ کسی سے فون پر کہہ رہی تھی۔
''ہارون میں تمہاری پناہوں میں آنا چاہتی ہوں۔ تم زندگی بھر کے لیے میرے محافظ بن جاؤ اور دیکھو اس بار آنے میں دیر مت کرنا، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ فون رکھ کر مڑی تو بھابھی نگاہوں میں سخت بے اعتباری اور ناراضگی لیے کھڑی تھیں۔ وہ سکون سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھی، انہیں تمام بات بتانے کے لیے کہ اسے اپنے اس فیصلے پر نہ کوئی پچھتاوا تھا نہ شرمندگی۔ یہ فیصلہ کسی محبت بھرے دل کا نہ تھا جو وصال کی آرزو میں تڑپتا مچلتا آخر کار دنیا کے رسم ورواج سے ٹکرا گیا ہو۔
یہ فیصلہ کسی نئے زمانے کی الٹرا ماڈرن پڑھی لکھی لڑکی کا بھی نہیں تھا جو اپنی خوشیوں کے لیے بڑی خودسری اور سرکشی دکھاتی کسی کی بھی پروا کیے بنا اپنی زندگی خود جینے کی خواہش کرتی اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کک مارتی آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ فیصلہ اس لڑکی کا تھا جو مشرق کی بیٹی تھی۔ محبت جس کا مسئلہ نہ تھا۔ دولت، اونچے اونچے محلات اور قیمتی گاڑیاں بھی جس کے لیے اہم نہیں تھیں اس کے لیے اہم تھا اپنی عزت وناموس کا تحفظ اور یہ تحفظ فراہم کرنے کے لیے اسے ایک محافظ درکار تھا۔ جو اس کا سائبان ہو۔ جو خود موسموں کی تمام سختیاں اپنی ذات پر جھیل لے مگر اس پر کوئی آنچ نہ آنے دے۔ جو کڑی دھوپ میں اس پر شجر سایہ دار بن کر رہے۔ جس کے ہوتے وہ سکون سے آنکھیں موند کر سو سکے۔ جو اس کی طرف کسی کو میلی آنکھ سے دیکھنے کی اجازت نہ دے۔ جو اس کی طرف اٹھنے والے ہاتھ کو توڑ کر رکھ دے اور ایسے شخص کے ساتھ اسے اگر کسی جنگل میں رہنا پڑے تو رہ لے گی۔ وہ اسے کسی صحرا میں رکھے وہ خوشی خوشی رہے گی۔ وہ اسے کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رکھے وہ اس جھونپڑے پر فخر کرتی اپنی تمام عمر وہاں بتا دے گی۔ مگر کسی بے حمیت اور بے غیرت آدمی کا ساتھ اس مشرقی لڑکی کو قبول نہ تھا۔ سو وہ اپنے فیصلے پر بہت مطمئن تھی۔
اور وہ اس کا محافظ اس کا رکھوالا اور اس کا سائبان بس آنے ہی والا تھا۔

✠✠✠✠✠✠✠✠